اپنے موضوع کے اعتبار سے انوکھی کتاب

آیاتِ متعارضہ اور اُن کا حل

قرآن کریم کی مقدس آیات کے درمیان ظاہری تعارض کے بہترین حل کا مدلل مجموعہ

تعارض کی اجمالی وضاحت

- تعارض کے تفصیلی جوابات
- دفع تعارض کے سلسلہ میں آیات کی تفسیر
- دفع تعارض کے درمیان مختلف قراءتوں کی وضاحت
- مشکل مقامات کا آسان اور تسلی بخش حل
- معترضین کے اعتراضات کے مدلل اور مسکت جوابات
- ایک ایسی کتاب جو ہر طالب علم اور مدرس کی ضرورت

تالیف
حضرت مولانا محمد انور صاحب گنگوہی
خادم حدیث وتفسیر جامعہ اشرف العلوم گنگوہ

زمزم پبلشرز

اپنے موضوع کے اعتبار سے انوکھی کتاب

آیاتِ متعارضہ

اور

اُن کا حل

قرآن کریم کی مقدس آیات کے درمیان ظاہری تعارض کے بہترین حل کا مدلل مجموعہ

تعارض کی اجمالی وضاحت

- تعارض کے تفصیلی جوابات
- رفع تعارض کے سلسلہ میں آیات کی تفسیر
- رفع تعارض کے درمیان مختلف قراءتوں کی وضاحت
- مشکل مقامات کا آسان اور تسلی بخش حل
- معترضین کے اعتراضات کے مدلل اور مسکت جوابات
- ایک ایسی کتاب جو ہر طالبِ علم اور مدرس کی ضرورت

تالیف:

حضرت مولانا محمد انور صاحب گنگوہی

خادم حدیث وتفسیر جامعہ اشرف العلوم گنگوہ

زمزم پبلشرز

کتاب کا نام .... آیات متعارضہ اور ان کا حل

تاریخ اشاعت .... اکتوبر ۲۰۰۵ء (جدید تصحیح شدہ ایڈیشن)

باہتمام .... احباب زمزم پبلشرز

کمپوزنگ .... فاروق اعظم کمپوزرز کراچی

سرورق ....

مطبع ....

ناشر .... زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی

فون: 2725673 - 2760374

فیکس: 2725673

ای میل - zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ - www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے:

دارالاشاعت، اردو بازار کراچی

قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی

صدیقی ٹرسٹ، لسبیلہ چوک کراچی

مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور

Available in United Kingdom

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
ISLAMIC BOOKS CENTER
119-121- HALLIVELL ROAD,
BOLTON BLI 3NE. (U.K.)
Phone # 01204-389080

AL FAROOQ INTERNATIONAL Ltd.
1 Atkinson Street, Leicester Le5 3QA
Tel: 0116-253-7640 Fax: 0116-262-8655
E-mail: alfarooqinternational@yahoo.com
Website: www.alfarooqinternational.co.uk

ضروری گزارش

ایک مسلمان، مسلمان ہونے کی حیثیت سے قرآن مجید، احادیث اور دیگر دینی کتب میں عمداً غلطی کا تصور نہیں کرسکتا۔ سہواً جو اغلاط ہوگئی ہوں اس کی تصحیح و اصلاح کا بھی انتہائی اہتمام کیا ہے۔ اسی وجہ سے ہر کتاب کی تصحیح پر ہم زر کثیر صرف کرتے ہیں۔

تاہم انسان، انسان ہے۔ اگر اس اہتمام کے باوجود بھی کسی غلطی پر آپ مطلع ہوں تو اسی گزارش کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہوسکے۔ اور آپ "تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى" کے مصداق بن جائیں۔

جَزَاكُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى جَزَاءً جَمِيْلاً جَزِيْلاً

—— منجانب ——

احباب زمزم پبلشرز

فہرست مضامین

عرضِ ناشر

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم کتاب ہے جو اللہ رب العزت نے اپنے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہر مسلمان پر اللہ کے بندہ اور نبی کے امتی ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ اس کتاب کی تلاوت کرے اور ان آیات کے ذریعے اللہ رب العزت جو کچھ اس میں فرمارہے ہیں اس کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

قرآن کریم کی تفسیر کے مطالعہ کے وقت بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کی ایک آیت کا مفہوم دوسری کے معارض ہے جس کے حل کے لئے بڑی بڑی تفاسیر کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی ہے جو ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حضرت مولانا محمد انور صاحب گنگوہی مظاھری (استاد حدیث وتفسیر اشرف العلوم گنگوہ) نے اس اہم ضرورت کو محسوس کر کے معترضین وبے دینی قوتوں کو دندان شکن جواب دینے کے لئے کلام پاک کی ان تمام ظاہری تضاد وشک وشبہ میں ڈالنے والی آیتوں کو ۱۲۵ مضامین وعنوانات کے تحت جمع کر کے مستند تفاسیر وکتب سے ان معترضین کو لاجواب کر دیا ہے، حتی کہ اب ایک معمولی طالب علم بھی اس کتاب کی بدولت ہر معترض کو دندان شکن جواب دے سکتا ہے، جو اس سے قبل بڑے بڑے علماء کے لئے بھی مشکل وباعث تشویش تھا، ہماری معلومات کی حد تک اس موضوع میں اردو میں الحمدللہ یہ پہلی کتاب ہے جو اس تفصیل کے ساتھ ہے، پاکستان میں پہلی بار احباب زمزم پبلشرز کراچی اعلی وجدید کمپوزنگ کے ساتھ شائع کررہے ہیں۔

امید ہے کہ اہل علم اس کتاب کی قدر و ہمت افزائی فرمائیں گے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ اپنی دعاؤں میں مؤلف، ناشر، طابع کو یاد رکھیں۔

زمزم پبلشرز کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

التصدیر

الحمد للّٰہ رب العالمین. والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین، أمابعد:

خدائے عزوجل کا بے انتہاء شکر و احسان ہے کہ اس نے قرآن مقدس کی ایک صغیر مگر مبارک خدمت کا موقع عنایت فرمایا۔ یہ ناقص العقل والفہم، قلیل العلم والعمل ناکارہ عبد ضعیف اس لائق کہاں تھا کہ اس خدمت کے لئے خامہ فرسائی کرتا، یہ تو فقط میرے مولائے واہب التوفیق کا کرم ہے، ورنہ

؎ کہاں میں اور کہاں یہ نگہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم خداوندِ قدوس کا ایک ایسا قیم و مستقیم کلام ہے جو ہر قسم کے اختلاف و اختلال، تعارض و تناقض سے کلیۃً منزہ و مقدس ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجاً قَیِّماً.﴾ (سورۂ کہف پارہ:۱۵)

ترجمہ: ''وہ خدا مستحق ہر حمد ہے جس نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایسی کتاب نازل فرمائی جس میں کسی بھی قسم کی کجی نہیں ہے۔''

نہ اس میں تعارض و اختلاف ہے، نہ تناقض و اختلال ہے بلکہ حق تعالیٰ نے اس کو قیم و مستقیم بنایا ہے۔

دراصل تعارض و تناقض تو اس شخص کے کلام میں ممکن ہے جس پر نسیان طاری

ہوتا ہو، جس کا علم ناقص و ناتمام ہو، جس کو یہ خبر نہ رہے کہ میں نے اس سے قبل کیا کہا تھا اور اب کیا کہہ رہا ہوں اور آئندہ مجھے کیا کہنا ہے، جس کے فکر و دماغ پر الجھنیں سوار ہوں، امور مختلطہ اس کے ذہن و قلب میں گشت کرتے رہتے ہوں ایسے شخص کی گفتگو میں تعارض و تناقض ہونا ایک لازمی امر ہے، بخلاف ذات خداوند قدوس کے کہ وہ تو نسیان و ذہول اور جملہ عیوب و نقائص سے مطلقاً منزہ ومبرا ہے، وہ تو عالم الغیب والشہادۃ ہے، جس کی صفت و شان: يَعْلَمُ مَابَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ہو، جس کو ماضی و حال اور استقبال کی پوری پوری خبر ہو، بھلا اس کے کلام میں تعارض و اختلال ہوسکتا ہے؟ یہ ایک امر ناممکن اور محال ہے۔

ہاں! جن آیات میں تعارض معلوم ہوتا ہے یہ صرف ظاہر نظر کی بات ہے، ہماری عقول و افکار کی کوتاہی ہے۔ ورنہ نظرِ عمیق کے بعد یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ کسی آیت کا کسی آیت سے کوئی تعارض نہیں ہے۔

حق تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے ان محققین، مفسرین حضرات کو جنہوں نے نقول صحیحہ اور عقول سلیمہ کی روشنی میں آیات متعارضہ میں تطبیقات بیان فرمائی ہیں اور ایسی ایسی توجیہات ذکر فرمائیں کہ جن کے بعد کوئی آیت کسی آیت کے معارض نہیں رہتی، البتہ یہ توجیہات و تطبیقات کتبِ تفسیر میں اپنے اپنے مقام پر کہیں اشارۃً و اجمالاً، کہیں قدرے توضیح و صراحت کے ساتھ متفرق و منتشر موجود ہیں، بعض مقامات پر بہت مختصری عبارت سے دفعِ تعارض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس سے ذہن جلدی سے اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ تعارض کی نوعیت کیا تھی اور وہ دفع کس طرح ہوا۔

بندہ کی نظر سے کوئی کتاب یا رسالہ اس قسم کا نہیں گزرا جس میں تمام آیاتِ متعارضہ کے تعارض کی تشریحات اور اس کے دفعیہ کے لئے جملہ توجیہات و تطبیقات کو یکجا جمع کیا گیا ہو، اس لئے ارادہ ہوا کہ ایک مختصر سا رسالہ ایسا تالیف کیا جائے جس

میں آیاتِ متعارضہ کو جمع کر کے ان کے مابین تعارض کی تشریح کی جائے، پھر اس تعارض کے وہ تمام جوابات جو کتبِ تفسیر میں اشارۃً یا صراحۃً متفرق و منتشر طور پر موجود ہیں ان کو آسان عبارت میں توضیح و تفصیل کے ساتھ با حوالۂ کتب جمع کر دیا جائے تا کہ علم تفسیر خصوصاً ترجمۂ قرآنِ پاک، جلالین شریف وغیرہ پڑھنے پڑھانے والے طلبہ و مدرسین حضرات کے لئے سہولت و آسانی ہو جائے، حق تعالیٰ شانہ کے فضل و کرم نے اس ارادہ کو تقویت بخشی، خدا کا نام لے کر اور اس ذاتِ حق سے چالیس دن میں تکمیل کرا دینے کی دعا کر کے ۲۹ / ربیع الآخر ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۸ / نومبر ۱۹۹۰ء یکشنبہ کے روز اس کام کو شروع کیا، حق سبحانہ کا فضل شامل حال رہا کہ تدریسی و خانگی مشغولیات کے باوجود چالیس روز میں ۸ / جمادی الاخریٰ ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۷ / دسمبر ۱۹۹۰ء بروز پنجشنبہ، بعد نماز ظہر اس رسالہ کی تالیف سے فراغت میسر آ گئی۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے، خطایا و زلات کو معاف کرے، مطالعہ کنندگان کے لئے نافع و مفید بنا کر بندہ کے لئے اس کو ذریعہ نجات اور توشۂ آخرت بنائے۔ آمین، یارب العالمین۔

احقر العباد
(حضرت مولانا) محمد انور گنگوہی عفا اللہ عنہ
استاد الحدیث والتفسیر اشرف العلوم گنگوہ
ضلع سہارنپور یوپی انڈیا

ملاحظات

❶ سب سے پہلے آیاتِ متعارضہ کو نمبر وار ذکر کیا گیا ہے، پھر چونکہ آیات میں تعارض ہوجانے کی صورت میں ان کے مضامین مختلف ہوجاتے ہیں اس لئے ایک مضمون کی جملہ آیات کو ایک طرف ذکر کرکے اس طرح کی "✦" علامت لگا دی گئی ہے، اس کے بعد دوسرے مضمون کی جملہ آیات لکھی گئی ہیں، مثلاً: بارش آسمان سے ہوتی ہے یا بادلوں سے، اس بارے میں آیات متعارض ہیں، پس اولاً قرآن میں جہاں جہاں بھی نزولِ ماء من السماء کے مضمون کی آیات ہیں ان سب کو یکجا جمع کیا گیا، اس کے بعد "✦" علامت لگا کر وہ تمام آیات ذکر کی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش بادلوں سے ہوتی ہے اور اگر تین قسم کے مضامین کی آیات ہیں تو دوسرے مضمون کی آیت کے بعد وہی علامت مذکورہ لگا کر تیسرے مضمون کی آیات کو ذکر کیا گیا ہے۔

❷ ہر آیت کے ساتھ پارہ نمبر، رکوع نمبر، سورت کا نام اور تفسیر جلالین پڑھنے، پڑھانے والوں کی سہولت کی خاطر ہر آیت کے ساتھ جلالین شریف کا صفحہ نمبر بھی درج کیا گیا ہے۔

❸ چونکہ بسا اوقات آیات میں تعارض مخفی ہوتا ہے اس لئے آیات کے ذکر کے بعد تشریحِ تعارض کا عنوان دیکر سمجھایا گیا ہے کہ ان آیات میں تعارض کس طرح ہے؟

❹ اس کے بعد دفعِ تعارض کے عنوان کے ذیل میں اس تعارض کے جوابات دیئے گئے ہیں، یعنی وہ توجیہات و تطبیقات بیان کی گئی ہیں جن سے تعارض مرتفع ہوجاتا ہے اور بہت سے مقامات پر روایاتِ صحیحہ سے توجیہات کی تائیدات پیش

کی گئی ہیں، تقریباً ہر جواب کے اخیر میں ان کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے جن سے وہ جواب ماخوذ و مستنبط ہے۔

❺ تعارض کے جوابات کو نمبروار ذکر کیا گیا ہے، ان کے نمبرات سیاہ رنگ میں سفید اس طرح "❶" ڈالے گئے ہیں، البتہ ایک ہی جواب کے ذیل میں اگر متعدد تاویلات آگئی ہیں تو ان کے نمبرات سیاہ رنگ کے بجائے سادہ انداز میں اس طرح "①" ڈال دیئے گئے ہیں تاکہ امتیاز باقی رہے۔

❻ رسالہ ہذا میں آیات کا ترجمہ اور تفسیر بیان کرنے کا مستقل اہتمام و التزام نہیں کیا گیا ہے کیونکہ یہ چیز ہمارے موضوع سخن سے خارج ہے، البتہ بہت سے مقامات پر دفع تعارض کے ذیل میں آیات کی اچھی خاصی تفسیر سامنے آگئی ہے۔

❼ شروع میں ایک فہرست دی گئی ہے جس میں آیات متعارضہ کے مضامین کے عنوانات مع صفحات ذکر کیے گئے ہیں اور ہر تعارض کے کتنے جوابات دیئے گئے ہیں اس تعداد کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

❽ یہ تیسرے ایڈیشن میں ہے، دوسرے ایڈیشن میں جو ضمیمہ کا فاضل مصنف نے اضافہ کیا تھا، وہ اب اصل کتاب کے ساتھ لاحق کر دیا گیا ہے، اور ضمیمہ سے قبل مصنف علام نے جو عربی عبارت لکھی تھی وہ اب کتاب کے آخر میں شامل ہے۔ اور کل ۵۸۹ آیتوں کے اعتراض کا جواب اس میں شامل ہے۔

از مؤلف عفا اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآنِ مقدس کن لوگوں کے لئے ہدایت ہے؟

پارۂ مُبین: ۱، ۲، ۱۱، ۲۱

آیات

① ﴿ الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَارَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾.

(پارہ: ۱ رکوع: ۱ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۴)

② ﴿ الٓمٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ﴾ ✦

(پارہ: ۲۱ رکوع: ۱۰ سورۂ لقمان جلالین ص: ۳۴۵)

③ ﴿ يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْجَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (پارہ: ۱۱ رکوع: ۱۱ سورۂ یونس جلالین ص: ۱۷۵) ✦

④ ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾.

(پارہ: ۲ رکوع: ۷ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۲۷)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ و ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک صرف خواص مؤمنین یعنی اہل تقویٰ اور نیک لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور آیت نمبر ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ عام مؤمنین کے لئے ہدایت و رحمت ہے اور آیت نمبر ۴ میں ارشاد ہے "هُدًى لِّلنَّاسِ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے مؤمن ہو یا کافر، متقی و صالح ہو یا فاسق و فاجر، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

(۱) درحقیقت قرآنِ پاک چشمۂ ہدایت تو تمام ہی انسانوں کے لئے ہے جو بھی اس کو دیکھے اور پڑھے، اس کے مضامین و معانی میں غور و تدبر کرے، وہ ہدایت پر آ سکتا ہے مگر پہلی تین آیات میں جو متقین، محسنین اور مؤمنین کی تخصیص کردی گئی، وہ ایک تو اس وجہ سے کہ اس منبعِ ہدایت سے فیض یافتہ ہونے والے اور اس نورِ ہدایت سے روشنی حاصل کرنے والے یہی حضرات ہیں، اگرچہ استفادہ میں فرقِ مراتب ہے کہ اہل تقویٰ اور نیک لوگوں نے اعلیٰ درجہ کا استفادہ کیا ہے اور عوام مؤمنین کا استفادہ ان سے کم درجہ کا ہے مگر نفسِ استفادہ میں سب مشترک ہیں، دوسرے ان حضرات کی شرافت و کرامت کی وجہ سے کہ حق تعالیٰ نے ان کو ایمان و تقویٰ اور نیکی کی دولت سے مشرّف فرمایا، یہ عزت و سعادت ان کو بخشی، پس ان کی مدح سرائی کرتے ہوئے فرمایا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ، هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُحْسِنِيْنَ، هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ، ورنہ تو اس قرآنِ مقدس کا ہدایت ہونا ہر شخص کے حق میں عام ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (تفسیر ابوالسعود، تفسیر کبیر، خازن وغیرہ)

(۲) ہدایت کے دو معنی ہیں: اول۔ اراء ۃ الطریق (صرف راستہ دکھلا دینا خواہ مقصود تک رسائی ہو یا نہ ہو) دوم۔ ایصال الی المطلوب (مقصود تک پہنچا دینا) قرآنِ کریم میں دونوں صفتیں موجود ہیں، صفتِ اراء ۃ الطریق تو ہر شخص کے حق میں عام ہے، قرآن نے حق و باطل کا راستہ سب کے سامنے صاف صاف واضح کردیا ہے، اسی کو فرمایا "هُدًى لِّلنَّاسِ" مگر صفتِ ایصال الی المطلوب حضراتِ مؤمنین، محسنین و متقین کے حق میں مخصوص ہے، یہ حضرات قرآنِ پاک کی تعلیمات کو اختیار کر کے مقصدِ اصلی تک پہنچ گئے، اسی کو فرمایا گیا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ، هُدًى لِّلْمُحْسِنِيْنَ، هُدًى لِّلْمُؤْمِنِيْنَ پس آیت ۱و۲و۳ میں ہدایت بمعنی ایصال الی المطلوب ہے اور آیت ۴ میں بمعنی اراء ۃ الطریق ہے۔ فلا تعارض۔ (تفسیر کبیر)

بارش آسمان سے ہوتی ہے یا بادلوں سے؟

پارہ نمبر: ۱، ۲، ۷، ۸، ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۳۰

آیات

① ﴿ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشاً وَّالسَّمَآءَ بِنَاءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ﴾ (پارہ:۱ رکوع:۳ سورۂ بقرہ جلالین ص:۶)

② ﴿ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَابِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ﴾

(پارہ:۲ رکوع:۴ سورۂ بقرہ جلالین ص:۲۳)

③ ﴿ وَهُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَابِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ ﴾

(پارہ:۷ رکوع:۱۸ سورۂ انعام جلالین ۱۲۱)

④ ﴿ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ ﴾

(پارہ:۱۱ رکوع:۸ سورۂ یونس جلالین ص:۱۷۲)

⑤ ﴿ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا ﴾

(پارہ:۱۳ رکوع ۸ سورۂ رعد جلالین ص:۲۰۲)

⑥ ﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ﴾

(پارہ:۱۳ رکوع:۱۷ سورۂ ابراہیم جلالین ص:۲۰۹)

⑦ ﴿ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ﴾

(پارہ:۱۴ رکوع:۲ سورۂ حجر جلالین ص:۲۱۲)

⑧ ﴿ وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ﴾

(پارہ ۱۴ رکوع:۱۴ سورۂ نحل جلالین ص:۲۲۱)

⑨ ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ﴾

(پارہ:۱۵ رکوع:۱۸ سورۂ کہف جلالین ص:۲۴۶)

⑩ ﴿وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى﴾

(پارہ:۱۶ رکوع:۱۱ سورۂ طٰہٰ جلالین ص:۲۶۳)

⑪ ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً﴾

(پارہ:۱۷ رکوع:۱۵ سورۂ حج جلالین ص:۲۸۵)

⑫ ﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ﴾ (پارہ:۱۸ رکوع:۱ سورۂ مؤمنون جلالین ص:۲۸۷)

⑬ ﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا﴾ (پارہ:۱۹ رکوع:۳ سورۂ فرقان جلالین ص:۳۰۷)

⑭ ﴿اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾

(پارہ:۲۰ رکوع:۱ سورۂ النمل جلالین ص:۳۲۲)

⑮ ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ﴾

(پارہ:۲۱ رکوع:۲ سورۂ عنکبوت جلالین ص:۳۴۰)

⑯ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾

(پارہ:۲۱ رکوع:۶ سورۂ روم جلالین ص:۳۴۲)

⑰ ﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ﴾

(پارہ:۲۱ رکوع:۱۰ سورۂ لقمان جلالین ص:۳۴۶)

⑱ ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ﴾

(پارہ:۲۲ رکوع:۱۶ سورۂ فاطر جلالین ص:۳۶۶)

⑲ ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ﴾

(پارہ:۲۳ رکوع:۱۶ سورۂ زمر جلالین ص:۳۸۷)

⑳ ﴿وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا﴾

(پارہ:۲۵ رکوع:۷ سورۂ زخرف جلالین ص:۴۰۶)

(۲۱) ﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ﴾

(پارہ:۲۶ رکوع:۱۵ سورۂ ق جلالین ص:۴۲۹) ✦

(۲۲) ﴿حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ﴾

(پارہ:۸ رکوع:۱۴ سورۂ اعراف جلالین ص:۱۳۴)

(۲۳) ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ﴾ (پارہ:۱۸ رکوع:۱۲ سورۂ نور جلالین ص:۳۰۰)

(۲۴) ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ﴾

(پارہ:۲۱ رکوع:۸ سورۂ روم جلالین ص:۳۴۴)

(۲۵) ﴿ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ﴾

(پارہ:۲۷ رکوع:۱۵ سورۂ واقعہ جلالین ص:۴۴۸)

(۲۶) ﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا﴾

(پارہ:۳۰ رکوع:۱ سورۂ نباء جلالین ص:۴۸۷)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۲۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش آسمان سے ہوتی ہے اور آیت ۲۲ تا ۲۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش بادلوں سے ہوتی ہے، چنانچہ آیت ۲۲، ۲۳، ۲۴ میں تو سحاب کی تصریح ہے اور يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فرمایا گیا ہے کہ بارش بادلوں کے درمیان سے نکلتی ہے اور آیت نمبر ۲۵ و ۲۶ میں مُزْنِ اور مُعْصِرَات کا لفظ آیا ہے۔ مزن کے معنی پانی سے بھرا ہوا سفید بادل، اور معصرات ان بادلوں کو کہا جاتا ہے جن کے برسنے کا وقت قریب آ گیا ہو، ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بارش بادلوں سے ہوتی ہے، پس پہلی اکیس آیات اور اخیر کی ان پانچ آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ پہلی آیات میں سماء سے مراد سحاب ہے، ہر اس شیء کو جو جہت علو میں ہوتی ہے سماء سے تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسے مکان کی چھت وغیرہ، کہا جاتا ہے "كُلُّ مَا عَلَاكَ فَهُوَسَمَاءٌ" ہر وہ شیء جو تیرے اوپر ہے وہ آسمان ہے، پس چونکہ سحاب بھی جہت علو میں ہوتا ہے اس لئے اس کو سماء سے تعبیر کر کے "اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً" کہہ دیا گیا، ورنہ درحقیقت بارش بادلوں ہی سے ہوتی ہے اس لئے ان آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

❷ بارش تو بادلوں ہی سے ہوتی ہے مگر اس کا سبب تاثیرات سماویہ ہیں چنانچہ سورج جو کہ آسمان میں ہے اس کی شعاعیں سمندروں پر پڑتی ہیں جن کی حرارت سے پانی بخارات (بھانپ) بن کر اٹھتا ہے، پھر وہ بخارات ہوا کے طبقہ ثالثہ میں پہنچ کر جمع ہوجاتے ہیں اور جب زیادہ بوجھل ہوجاتے ہیں تو قطرات بن کر برسنے لگتے ہیں، پس جب تک وہ بخارات جمع رہتے ہیں ان کو بادل کہا جاتا ہے اور جب برسنے لگتے ہیں تو بارش کہتے ہیں تو چونکہ بادلوں سے بارش برسنے کا سبب آسمانی تاثیرات ہیں اس لئے مجازاً آسمان کی طرف نسبت کردی گئی، پس پہلی آیات مجاز پر اور اخیر کی آیات حقیقت پر محمول ہیں۔ فاندفع التعارض۔ (روح المعانی)

❸ بارش آسمان سے ہوتی ہے اور بادل درمیان میں واسطہ ہیں، اولاً پانی آسمان سے بادلوں پر نازل ہوتا ہے، پھر بادل کے سوراخوں میں سے چھن چھن کر زمین پر برستا ہے، حق تعالیٰ نے بادلوں کو بارش کے لئے چھلنی بنا دیا ہے لہٰذا ان آیات میں کوئی تعارض نہیں، اس توجیہ کی تائید حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد سے ہوتی ہے لَوْلَا السَّحَابُ حِيْنَ يَنْزِلُ الْمَطَرُ مِنَ السَّمَاءِ لَاَفْسَدَ مَايَقَعُ عَلَيْهِ مِنَ

الْاَرْضِ ''کہ جس وقت آسمان سے بارش برستی ہے اگر درمیان میں بادل نہ ہوتے تو پانی زمین کے جس مقام پر بھی گرتا اس کو تباہ کر دیتا۔'' یعنی آسمان سے پانی موٹی دھار بن کر نہایت تیزی کے ساتھ گرتا ہے مگر بادل اس کو روک لیتے ہیں، پھر وہ بادل کے سوراخوں سے چھن چھن کر ہلکی رفتار کے ساتھ قطرات بن کر اور باریک باریک دھار بن بن کر برستا ہے، اگر بادل نہ ہوتے اور پانی موٹی دھار بن کر پوری تیزی کے ساتھ براہِ راست زمینوں اور مکانوں وغیرہ پر گرتا تو سب چیزوں کو ہلاک و تباہ کر ڈالتا، یہ تو حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے درمیان میں بادلوں کو واسطہ بنا دیا ہے۔ (صاوی)

اہلِ عرب کو قرآن کی کتنی سورتوں کا مثل پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا تھا؟

پارہ نمبر: ۱، ۱۱، ۱۲، ۱۵، ۲۷

① ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾
(پارہ: ۱ رکوع: ۳ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۶)

② ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ﴾
(پارہ: ۱۱ رکوع: ۹ سورۂ یونس جلالین ص: ۱۷۴) ✦

③ ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ﴾
(پارہ: ۱۲ رکوع: ۲ سورۂ ہود جلالین ص: ۱۸۰) ✦

④ ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّأْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ﴾ (پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۰ سورۂ اسراء جلالین: ۲۳۸)

⑤ ﴿فَلْيَأْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖ اِنْ كَانُوْا صَادِقِيْنَ﴾
(پارہ: ۲۷ رکوع: ۴ سورۂ طور جلالین ص: ۴۳۶)

تشریحِ تعارض

ان آیات میں حق تعالیٰ شانہ نے فصاحت و بلاغت پر ناز کرنے والے مشرکینِ عرب بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے چیلنج کیا ہے کہ اگر تمہیں اس قرآنِ مقدس کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہے اور تمہارا گمان یہ ہے کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی طرف سے بنا کر پیش کر دیا ہے تو تم بھی تو بڑے فصیح و بلیغ مانے جاتے ہو، ذرا قرآن جیسا کوئی کلام پیش کر کے دکھا دو اور تم تنہا ہی نہیں بلکہ

جتنے مددگاروں کو تم بلا سکتے ہو بلا لو اور سب مل کر قرآن پاک کا مثل پیش کر کے دکھا دو، مگر یاد رکھو اگر ساری دنیا کے انسان و جنات مل کر بھی قرآن کا مثل پیش کرنا چاہیں تو ہرگز نہیں کر سکتے۔

لیکن ان آیات میں سے آیت نمبر ۱ و ۲ میں تو ایک سورت کے متعلق چیلنج ہے کہ قرآن جیسی ایک سورت ہی بنا کر دکھا دو، تم ایک سورت بھی نہیں بنا سکتے، اور آیت نمبر ۳ میں ہے کہ قرآن جیسی دس سورتیں پیش کر دو اور آیت نمبر ۴ و ۵ میں بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ اور بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖ کہہ کر پورے قرآن کے متعلق چیلنج کیا گیا ہے، پانچویں آیت میں حدیث سے مراد قرآن ہی ہے، مطلب یہ ہے "فَلْيَأْتُوْا بِقُرْاٰنٍ مِّثْلِهٖ" کہ قرآن جیسا پیش کر کے دکھا دو۔ یا حدیث کے معنی مطلق بات، کہ قرآن جیسی کوئی ایک بات مثلاً ایک چھوٹی سی آیت یا ایک چھوٹا سا جملہ پیش کر دو۔ بہر حال ان آیات میں قرآن کا مثل پیش کرنے کی مقدار کے بارے میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

(۱) حق تعالیٰ شانہ نے اولاً تو پورے قرآن کا مثل پیش کرنے کا چیلنج کیا، جب لوگ اس سے عاجز رہ گئے اور مثل پیش نہ کر سکے تو فرمایا اچھا اگر تم پورے قرآن کا مثل پیش نہیں کر سکتے تو قرآن جیسی دس سورتیں بنا کر دکھا دو، پھر جب لوگ اس سے بھی عاجز رہے تو قرآن کی شانِ اعجاز کو اور زیادہ واضح کرتے ہوئے فرمایا "فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ" کہ اگر دس سورتیں نہیں بنا سکتے تو کم از کم ایک ہی سورت کا مثل پیش کر کے دکھا دو، اور سورت کو معرف باللام لانے کے بجائے نکرہ لا کر اس طرف اشارہ کیا کہ قرآن کی کسی بھی سورت کا یعنی چھوٹی سے چھوٹی سورت کا مثل پیش کر کے دکھا دو، مگر تم قرآن جیسی ایک چھوٹی سی سورت بھی نہیں بنا سکتے اور اگر فَلْيَأْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖ

میں حدیث سے مراد مطلق ایک آیت یا ایک جملہ ہو تو شانِ اعجازِ قرآنی کی مزید درمزید توضیح کرتے ہوئے چیلنج ہوگا کہ اگر ایک چھوٹی سی سورت پیش نہیں کر سکتے تو چلو اچھا کم از کم قرآن جیسی ایک چھوٹی سی آیت یا ایک چھوٹا سا جملہ ہی بنا کر دکھا دو، مگر تم سے ایک چھوٹی سی آیت بھی نہیں بن سکتی، پس جان لو کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں بلکہ خدائے عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةُ کا کلام ہے۔

یہ جو ترتیب بیان کی گئی ہے کہ پہلے پورے قرآن کے متعلق، پھر دس سورتوں کے متعلق، پھر ایک سورت کے متعلق چیلنج کیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ترتیب تلاوت کے اعتبار سے اگرچہ پہلے سورۂ بقرہ، پھر سورۂ یونس، پھر سورۂ ہود، پھر اسراء ہے مگر ترتیب نزول اس کے برعکس ہے، اولاً سورۂ اسراء نازل ہوئی جس میں ''بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآن'' کہا گیا، پھر سورۂ ہود کا نزول ہوا جس میں ''فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ'' فرمایا، پھر سورۂ یونس اور سورۂ بقرہ نازل ہوئیں جن میں ''فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ'' فرمایا گیا کیونکہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اولاً ایک سورت کا مثل پیش کرنے کے لئے کہا گیا ہو جب اس سے عاجز ہوگئے تو دس سورتیں بنانے کے لئے فرمایا ہو کیونکہ جو شخص ایک سورت بنانے سے عاجز ہو جائے وہ دس سورتیں بنانے سے بدرجۂ اولیٰ عاجز ہوگا پس اس کو یہ کہنا کہ ''جب تو ایک سورت نہیں بنا سکتا تو دس سورتیں بنا کر پیش کر دے'' بے معنی ہوگا۔

جواب کا حاصل یہ نکلا کہ یہ اختلاف زمان پر محمول ہے، متعدد متعارض چیلنج ایک ہی زمانہ میں نہیں کئے گئے۔ بلکہ مختلف زمانوں میں یکے بعد دیگرے کئے گئے اور جب دو متعارض چیزوں کا زمانہ جدا جدا ہو تو تعارض نہیں رہتا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنی تصنیف کے بارے میں چیلنج کرے کہ کوئی اس جیسی کتاب تصنیف کر کے دکھا دے، اگر پوری کتاب نہیں لکھ سکتا تو اس جیسی آدھی کتاب لکھ دے، اگر یہ بھی نہیں تو کم از کم ثلث یا ربع یا کم از کم اس کتاب کے کسی ایک مسئلہ کا مثل پیش کر کے دکھا دے اور ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کوئی تعارض نہیں۔ (صاوی، روح المعانی، تفسیر کبیر)

❷ دوسرا جواب یہ ہے کہ اختلاف زمان ہی پر محمول ہے مگر صورت اول کے برعکس ہے، چنانچہ ابن عطیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اولا ایک سورت پیش کرنے کا چیلنج فرمایا، پھر دس سورتیں پیش کرنے کا، امام مبرد رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی یہی مروی ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ سورۂ یونس جس طرح تلاوت میں سورۂ ہود پر مقدم ہے اسی طرح نزول کے اعتبار سے بھی مقدم ہے۔ علامہ ابن الضریس رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی فضائل القرآن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی نقل کیا ہے، مگر اس پر اشکال ہوتا ہے کہ ایک سورت کے چیلنج کے بعد دس سورتوں کا چیلنج کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ کا مطلب "فأتوا بسورة من مثله في البلاغة والاشتمال على ما اشتمل عليه من الاخبار عن المغيبات والاحكام و اخواتها" ہے اور "فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ" کا مطلب "بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ في النظم فقط" ہے یعنی اولا تو یہ کہا گیا کہ ایک ایسی سورت بنادو جو الفاظ و معانی، فصاحت و بلاغت میں قرآن کے مثل ہو، نیز جس طرح قرآن غیب کی خبروں، احکام، مواعظ، وعد و وعید وغیرہ پر مشتمل ہے اسی طرح تمہاری بنائی ہوئی سورت بھی ان مذکورہ امور پر مشتمل ہونی چاہئے مگر جب لوگ ان شرائط کے ساتھ سورت پیش کرنے سے عاجز رہ گئے تو فرمایا اچھا اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو دس سورتیں ایسی پیش کردو جو صرف الفاظ میں قرآن کے مثل ہوں اگرچہ ان میں وہ تمام امورِ مذکورہ نہ ہوں جن پر قرآن مشتمل ہے مگر تم ایسا بھی نہیں کر سکتے۔ (روح المعانی)

اس دوسرے جواب میں سورۂ اسراء کی آیت "قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ" سے اور سورۂ طور کی آیت "فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖ" سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، غالبًا اس وجہ سے کہ بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مطلق ہے جو بِسُوْرَةٍ اور بِعَشْرِ سُوَرٍ دونوں کو شامل ہے، اسی طرح حدیث سے مراد بھی مطلق قرآن ہے جو ایک سورت اور دس سورتوں دونوں کو شامل ہے۔ فافهم۔

تخلیقِ سماوات مقدم ہے یا تخلیقِ ارض؟

پارہ نمبر: ۱، ۲۴، ۳۰

آیات

(۱) ﴿ هُوَالَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّافِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَبِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴾

(پارہ: ۱ رکوع: ۳ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۷)

(۲) ﴿ قُلْ اَءِ نَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِىْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِىْ يَوْمَيْنِ. اِلٰى قَوْلِهٖ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِىَ وَبَارَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِىْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ ﴾

(پارہ: ۲۴ رکوع: ۱۶ سورۂ حم سجدہ جلالین ص: ۳۹۷) ✦

(۳) ﴿ ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقاً اَمِ السَّمَآءُ بَنَاهَا اِلٰى قَوْلِهٖ. وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۴ سورۂ نازعات جلالین ص: ۴۸۹)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱، ۲ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اولاً زمین کو پیدا کیا، اس کے بعد آسمان بنایا اور آیت نمبر ۳ اس کے برعکس پر دلالت کرتی ہے کہ تخلیقِ سماء مقدم ہے تخلیقِ ارض پر کیونکہ اس میں ارشاد ہے "وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا" کہ زمین کو آسمان کے بنانے کے بعد بچھایا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دفعیہ کے تین طریقے ہیں:

① تقدیم خلق ارض والی آیات کو اصل قرار دیکر تقدیم سموات والی آیات میں تاویل کی جائے۔

② تقدیم خلق سماوات والی آیات کو اصل قرار دے کر تقدیم ارض والی آیات میں تاویل کی جائے۔

③ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ایسی توجیہ اختیار کی جائے جس سے دونوں قسم کی آیات اصل پر رہیں اور تعارض ختم ہو جائے، ان طرقِ مذکورہ کے پیش نظر اس تعارض کے بظاہر چار جواب ہیں مگر پہلے دو جوابوں کے تحت مذکورہ تاویلات کو مستقل جواب شمار کر کے آٹھ ہو جائیں گے۔

❶ تقدیمِ خلق ارض والی آیات اصل اور اپنے ظاہر پر محمول ہیں، یعنی حق تعالیٰ نے اولاً ارض و مافیہا (جبال، اشجار، انہار وغیرہ) کو پیدا فرمایا، اس کے بعد آسمانوں کی تخلیق فرمائی جیسا کہ پہلی دو آیتوں سے معلوم ہو رہا ہے، روایتِ مرفوعہ صحیحہ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

﴿عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ ان الیہود اتت النبی صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم، فسألتہ عن خلق السموات والارض، فقال علیہ السلام: خلق اللّٰہ تعالٰی الارض یوم الاحد والاثنین، وخلق الجبال ومافیھن من المنافع یوم الثلثاء، وخلق یوم الاربعاء الشجر والماء و المدائن والعمران والخراب فھذہ اربعۃ فقال تعالٰی: ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یو مین و تجعلون لہ اندادا ذالك رب العالمین وجعل فیھارواسی وبارك فیھاوقدر فیھا اقواتھا فی اربعۃ ایام سواءً للسائلین، وخلق یوم الخمیس السمآء، وخلق یوم الجمعۃ النجوم و الشمس والقمر و الملائکۃ﴾

(أخرجہ ابن جریر وغیرہ وصححوہ، روح المعانی ج ۲۴/ص ۱۰۵)

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ یہود نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش کے متعلق دریافت کیا تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یکشنبہ اور دوشنبہ کے دن زمین کو پیدا فرمایا اور پہاڑوں کو اور جو ان میں منافع رکھے ہیں ان سب کو سہ شنبہ کے روز پیدا کیا اور چہار شنبہ کے دن درختوں، پانی، شہروں، آبادیوں اور کھنڈرات کو پیدا فرمایا، پس یہ چار دن ہو گئے، اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا ”کیا تم لوگ ایسے خدا کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو روز میں پیدا کردیا اور تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو، یہی سارے جہاں کا رب ہے اور اسی نے زمین میں پہاڑ بنادیئے اور اس میں فائدہ کی چیزیں رکھ دیں اور اس میں اس کی غذائیں تجویز کردیں چار دن میں، پورے ہیں پوچھنے والوں کے لئے“ اور پنجشنبہ کے روز آسمانوں کو پیدا کیا اور جمعہ کے دن ستارے، سورج، چاند اور فرشتے پیدا کئے۔“

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ تخلیق ارض مقدم ہے تخلیق سماوات پر، اسی طرح ایک اور مرفوع روایت ہے:

﴿انه خلق الارض في يوم الاحدوالاثنين، وخلق الجبال و الآكام في يوم الثلاثاء، والاشجارفي الاربعاء، وخلق السمآء في الخميس و الجمعة.﴾ (رواہ الحاکم مرفوعاً، حاشیہ جلالین ص: ۳۸۹)

ترجمہ: ”کہ اللہ نے یکشنبہ اور دوشنبہ کے روز زمین کو پیدا کیا اور سہ شنبہ کے دن پہاڑوں اور ٹیلوں کو بنایا اور چہار شنبہ کے دن درختوں کو اور پنجشنبہ اور جمعہ کے دن آسمانوں کو پیدا کیا۔“

نیز عقلاً بھی یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ زمین بنیاد کی

حیثیت رکھتی ہے اور آسمان چھت کے درجہ میں ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے: "و جعلنا السمآء سقفا محفوظا" اور بنیاد پہلے قائم کی جاتی ہے، بعد میں چھت ڈالی جاتی ہے، لہٰذا تخلیق ارض مقدم ہے تخلیق سماوات پر۔ اکثر مفسرین رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

رہی سورۂ نازعات کی آیت "والارض بعدذلك دحها" سو اس میں دو طرح سے تاویل کی گئی ہے:

① الارض سے پہلی تدبر یا تذکر یا اذکر فعل محذوف ہے اور بعد ذلك اس فعل محذوف کا ظرف ہے اور دحھا جملہ مستانفہ ہے اور آیت شریفہ سے یہ بتانا مقصود ہی نہیں کہ زمین کی تخلیق آسمان کی تخلیق کے بعد ہوئی بلکہ اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا اور یاد دلانا مقصود ہے، مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو سماوی نعمتوں کی معلومات ہوگئی تو اس کے بعد نعم ارضیہ کو یاد کیجئے، ان میں تدبر و تفکر کیجئے کہ حق تعالیٰ نے زمین کو بچھایا، اس میں سمندروں، دریاؤں اور نہروں کو جاری کیا، اس سے چشمے نکالے اور اس سے نباتات اور اشجار کو نکالا اور اس پر پہاڑ جما دیئے۔

② بعد، مع کے معنی میں ہے، ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے "بعد ذلك" کی تفسیر "مع ذلك" کے ساتھ نقل کی ہے، آیت شریفہ کا مطلب یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے کیسی کیسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں کہ آسمان بنایا، اس کی چھت کو بلند کیا، اس کو درست کیا، اس کی رات کو تاریک بنایا، اس کے دن کو ظاہر کیا اور صرف یہی نعمتیں نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اور بھی نعمتیں عطا فرمائیں کہ زمین کو بچھایا، اس میں سے پانی اور نباتات کو نکالا، اس پر پہاڑ پیدا کئے، یہ سب چیزیں حق تعالیٰ نے تمہارے اور تمہارے چوپاؤں کے نفع کے لئے پیدا فرمائیں ہیں، پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں تخلیقِ ارض کے تاخر کو بیان کرنا مقصود ہی نہیں ہے، ان دونوں تاویلات کے بعد آیات میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔

❷ تقدیم خلق سماوات والی آیت اصل اور اپنے ظاہر پر محمول ہے، یعنی حق تعالیٰ نے اولاً آسمان کو پیدا کیا، اس کے بعد زمین کو پیدا کیا جیسا کہ آیت نمبر ۳ "والارض بعد ذلك دحها" سے معلوم ہوتا ہے، امام واحدی نے البسیط میں حضرت مقاتل رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہی نقل کیا ہے، محققین میں سے بہت سے حضرات نے اسی کو اختیار کیا ہے، اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اکثر ان آیات میں جن میں آسمان وزمین کا ذکر آیا ہے، سموات کو ارض پر مقدم کیا گیا ہے جیسے "اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ"، "لَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ"، "اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ"، "اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" وغیرہ، جب اکثر آیات میں ذکر سماوات مقدم ہے ذکر ارض پر تو معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق سماوات بھی مقدم ہے تخلیق ارض پر، دوسری دلیل یہ ہے کہ حکمت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اشرف کو غیر اشرف پر مقدم کیا جائے اور آسمان ذاتاً وصفتاً دونوں اعتبار سے اشرف ہے، آسمان مقدار میں بھی زمین سے بڑا ہے اور مکان سے بھی اعلیٰ وارفع ہے پس اشرف یعنی آسمان کی تخلیق کا غیر اشرف یعنی زمین کی تخلیق پر مقدم ہونا مطابق مقتضائے حکمت ہے۔ رہی آیت نمبر ۱، و ۲ سو ان میں چار طرح سے تاویل کی گئی ہے:

① ثُمَّ استوی میں لفظ ثم واو کے معنی میں ہے جو مطلق جمعیت کے لئے آتی ہے، مقصود آسمان وزمین دونوں کی محض تخلیق کو بیان کرنا ہے، تقدیم وتاخیر کے اعتبار سے ترتیب بیان کرنا مقصود نہیں ہے، پس کوئی تعارض نہیں رہا۔

② لفظ ثُمَّ اگرچہ ترتیب مع التراخی کے لئے آتا ہے لیکن تراخی کی دو قسمیں ہیں، تراخی فی الزمان اور ترخی فی الرتبته، ثُمَّ کا استعمال حقیقۃً تو تراخی فی الزمان کے لئے ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار مجازاً تراخی فی الرتبه کے لئے بھی استعمال کرلیا جاتا ہے، یہاں پر یہ مجازاً تراخی فی الرتبه کے لئے استعمال ہوا ہے جس سے آسمان کے

بُعدِ رتبی کو بیان کرنا مقصود ہے کہ آسمان کا مرتبہ زمین سے بعید اور اونچا ہے، بعد زمانی اور تاخر زمانی کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے جیسا کہ آیت شریفہ "فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَآ اَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْماً ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْمِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا." میں لفظ ثم تراخی فی الرتبہ کے لئے مستعمل ہے، کہ اس انسان کافر نے گھاٹی کو پار کیوں نہیں کیا اور آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹی کیا چیز ہے؟ وہ کسی کی گردن کا غلامی سے چھڑا دینا ہے، یا فاقہ کے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو کھانا کھلانا، یا کسی خاک نشین محتاج کو کھانا کھلانا (یعنی ان احکامِ الٰہیہ مذکورہ کو بجالانا چاہئے تھا) پھر ان لوگوں میں سے ہو جاتا ہے جو ایمان لائے الخ۔

اگر یہاں ثُمَّ کو تراخي في الزمان کے لئے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ پہلے ان اعمال مذکورہ کو کرنا چاہیے تھا، اس کے بعد ایمان لانا چاہئے تھا، حالانکہ ایمان تو اعمال پر مقدم ہے، اس لئے ثُمَّ یہاں مجازاً تراخي في الرتبه کے لئے ہے جس سے ایمان کے بُعدِ مرتبت اور تفخیم شان کو بتلانا مقصود ہے کہ ایمان کا مرتبہ اعمال سے برتر واعلی ہے، پہلے ایمان لانا چاہئے اس کے بعد اعمال مذکورہ کا پابند ہو جانا چاہئے، پس ایسے ہی ثم استوی الی السماء میں سمجھ لیا جائے کہ آسمان کے بُعدِ رتبی کو بیان کرنا مقصود ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

③ تیسری تاویل یہ ہے کہ لفظ خلق ایجاد وتکوین کے معنی میں نہیں ہے بلکہ مجازاً تقدیر اور قضاء کے معنی میں مستعمل ہے، مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ارض و مافیہا کے پیدا کرنے کا فیصلہ فرما دیا کہ عنقریب ارض و مافیہا کو پیدا کردیں گے، ابھی پیدا نہیں فرمایا اس کے بعد آسمانوں کو پیدا کردیا، آسمانوں کے بعد ارض و مافیہا کو جن کے پیدا کرنے کا پہلے فیصلہ فرما چکے تھے پیدا کردیا، اس کو فرمایا "والارض بعد ذلك دحها" اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آیت شریفہ "اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" میں خلق بمعنی قدّر وقضی مستعمل ہوا

ہے یہاں اگر خلق کو ایجاد و تکوین کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو جائے گا کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا پھر کہا "کن" پس وہ پیدا ہو گئے اور ظاہر ہے کہ یہ مطلب درست نہیں ہے اس لئے کہ پیدا کر دینے کے بعد پھر کلمۂ "کن" سے خطاب کرنا بے سود و بے معنی ہے اس لئے یہاں خلق، قدر اور قضی کے معنی میں ہے، اس صورت میں مطلب بالکل درست ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا، پھر کہا "کن" پیدا ہو جاؤ پس وہ پیدا ہو گئے۔

(۴) چوتھی تاویل یہ ہے کہ خلق سے پہلے اراد محذوف ہے یعنی "هُوَ الَّذِيْ اَرَادَ اَنْ يَّخْلُقَ لَكُمْ مَافِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا"، "قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ اَرَادَ خَلْقَ الْاَرْضِ فِيْ يَوْمَيْنِ" جیسا کہ "اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ" میں "اِذَا اَرَدْتُمُ الْقِيَامَ اِلَى الصَّلٰوةِ" مراد ہے اور "فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ" میں "اِذَا اَرَدْتَ الْقِرَاءَ ةَ" مراد ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آسمان سے قبل زمین کی تخلیق نہیں فرمائی بلکہ تخلیق کا ارادہ فرمایا کہ عنقریب ارض ومافیہا کو پیدا کریں گے، پھر آسمانوں کو پیدا کر دینے کے بعد زمین کے تخلیق کے ارادہ کی تکمیل فرما دی، یعنی ارض ومافیہا کو پیدا کر دیا جس کو آیتِ ثالثہ میں فرمایا "وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا" فَانْدَفَعَ التَّعَارُضُ" یہ تاویل تیسری تاویل کے قریب ہی ہے۔

(۳) تعارض کا تیسرا جواب یہ ہے کہ دونوں قسم کی آیتوں کو اپنے اصل اور ظاہر پر رکھتے ہوئے ایسی توجیہ کی جائے کہ تعارض دور ہو جائے، سو وہ توجیہ یہ ہے کہ ہر جسم کا ایک مادہ ہوتا ہے اور ایک صورت وشکل ہوتی ہے، مادہ کے اعتبار سے تو خلق ارض مقدم ہے، خلق سماوات پر، جیسا کہ پہلی دو آیتوں میں ہے اور صورت وشکل کے اعتبار سے تخلیق سماوات مقدم ہے تخلیق ارض پر، جیسا کہ آیت نمبر ۳ میں ہے، حاصل اس کا یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے اولاً زمین کے مادہ کو پیدا کیا جو ایک کھرل [1] کی شکل میں تھا جیسا کہ

(۱) پتھر کا بنا ہوا ایک برتن ہوتا ہے، جس میں اطباء دوا پیستے ہیں اور اس میں سرمہ بھی پیس لیا جاتا ہے۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، اس کے بعد آسمان کا مادہ بنایا جو دخان کی شکل میں تھا جیسا کہ آیت ۲ میں مصرح ہے "ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ" پھر آسمان کی موجودہ صورت بنائی اور اس کے سات طبقات بنا دیئے، اس کے بعد زمین کے مادہ کو دراز کر کے اس کو موجودہ شکل وصورت عطا فرما دی اور اس کو بچھا کر اس کے اوپر جبال واشجار وانہار وغیرہ پیدا فرما دیئے، پس آیت نمبر ۱، ۲ کا مطلب یہ ہوگا کہ پہلے زمین کا مادہ پیدا کیا، پھر آسمان کا مادہ بنایا اور آیت ۳ کا مطلب یہ ہوگا کہ پہلے آسمان کی صورت بنائی، پھر زمین کی صورت وشکل بنائی، اس توجیہ کے بعد ان آیات میں کوئی تعارض نہیں رہتا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے، اس توجیہ کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے۔

﴿عن سعيد بن جبيرقال: جاء رجل الى ابن عباس رضى الله تعالىٰ عنه فقال: رأيت اشياء تختلف على فى القرآن، قال: هات ما اختلف عليك من ذلك، فقال: اسمع الله قول: ائنكم لتكفرون بالذى خلق الارض (حتى بلغ) طائعين، فبدأبخلق الارض فى هذه الاية قبل خلق السماء، ثم قال سبحانه فى الآية الاخرى: ام السماء بناها، ثم قال: و الارض بعد ذلك دحها، فبدأ جل شانه بخلق السماء قبل خلق الارض. فقال ابن عباس رضى الله تعالىٰ عنه: اما خلق الارض فى يومين فان الارض خُلِقت قبل السماء، وكانت السماء دخانا، فسواهن سبع سمٰوٰت فى يومين بعدخلق الارض، واما قوله تعالىٰ: والارض بعد ذلك دحها، يقول: جعل فيها جبلا، وجعل فيها نهرا، وجعل فيها شجرا، وجعل فيها بحورا﴾

(رواہ الحاکم والبیہقی باسناد صحیح، روح المعانی ج ۲۴ ص: ۱۰۵)

"سعید بن جبیر رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے فرمایا کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ مجھے کچھ چیزیں قرآن میں متعارض نظر آتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ بتلاؤ کونسی چیز تم کو متعارض معلوم ہوتی ہے، اس نے عرض کیا میں سنتا ہوں اللہ عزوجل فرماتے ہیں (ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض یہاں تک کہ اس نے آیت کو طائعین تک پڑھا) اس آیت میں حق تعالیٰ نے آسمان کی تخلیق سے قبل زمین کی تخلیق کو بیان فرمایا، پھر حق تعالیٰ نے دوسری آیت میں ارشاد فرمایا (اَمِ السَّمَآءُ بَنَاهَا۔ اس کے بعد فرمایا وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا) اس میں حق تعالیٰ شانہ نے تخلیق ارض سے پہلے تخلیق سماء کو بیان کیا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا بہرحال خلق الارض فی یومین تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ زمین آسمان سے پہلے پیدا کی گئی اور آسمان ایک دھواں تھا، تو زمین کو پیدا کرنے کے بعد (یعنی زمین کا مادہ اور اس کے بعد آسمان کا مادہ بشکل دخان پیدا کرنے کے بعد) اس کو دو دن میں سات آسمان بنائے، اور بہرحال حق تعالیٰ کا ارشاد: وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں پہاڑ بنائے، نہریں بنائیں، درخت بنائے، سمندر بنائے۔"

علامہ خفاجی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ "اَخْرَجَ مِنْهَآ مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا" یہ دحاھا سے بدل یا عطف بیان ہے جس سے دحاھا کی تفسیر اور اس سے مراد کو بیان کرنا مقصود ہے، پس اس آیت میں زمین کو آسمان سے مؤخر کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ زمین ذات کے اعتبار سے آسمان سے

موخر ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مافی الارض کے پیدا کرنے کے اعتبار سے زمین متاخر ہے، زمین کی تکمیل گویا بعد میں ہوئی، زمین میں مافی الارض کو پیدا کر کے اس قابل بنایا گیا کہ اس سے انتفاع اور تمتع کیا جائے ورنہ زمین کی نفس ذات کا وجود آسمان سے پہلے ہو چکا تھا۔

لیکن اس پر اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ اس توجیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین کا بچھانا اور اس پر جبال واشجار وانہار کا پیدا کرنا آسمان کے بعد ہوا اور آیت نمبر ۱، ۲ اور روایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اوپر گذر چکی ہے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جبال واشجار اور انہار کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی، آیت نمبر ۱ میں تو فرمایا "خَلَقَ لَكُمْ مَافِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ" جس سے صاف ظاہر ہے کہ جمیع مافی الارض (جبال، اشجار وانہار وغیرہ) کی تخلیق آسمان سے قبل ہوئی اور ان سب چیزوں کی تخلیق زمین کے بچھائے بغیر ناممکن ہے، پس معلوم ہوا کہ زمین کا بچھانا بھی آسمان سے قبل ہوا اور آیت نمبر ۲ میں ہے "خَلَقَ الْأَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَبٰرَكَ فِيْهَا الخ" اس کے بعد فرمایا: "ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ" اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تخلیقِ جبال وغیرہ تخلیقِ آسمان پر مقدم ہے اور روایت سابقہ میں ہے کہ پہاڑوں کو سہ شنبہ کے دن، درختوں اور نہروں کو چہار شنبہ کے روز اور آسمانوں کو پنج شنبہ کے دن پیدا فرمایا، اس میں بھی صاف تصریح ہے کہ خلق جبال وغیرہ مقدم ہے خلق سماء پر، پس یہ توجیہ مذکورہ آیات وروایت کے خلاف ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیات وروایت میں: جَمِيْعُ مَافِي الْأَرْضِ (جبال، واشجار وانہار) کے پیدا کرنے سے مراد ان کے اصول اور مادوں کو پیدا کرنا ہے کہ حق تعالیٰ نے زمین کا مادہ پیدا کرنے کے بعد جَمِيْعُ مَافِي الْأَرْضِ کے مادوں کو بھی پیدا کردیا مگر ان کی تکمیل آسمان کی تخلیق کے بعد فرمائی اور جَمِيْعُ مَافِي الْأَرْضِ کے صرف مادوں کی تخلیق زمین کے بچھائے بغیر بھی ممکن ہے، لہٰذا زمین کا بچھانا آسمان

سے قبل لازم نہیں آئے گا۔

حاصل یہ نکلا کہ اولاً زمین کا مادہ پیدا کیا، پھر مافی الارض (جبال، اشجار و انہار وغیرہ) کا مادہ بنایا، اس کے بعد آسمان کا مادہ پیدا کیا، پھر آسمان کی صورت بنائی اور سات آسمان بنادیئے اس کے بعد زمین کی صورت بنائی، اس کو بچھا کر اس پر جبال، اشجار و انہار کی صورتیں پیدا فرما کر زمین کی تکمیل کردی اور اس کو قابل انتفاع بنا دیا، اب تخلیق کی ترتیب یوں ہوگئی:

خلق أولاً مادة الارض، ثم جعل مادة مافي الارض من الرواسى والاشجار والانهار وغيرها، ثم خلق مادة السماء التى هى دخان، ثم خلق صور السمٰوٰتِ، فَبَنَاهَا، وَرَفَعَ سَمْكَهَا، فَسَوّٰهَا، وَبَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰى الارض وَبَسَطَهَا وَمَدَّهَا، وَخَلَقَ فِيْهَا الْجِبَالَ وَالْاَنْهَارَ وَ الْاَشْجَارَ وَغَيْرَهَا.

فحصل التوفيق بين الآيات بل بين الروايات ايضا، واندفع التعارض فالحمد لله على ذلك. (هذه الاجوبة الثلاثة والتاويلات المذكورة تحتها ماخوذة من تفسير الخازن والتفسير الكبير و بيان القرآن و روح المعانى وغيرها)

④ تعارض کا چوتھا جواب بعض محققین رحمہم اللہ نے توجیہ مذکور کے برعکس صورت اختیار کر کے دیا ہے کہ مادہ کے اعتبار سے آسمان کی تخلیق مقدم ہے اور صورت کے اعتبار سے تخلیقِ ارض مقدم ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اولاً آسمان کا مادہ بنایا، پھر زمین کا مادہ پیدا کیا، اس کے بعد زمین کی صورت وشکل بنائی، پھر آسمان کی صورت بنائی۔ [1] (تفسیر روح المعانی پارہ:۱۶)

---

(۱) یہ بظاہر تو چار جوابات ہوئے لیکن جواب اول کے تحت دو تاویلیں اور جوابِ ثانی کے تحت چار تاویلات جو ذکر کی گئی ہیں اگر ان کو مستقل جوابات شمار کیے جائیں تو پہلے دو جواب چھ جواب بن جاتے ہیں اور کل ملا کر آٹھ جوابات ہوجائیں گے، کما لا یخفی۔

کفار کو جہنم سے کسی وقت نکالا جائے گا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱، ۲، ۳، ۴، ۶، ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۴، ۱۷، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۸، ۲۹، ۳۰

① ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (پارہ: ۱ رکوع: ۴ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۸)

② ﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (پارہ: ۱ رکوع: ۹ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۱۳)

③ ﴿وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ﴾ (پارہ: ۲ رکوع: ۴ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۲۴)

④ ﴿وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِهُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾

(پارہ: ۲ رکوع: ۱۱ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۳۲)

⑤ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمَاتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِهُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: ۲ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۴۰)

⑥ ﴿وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِهُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: ۶ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۴۳)

⑦ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ . اِلَى قَوْلِهٖ . وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِهُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾ (پارہ: ۴ رکوع: ۳ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۸)

⑧ ﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا﴾

(پارہ: ۴ رکوع: ۱۳ سورۂ نساء جلالین ص: ۷۲)

(۹) ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ﴾ (پارہ:۶ رکوع:۱۰ سورۂ مائدہ جلالین ص:۹۹)

(۱۰) ﴿لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُوْنَ﴾ (پارہ:۶ رکوع:۱۵ سورۂ مائدہ جلالین ص:۱۰۵)

(۱۱) ﴿وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾ (پارہ:۸ رکوع:۱۱ سورۂ اعراف جلالین ص:۱۳۲)

(۱۲) ﴿اَلَمْ يَعْلَمُوْا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا﴾

(پارہ:۱۰ رکوع:۱۴ سورۂ توبہ جلالین ص:۱۶۲)

(۱۳) ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا﴾

(پارہ:۱۰ رکوع:۱۵ سورۂ توبہ جلالین ص:۱۶۲)

(۱۴) ﴿وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ . اِلٰى قَوْلِهٖ . اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾ (پارہ:۱۱ رکوع:۸ سورۂ یونس جلالین ص:۱۷۳)

(۱۵) ﴿فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ﴾

(پارہ:۱۴ رکوع:۱۰ سورۂ نحل جلالین ص:۲۱۸)

(۱۶) ﴿لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا وَكُلٌّ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾

(پارہ:۱۷ رکوع:۷ سورۂ انبیاء جلالین ص:۲۷۷)

(۱۷) ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكَافِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا﴾

(پارہ:۲۲ رکوع:۵ سورۂ احزاب جلالین ص:۳۵۸)

(۱۸) ﴿قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ﴾

(پارہ:۲۴ رکوع:۵ سورۂ زمر جلالین ص:۳۹۰)

(۱۹) ﴿اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ﴾

(پارہ:۲۴ رکوع:۱۳ سورۂ مؤمن (غافر) جلالین ص:۳۹۶)

(۲۰) ﴿ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ﴾

(پارہ:۲۴ رکوع:۱۸ سورۂ حم سجدہ جلالین ص:۳۹۹)

(۲۱) ﴿لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾ (پارہ:۲۸ رکوع:۳ سورۂ مجادلہ جلالین ص:۴۵۳)

(۲۲) ﴿فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا﴾

(پارہ:۲۸ رکوع:۵ سورۂ حشر جلالین ص:۴۵۶)

(۲۳) ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ (پارہ:۲۸ رکوع:۱۵ سورۂ تغابن جلالین ص:۴۶۲)

(۲۴) ﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا﴾

(پارہ:۲۹ رکوع:۱۲ سورۂ جن جلالین ص:۴۷۷)

(۲۵) ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾ (پارہ:۳۰ رکوع:۲۳ سورۂ بینہ جلالین ص:۵۰۴) ✦

(۲۶) ﴿ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ﴾ (پارہ:۲۳ رکوع:۶ سورۂ صٰفٰت جلالین ص:۳۷۶)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۲۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار جہنم میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے، ان کو جہنم سے نکالا نہیں جائے گا، چنانچہ ان میں سے اکثر آیات میں تو خلود کی تصریح ہے اور آیت نمبر ۴ و ۹ میں ہے "وَمَاهُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ"، "يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَاهُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا" کہ کفار جہنم سے نکلنا چاہیں گے مگر وہ نکل نہیں پائیں گے اور اخیر کی آیت نمبر ۲۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو ماءِ حمیم پلانے کے لئے جہنم سے باہر نکالا جائے گا، پھر جہنم میں لوٹا دیا جائے گا کیونکہ اس آیت سے اوپر کی آیات میں شجرۂ زقوم کا ذکر کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِئُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ۔ ’’کہ یہ لوگ شجرۂ زقوم سے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر ان کو اس پر کھولتا ہوا گرم پانی (پیپ اور راد میں) ملا کر دیا جائے گا۔‘‘ اس کے بعد ارشاد فرمایا: ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ. پھر ان کو جہنم کی طرف لوٹنا ہوگا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ماء حمیم پلانے کے لئے ان کو جہنم سے نکالا جائے گا، پھر جہنم کی طرف لوٹا دیا جائے گا، پس یہ آیت پہلی پچیس آیات کے بظاہر معارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

① ماءِ حمیم پلانے کے لئے ان کو جہنم سے بالکلیہ نہیں نکالا جائے گا بلکہ جہنم تو چونکہ ایک وسیع وعریض جگہ ہے، اس میں اہل جہنم کے لئے مختلف درجات وطبقات ہیں، ہر شخص اپنے اپنے مستقر اور ٹھکانے پر ہوگا، ان کو ان کے مستقر سے نکال کر جہنم کے اندر ہی اندر گویا دوسری جگہ لے جایا جائے گا جہاں ماءِ حمیم کا انتظام ہوگا، وہاں سے ماء حمیم پی کر وہ پھر اپنے مستقر کی طرف لوٹ جائیں گے، پس ماءِ حمیم جہنم سے باہر نہیں ہے اور اس کو پینے کے لئے جہنم سے نکلنا لازم نہیں آتا، اور **رجوع الی الجحیم** سے مراد **رجوع الی درکات الجحیم ومستقراتھم** ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے، جمہور حضرات اسی کے قائل ہیں۔ (روح المعانی وجمل)

② بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ماءِ حمیم جہنم سے باہر ہے مگر یہ ماءِ حمیم کا پلایا جانا جہنم میں داخلہ سے پہلے ہوگا، ان کو ابتداء میں ہی شجرۂ زقوم کھلا کر اور اس پر ماءِ حمیم پلا کر پھر جہنم میں داخل کر دیا جائے گا، اس کے بعد وہ کبھی جہنم سے نہیں نکلیں گے، ہمیشہ ہمیش اسی میں رہیں گے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں، مگر یہ توجیہ خلاف ظاہر ہے۔ (روح المعانی)

آخرت میں کسی شخص کو کسی سے نفع پہنچے گا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱، ۱۳، ۲۱، ۲۴، ۲۵، ۲۷، ۳۰

① ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا﴾

(پارہ: ۱ رکوع: ۶ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۹)

② ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا﴾

(پارہ: ۱ رکوع: ۱۵ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۱۸)

③ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِىْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا﴾ (پارہ: ۲۱ رکوع: ۱۳ سورۂ لقمان جلالین ص: ۳۴۸)

④ ﴿يَوْمَ لَا يُغْنِىْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾

(پارہ: ۲۵ رکوع: ۱۵ سورۂ دخان جلالین ص: ۴۱۲)

⑤ ﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۷ سورۂ نجم جلالین ص: ۴۳۹)

⑥ ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا، وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾

(پارہ: ۳۰ رکوع: ۷ سورۂ انفطار جلالین ص: ۴۹۳) ✦

⑦ ﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ﴾

(پارہ: ۱۳ رکوع: ۹ سورۂ رعد جلالین ص: ۲۰۳)

⑧ ﴿رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِىْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ﴾ (پارہ: ۲۴ رکوع: ۶ سورۂ غافر (مؤمن) جلالین ص: ۳۹۱)

⑨ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۳ سورۂ طور جلالین ص: ۴۳۵)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں کوئی شخص کسی شخص کے کام نہ آئے گا، کسی کو کسی سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا، نہ باپ سے بیٹے کو کوئی نفع پہنچے گا نہ بیٹے سے باپ کو، آیت نمبر ۴ میں ہے کہ کوئی دوست کسی دوست کو نفع نہیں پہنچائے گا آیت نمبر ۵ سے بھی یہی بات مفہوم ہوتی ہے کہ انسان کے اسی کی سعی کام آئے گی، کسی دوسرے کی سعی اور عمل سے انسان کو نفع نہیں پہنچے گا، اسی طرح آیت نمبر ۶ میں ہے کہ اس دن کوئی نفس کسی نفس کے لئے نفع کا مالک نہیں ہوگا، غرض کہ ان پانچوں آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے روز کوئی کسی کے کام نہ آئے گا، کسی سے کسی کو نفع نہیں پہنچے گا اور آیت نمبر ۷ و ۸ و ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت میں سے جو لوگ درجات عالیہ پر فائز ہوں گے ان سے ان کے خاندان کے افراد مثلاً: آباء و اجداد، ازواج و ذریات کو نفع پہنچے گا کیونکہ آیت نمبر ۷ و ۸ میں ارشاد ہے کہ حضراتِ مؤمنین، صالحین، کاملین کے لئے جنت کے درجات عالیہ ہیں جن میں ان حضرات کے ساتھ ساتھ ان کے آباء و اجداد، ازواج و ذریات میں سے جو مؤمن ہوں گے وہ بھی انہیں درجات عالیہ میں داخل ہوں گے اگرچہ ان لوگوں کے اعمال اس درجہ کے نہیں ہوں گے کہ درجات عالیہ کے مستحق ہوتے مگر حضرات کاملین کے اعزاز و اکرام اور تعظیمِ شان کی خاطر ان کے آباء و اجداد، ازواج و ذریات کو بھی ان کے درجات پر پہنچا دیا جائے گا، تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں اور ان کے سرور و عیش میں اضافہ ہو، چنانچہ روایت میں اس آیت کی تفسیر یہی وارد ہوئی ہے۔

﴿عن ابن جبير رضی اللّٰه تعالٰی عنه قال: يدخل الرجل الجنة، فيقول: اين امی؟ اين ولدی؟ اين زوجتی؟ فيقال: لم يعملوامثل عملك. يقول: كنت اعمل لی ولهم ثم قرأ الآية......﴾

(رواہ ابن ابی حاتم وابوالشیخ، روح المعانی ج: ۱۳ص: ۱۴۳)

ترجمہ: ''ابن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آدمی جنت میں داخل ہوگا تو کہے گا میری ماں کہاں ہے؟ میرا بیٹا کہاں ہے؟ میری بیوی کہاں ہے؟ اس سے کہا جائے گا کہ ان لوگوں نے تجھ جیسے اعمال نہیں کئے تھے۔ وہ کہے گا میں نے جو اعمال کئے تھے وہ اپنے لئے بھی کئے تھے اور ان کے لئے بھی، پھر حضرت ابن جبیر نے یہ آیت پڑھی۔ ''جنت عدن یدخلونها ومن صلح. الخ.''

اور آیت نمبر ۹ میں تو صاف تصریح ہے ''الحقنابھم ذریتھم'' کہ ان کی ذریت کو ہم انہیں کے ساتھ لاحق کردیں گے، ان کے درجات پر پہنچادیں گے، اس آیت کی تفسیر بھی روایات میں یہی وارد ہوئی ہے۔

﴿عن ابن عباس رضی اللّٰه تعالٰی عنه قال: ان اللّٰه لیرفع ذریة المؤمن معه فی درجته فی الجنة، وان کانوادونه فی العمل لتقربهم عینه، ثم قرأالأیة. اخرجه سعیدبن منصور وهناد و ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم والبیهقی فی سننه.﴾

(روح المعانی ج: ۲۷ص: ۳۲)

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت میں مؤمن کی ذریت کو اسی کے ساتھ اس کے درجہ میں پہنچا دیں گے اگرچہ عمل کے اعتبار سے وہ اس سے ادنیٰ ہوں گے تاکہ ان کی وجہ سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوجائیں، پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت (وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ) تلاوت فرمائی۔''

ایک اور مرفوع روایت ہے:

﴿عن ابن عباس رضی اللّٰه تعالٰی عنه انه قال: ان النبی صلی

اللّٰہ تعالٰی علیه وآله وسلم قال: اذادخل الرجل الجنة سأل عن ابویه و زوجته وولده، فیقال له: انهم لم یبلغوادرجتك وعملك. فیقول: یارب قد عملت لی ولهم، فیؤمر بالحاقهم به۔ ﴾ (رواہ ابن مردویہ والطبرانی، روح المعانی ج: ۲۷ص:۳۲)

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب آدمی جنت میں داخل ہوگا تو اپنے والدین اور بیوی بچوں کے بارے میں سوال کرے گا (کہ وہ کہاں ہیں؟) تو اس سے کہا جائے گا کہ وہ لوگ تیرے درجہ اور تیرے عمل کو نہیں پہنچے (یعنی انہوں نے تجھ جیسے اعمال نہیں کئے کہ تیرے درجہ پر ان کو پہنچایا جاتا، وہ درجات سفلی میں موجود ہیں۔) وہ شخص کہے گا یارب میں نے اپنے لئے بھی اعمال کئے تھے اور ان کے لئے بھی، تو ان کو اسی کے ساتھ لاحق کردینے کا حکم کردیا جائے گا (کہ اس کے والدین اور بیوی بچوں کو بھی اس کے درجات عالیہ میں پہنچا دیا جائے)

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ ظاہر احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ الحاق سے مراد یہ نہیں ہے کہ کبھی کبھی زیارت وغیرہ کے لئے ان لوگوں کو اس شخص کے درجات عالیہ پر لے جایا جائے گا بلکہ مستقل سکونت عطا کردینا مراد ہے، بہر حال ان تینوں آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے نفع پہنچے گا اور پہلی چھ آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا اور کسی کو کسی سے نفع نہیں پہنچے گا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ آیت نمبر ۱ اور ۲ ''لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ

شَیْئًا." میں نفسِ اولیٰ سے مراد مؤمن، اور نفسِ ثانیہ سے مراد کافر ہے، مطلب یہ ہے کہ کوئی مؤمن کسی کافر کو نفع نہیں پہنچائے گا، یعنی اگر کسی مؤمن کا کوئی رشتہ دار یا دوست کافر ہوگا تو اس کافر کو اس مؤمن کے اعزاز واکرام میں بخشا نہیں جائے گا اسی طرح آیت نمبر ۳ "لَایَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَیْئًا." کا مطلب یہ ہے کہ "لَایَجْزِیْ وَالِدٌ مُوْمِنٌ عَنْ وَّلَدِهِ الْکَافِرِ وَلَا مَوْلُوْدٌ مُؤمِنٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهِ الْکَافِرِ" کہ کوئی مؤمن باپ اپنے بیٹے کافر کے اور کوئی مؤمن بیٹا اپنے کافر باپ کے کام نہ آئے گا، ایسے ہی آیت نمبر ۴ کا مطلب یہ ہے کہ "لَایُغْنِیْ مَوْلًی مُوْمِنٌ عَنْ مَوْلًی کَافِرٍشَیْئًا" اسی طرح آیت نمبر ۵ میں سعی سے مراد سعی ایمانی ہے، یعنی ہر انسان کو اپنے ایمان سے فائدہ ہوگا دوسرے کا ایمان کار آمد نہیں ہوگا، پس کسی مؤمن کے ایمان سے کافر کو نفع نہ پہنچے گا۔

اسی طرح آیت نمبر ۶ میں نفسِ ثانیہ سے مراد نفسِ کافرہ ہے جیسا کہ حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ کوئی شخص کسی کافر کے لئے کسی نفع کا مالک نہیں ہوگا، اور اخیر کی تین آیتوں میں جو ایک شخص کا دوسرے کے لئے نافع ہونا مذکور ہے وہ مؤمنین کے بارے میں ہے کہ ایک مؤمن سے دوسرے مؤمن کو نفع پہنچے گا کیونکہ جنت کا مستحق تو صاحب ایمان ہی ہوتا ہے، البتہ ایک شخص اپنے عمل صالح اور تقویٰ و طہارت کی وجہ سے اپنے اعزہ واقارب کے لئے ترقیِ درجات کا سبب بن جائے گا، آیت نمبر ۷، ۸ میں "وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ" کہا گیا ہے، "مَنْ صَلَحَ" کی تفسیر حضرت ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے "من آمن" کے ساتھ کی ہے، یہی تفسیر حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور آیت نمبر ۹ میں "وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ" میں ایمان کی قید مصرح ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ مؤمن مؤمن کو تو نفع پہنچائے گا مگر کافر کو مؤمن سے کوئی نفع نہیں پہنچے گا۔ فلا تعارض۔

(روح المعانی، مظہری، جمل)

قیامت کے دن کسی کی شفاعت قبول ہوگی یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱، ۱۶، ۱۷، ۲۲، ۲۵، ۲۷

آیات

① ﴿وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ﴾

(پارہ: ۱ رکوع: ۶ سورۃ بقرۃ جلالین ص: ۹)

② ﴿وَلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ﴾

(پارہ: ۱ رکوع: ۱۵ سورۃ بقرہ جلالین ص: ۱۸) ✦

③ ﴿لَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا﴾

(پارہ: ۱۶ رکوع: ۹ سورۃ مریم جلالین ص: ۲۶۰)

④ ﴿وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ﴾

(پارہ: ۱۷ رکوع: ۲ سورۃ انبیاء جلالین ص: ۲۷۱)

⑤ ﴿وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۹ سورۃ سبا جلالین ص: ۳۶۱)

⑥ ﴿وَلَا یَمْلِكُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ﴾ (پارہ: ۲۵ رکوع: ۱۳ سورۃ زخرف جلالین ص: ۴۱۰)

⑦ ﴿وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۶ سورۃ نجم جلالین ص: ۴۳۸)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱، ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کی طرف سے کوئی شفاعت کسی کے

حق میں قبول نہیں کی جائے گی اور کسی کی شفاعت سے کسی کو نفع نہیں پہنچے گا، معتزلہ اسی کے قائل ہیں، وہ شفاعت بمعنی رفع عذاب کا انکار کرتے ہیں، اور اخیر کی پانچ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوں گے جن کو حق تعالیٰ شفاعت کرنے کی اجازت دے دیں گے اور ان کی شفاعت قبول کی جائے گی جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے، چنانچہ تیسری آیت میں ارشاد ہے کہ لوگ شفاعت کے مالک نہیں ہوں گے مگر وہ شخص جو اللہ سے اجازت حاصل کر لے گا۔ عہد کی ایک تفسیر اذن (اجازت) کے ساتھ بھی منقول ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے اور ظاہر ہے کہ جب اللہ سے اجازت لے کر آدمی شفاعت کرے گا تو اس کی شفاعت کو حق تعالیٰ قبول بھی فرمائیں گے کیونکہ اجازت دینا قبول کرنے ہی کے لئے ہوگا، ورنہ اجازت دینے سے کیا فائدہ؟ نتیجہ یہ نکلا کہ حق تعالیٰ ان لوگوں کی شفاعت قبول فرمائیں گے، اسی طرح آیت نمبر ۴ میں ارشاد ہے کہ ملائکہ نہیں شفاعت کریں گے مگر اس شخص کی جس کی شفاعت کئے جانے سے حق تعالیٰ راضی ہوں گے اور جس کی شفاعت کئے جانے سے حق تعالیٰ راضی ہوں اس کے حق میں شفاعت قبول بھی ہوگی کیونکہ رضاء قبولیت کی علامت ہے، بہر حال اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ ملائکہ کی شفاعت ان لوگوں کے حق میں قبول ہوگی۔ رہی آیت نمبر ۵ سو اس میں تو صاف تصریح ہے کہ نفع نہیں دے گی شفاعت مگر اس شخص کو جس کے لئے اللہ شفاعت کی اجازت دے دیں گے اور شفاعت کا نافع ہونا قبولیت پر موقوف ہے، معلوم ہوا کہ شفاعت قبول کی جائے گی۔

اسی طرح آیت نمبر ۶ میں "اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ" فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کی گواہی دینے والے اہل علم حضرات شفاعت کرنے کے مالک ہوں گے اور مالکِ شفاعت ہونے کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ ان کی شفاعت مقبول و نافع ہوگی۔ اور آیت نمبر ۷ میں ہے کہ جن کے لئے حق تعالیٰ شفاعت کی

اجازت دے دیں گے اور ان سے راضی ہوجائیں گے ان کے حق میں ملائکہ کی شفاعت نافع ہوگی، خلاصہ یہ ہوا کہ اخیر کی پانچ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے حق میں انسانوں اور فرشتوں کی شفاعت قبول ہوگی اور آیت ۱، ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی کوئی شفاعت قبول نہیں ہوگی، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہورہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

(۱) اختلاف اشخاص پر محمول ہے، آیت نمبر ۱، ۲ کفار کے حق میں ہیں کہ کوئی مؤمن اگر کسی کافر کی شفاعت کرنا چاہے گا تو اس کی شفاعت قبول نہیں ہوگی اور آیت کا مطلب ہے "لاتقبل من النفس المؤمنة شفاعة فی حق الکافرة" اور اخیر کی پانچ آیات مؤمنین کے حق میں ہیں کہ حضرات انبیاء، ملائکہ اور مؤمنین صالحین، گنہگار مؤمنین کی شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول ہوگی اور اختلاف اشخاص کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (صاوی، مدارک وغیرہ)

(۲) اختلاف زمان پر محمول ہے، یعنی بعض اوقات میں تو کسی کی کوئی شفاعت قبول نہیں ہوگی اور یہ وہ وقت ہوگا جب تک کہ شفاعت کی اجازت نہیں ملی ہوگی اور دوسرے بعض اوقات میں جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے اجازت مل جائے گی شفاعت قبول کی جائے گی، پس آیت نمبر ۱، ۲ قبل الاذن پر اور آیات اخیرہ بعد الاذن پر محمول ہیں اور تمام آیات مؤمنین کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لئے کہ کفار کے لئے تو شفاعت کسی وقت بھی نافع نہیں ہوگی، اجازت جو ملے گی یہ صرف مؤمنین کے حق میں ملے گی، بہرحال اختلاف زمان کے بعد تعارض نہیں رہتا۔ (تفسیر روح المعانی)

قیامت کے روز کفار کے لئے کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱، ۱۹، ۲۴، ۲۹

① ﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾

(پارہ: ۱ رکوع: ۶ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۹)

② ﴿وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهُ عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾

(پارہ: ۱ رکوع: ۱۵ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۱۸)

③ ﴿مَالِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ﴾

(پارہ: ۲۴ رکوع: ۷ سورۂ مؤمن (غافر) جلالین ص: ۳۹۲)

④ ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۶ سورۂ مدثر جلالین ص ۴۸۱)

⑤ ﴿فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ﴾ (پارہ: ۱۹ رکوع: ۹ سورۂ شعراء جلالین ص: ۳۱۳)

تشریح تعارض

پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے لئے شفاعت کرنے والے تو ہوں گے مگر ان کی شفاعت مقبول و نافع نہیں ہوگی کیونکہ آیت نمبر ۱، ۲ میں حرفِ نفی مطلق شفاعت پر داخل نہیں ہے، یعنی یہ نہیں کہا گیا "لَيْسَتْ لَهُمْ شَفَاعَةٌ" کہ کفار کے لئے بالکل شفاعت ہی نہیں ہوگی بلکہ حرف نفی شفاعتِ مقیدہ بالقبولیۃ والنفع پر داخل ہے، شفاعت مقید، اور قبولیت و نفع قید ہے اور قاعدہ ہے کہ جب نفی مقید بالقید پر داخل ہو تو نفی صرف قید کی ہوتی ہے مقید کی نہیں ہوتی، مقید ثابت رہتا ہے جیسے کہا

جائے ”لیس عندی ثوب ابیض“ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے پاس کپڑا تو ہے مگر سفید کپڑا نہیں ہے، نفی ابیض کی ہے جو کہ ثوب کے لئے قید ہے، ایسے ہی یہاں پر نفی قبولیت ونفع کی ہوگی، نہ کہ مطلق شفاعت کی، جس کا مطلب یہ نکلے گا کہ کفار کے لئے شفاعت تو ہوگی مگر مقبول ونافع نہیں ہوگی، اسی طرح تیسری آیت میں ارشاد ہے کہ ظالمین کے لئے کوئی غمخوار دوست اور ایسا کوئی شفیع نہیں ہوگا جس کی بات مانی جائے، یعنی اس کی شفاعت قبول کی جائے، اس کا مطلب بھی قاعدۂ مذکورہ کے مطابق یہی ہوگا کہ ظالمین کے لئے شفیع تو ہوگا مگر اس کی شفاعت مانی نہیں جائے گی۔ ایسے ہی آیت نمبر ۴ میں ہے کہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کفار کو نفع نہیں دے گی۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شافعین تو ہوں گے مگر ان کی شفاعت کفار کے لئے نافع نہیں ہوگی، بہر حال چاروں آیات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے لئے شافعین تو ہوں گے مگر ان کی شفاعت مقبول ونافع نہیں ہوگی اور آیت نمبر ۵ میں کفار کا مقولہ ذکر کیا گیا ہے کہ ہمارے لئے کوئی شفاعت کرنے والا ہی نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے لئے کوئی شفاعت کرنے والا ہی نہیں ہوگا پس یہ آیت پہلی چار آیات کے بظاہر معارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ بسا اوقات نفی قید اور مقید دونوں کی مقصود ہوتی ہے جیسے: ”خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا“ میں ”عَمَدٍ“ مقید، ”تَرَوْنَهَا“ قید ہے اور اس آیت کی تفسیر میں جہاں اور دیگر احتمالات ہیں وہاں ایک احتمال صاحب روح المعانی نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ موصوف صفت دونوں کی نفی مقصود ہے کہ آسمانوں کے لئے ستون ہی نہیں ہیں، اسی لئے وہ نظر بھی نہیں آتے۔ صرف قید کی نفی مقصود نہیں ہے کہ ستون تو ہیں مگر نظر

نہیں آتے اس لئے کہ آسمانوں کے لئے ستونوں کا نہ ہونا ہی حق تعالیٰ شانہ کی قدرت کاملہ پر زیادہ دلالت کرنے والی چیز ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے اتنے طویل و عریض اور عظیم وثقیل آسمانوں کو بغیر ستونوں کے قائم کردیا ہے۔ پس اسی طرح پہلی چار آیات میں قید اور مقید دونوں کی نفی مقصود ہے یعنی کفار کے لئے کوئی شفاعت کرنے والا ہی نہیں ہوگا اور چونکہ قبولیت و نفع، شفاعت پر مرتب ہے جب شفاعت نہیں تو قبولیت اور نفع کا کوئی سوال ہی نہیں۔ پس ان تمام آیات کا مفہوم متحد ہوگیا کہ کفار کے لئے کوئی شفاعت کرنے والا ہی نہیں ہوگا، فاندفع التعارض۔

(جمل وغیرہ)

❷ واقعہ یہی ہے کہ کفار کے لئے کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا جیسا کہ آیت نمبر ۵ میں کہا گیا ہے اور پہلی چار آیات میں علی سبیل الفرض کلام کیا گیا ہے کہ اگر بالفرض کفار کے لئے کوئی شفاعت کرنے لگے تو اس کی شفاعت مقبول و نافع نہیں ہوگی بلکہ اگر سارے انسان و جنات مل کر بھی کسی کافر کی شفاعت کرنے لگیں تب بھی قبول نہیں ہوگی۔ پس پہلی چار آیات میں کلام علی سبیل الفرض اور آیت نمبر ۵ میں علی سبیل الواقع کیا گیا ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر روح المعانی)

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کوہِ طور پر کتنے دن کے لئے بلایا گیا تھا؟

پارہ نمبر: ۱، ۹

آیات

① ﴿وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ (پارہ: ۱ رکوع: ۶ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۹) ✦

② ﴿وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ (پارہ: ۹ رکوع: ۷ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۴۰)

تشریح تعارض

آیتِ اولیٰ میں تو فرمایا کہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا کہ آپ کوہ طور پر چالیس دن کے لئے تشریف لے آیئے، ہم آپ کو تورات عطا فرمائیں گے اور دوسری آیت میں ہے کہ تیس راتوں کا وعدہ کیا، پھر دس راتوں کا مزید اضافہ کر کے چالیس راتیں مکمل فرما دیں، پس دونوں میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے کوئی تعارض نہیں ہے، اصل وعدہ تیس راتوں کا تھا کہ آپ کوہِ طور پر تشریف لائیں اور ایک مہینہ عبادت میں گزاریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ حق تعالیٰ کی عبادت میں گزارا اور مسلسل روزے رکھے، درمیان میں افطار نہیں کیا، جس کو صومِ

وصال کہتے ہیں، تیسویں دن افطار کرلیا، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ نے افطار کر کے حالت صوم کی اس رائحہ کو دور کردیا جو ہم کو مشک سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے اس لئے آپ دس روزے اور رکھئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس روزے مزید رکھے اس طرح کل ملا کر چالیس دن ہوگئے، یہ اربعین کی تفصیل ہوئی جس کو آیت ثانیہ میں ذکر کیا گیا ہے، اسی کو آیت اولیٰ میں دونوں عددوں کو جمع کر کے اجمالاً حاصل اور نتیجہ کو بیان کرتے ہوئے فرمادیا: وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً اور کسی چیز کو اجمال کے بعد تفصیلاً ذکر کرنے، یا تفصیل کے بعد اجمالاً ذکر کرنے میں کوئی تعارض نہیں۔

(جمل، خازن، مدارک، بیان القرآن)

مرتکبِ کبیرہ مخلد فی النار ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱، ۴، ۵، ۱۰، ۲۹، ۳۰

آیات

① ﴿ بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ (پارہ: ا رکوع: ۹ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۱۳)

② ﴿ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ﴾

(پارہ: ۴ رکوع: ۱۳ سورۂ نساء جلالین ص: ۷۲)

③ ﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا ﴾

(پارہ: ۵ رکوع: ۱۰ سورۂ نساء جلالین ص: ۸۴)

④ ﴿ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۲ سورۂ جن جلالین ص: ۴۷۷) ✦

⑤ ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾

(پارہ: ۱۰ رکوع: ۱۵ سورۂ توبہ جلالین ص: ۱۶۲)

⑥ ﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ﴾ (پارہ ۳۰ رکوع: ۲۴ سورۂ زلزال جلالین ص ۵۰۵)

تشریحِ تعارض

پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مؤمن ہمیشہ ہمیش جہنم میں رہے گا کیونکہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنا، اس کے حدود سے تجاوز کرنا، کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرنا یہ سب معاصی کبیرہ ہیں اور ان کے مرتکب کو ان آیات میں مخلد فی النار بتایا گیا ہے۔[1] اور آیت نمبر ۵ و ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) معتزلہ کا یہی مسلک ہے اور یہ آیات ان کا مستدل ہے۔

صاحبِ ایمان جنت میں ضرور داخل ہوگا اگرچہ وہ فاسق و فاجر کیوں نہ ہو۔[1] حق تعالیٰ اس کے گناہوں کی سزا دینا چاہیں گے تو ایک عرصہ تک جہنم میں سزا دیکر پھر اس کے ایمان کی وجہ سے اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں بھیج دیں گے، کیونکہ آیت نمبر ۵ میں ہے کہ حق تعالیٰ نے ایمان والوں سے جنت کا وعدہ کر لیا ہے اور آیت نمبر ۶ میں ہے جو ذرہ برابر عملِ خیر کرے گا اس کا ثواب دیکھے گا اور نفسِ ایمان عملِ خیر ہے اگرچہ پوری زندگی معاصی میں گزری ہو مگر نفسِ ایمان اس کے پاس موجود ہونے کی وجہ سے کبھی نہ کبھی اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں بھیجا جائے گا اور ایمان کی جزاء اس کو ملے گی، ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن اگر مرتکب کبیرہ ہو وہ مخلد فی النار نہیں ہے بلکہ جنت میں ضرور جائے گا اور آیت نمبر ۱ تا ۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتکب کبیرہ مخلد فی النار ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ حقیقت تو وہی ہے جو آیت نمبر ۵ و ۶ میں ہے کہ صاحبِ ایمان جنت میں ضرور داخل ہوگا اگرچہ وہ مرتکب کبیرہ ہو، روایت صحیحہ میں بھی اس کی تصریح وارد ہوئی ہے:

﴿عن ابی ذر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ قال: اتیت النبی صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم وعلیہ ثوب ابیض، وھونائم، ثم اتیتہ وقد استیقظ، فقال: مامن عبدقال لا الہ الا اللّٰہ، ثم مات علی ذلك الا دخل الجنۃ. قلت: وان زنی، وان سرق!قال وان زنٰی وان سرق. قلت: وان زنی وان سرق! قال: وان زنی وان سرق. قلت: وان زنی وان سرق! قال وان زنی وان سرق. ثم فی

(۱) جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے۔

الرابعۃ علی رغم انف ابی ذر.﴾

(رواہ البخاری و مسلم، النبراس شرح شرح العقائد)

ترجمہ: ”حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرمایا کہ میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا آپ سفید کپڑا اوڑھے سورہے تھے، میں دوبارہ حاضر ہوا تو آپ بیدار ہو چکے تھے، پس آپ نے یہ ارشاد فرمایا جو بندہ لا الہ الا اللہ پڑھے، پھر اسی کلمہ پر مر جائے وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا۔ میں نے عرض کیا اگرچہ وہ زنا کرے اور چوری کرے! آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگرچہ زنا کرے اور چوری کرے۔ میں نے پھر کہا اگرچہ زنا کرے اور چوری کرے! آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگرچہ زنا کرے اور چوری کرے۔ میں نے پھر (تعجب سے) پوچھا اگرچہ زنا کرے اور چوری کرے! آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگرچہ زنا کرے اور چوری کرے۔ پھر چوتھی مرتبہ آپ نے فرمایا ابوذر کی ناک خاک آلود ہونے کے باوجود یعنی ابوذر کو کتنا ہی ناگوار محسوس ہو رہا ہو مگر وہ شخص جنت میں ضرور جائے گا۔ رہی وہ آیات جن سے مرتکب کبیرہ کا مخلد فی النار ہونا معلوم ہوتا ہے تو وہ اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہیں بلکہ ان میں تاویل کی جائے گی تاکہ آیات میں تطبیق ہو جائے۔“

پہلی آیت: ”بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ“ میں دو تاویلیں کی گئی ہیں:

① سیئہ سے مراد گناہ کبیرہ نہیں بلکہ شرک مراد ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت میں سیئہ کی تفسیر شرک کے ساتھ منقول ہے، ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ

عنہ سے، ابن جریر نے حضرت ابو وائل، مجاہد، قتادہ، عطاء اور ربیع سے سیئۃ اور خطیئۃ کی تفسیر کفر کے ساتھ نقل کی ہے، پس یہ آیت کافر کے حق میں ہوئی اور کافر مخلد فی النار ہوتا ہے، اس تفسیر کے بعد اس آیت سے مرتکبِ کبیرہ کا مخلد فی النار ہونا لازم نہیں آیا۔ پس یہ آیت اخیر کی دو آیتوں کے معارض نہیں رہی۔

(روح المعانی، مدارک، خازن وغیرہ)

② دوسری تاویل یہ ہے کہ اس میں "اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ" فرمایا گیا ہے کہ اس کی خطائیں ہر جانب سے اس کا احاطہ کر لیں یعنی اس کے ظاہر و باطن پر خطاؤں کا غلبہ ہو جائے، کوئی خیر اس کے اندر باقی نہ رہے حتی کہ اس کے قلب میں تصدیق اور زبان پر اقرار بھی باقی نہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص کافر ہوتا ہے، پس اس تاویل کی بنا پر یہ آیت کافر کے حق میں ہوئی اور کافر مخلد فی النار ہوتا ہے۔ (النبراس)

دوسری آیت: "وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِیْهَا" میں بھی دو تاویلیں کی گئی ہیں:

① وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ: سے مراد وَیَتَعَدَّ جَمِیْعَ حُدُوْدِهٖ ہے کہ جو شخص اللہ اور رسول کی نافرمانی کرے اور اللہ کی تمام حدود سے تجاوز کر جائے وہ مخلد فی النار ہے اور تمام حدود سے تجاوز کر جانے والا کافر ہوتا ہے، اس لئے کہ جمیع حدود میں ایک حد توحید بھی ہے جو شخص حد توحید سے بھی تجاوز کر جائے بایں طور کہ اللہ کے ساتھ غیر کو شریک کرنے لگے وہ کافر ہوتا ہے، مؤمن اگرچہ فاسق و فاجر ہو مگر وہ حد توحید پر ٹھہرا رہتا ہے، وہ اس حد سے تجاوز نہیں کرتا، لہٰذا وہ اس آیت میں داخل نہیں ہوگا اس کا مخلد فی النار ہونا لازم نہیں آئے گا۔ (روح المعانی، والنبراس)

② علامہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت سے اوپر جو میراث کی تقسیم بیان کی ہے اور جو حدود اس تقسیم کی متعین فرمائی ہیں جو شخص ان حدود سے تجاوز کرنا حلال سمجھے اور حلال سمجھ کر ان حدود سے تجاوز کر جائے، وہ مخلد فی النار

ہے، اور کسی گناہ کو حلال سمجھنا کفر ہے، پس یہ آیت کافر کے بارے میں ہوئی اور کافر کے مخلد فی النار ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، ان دونوں تاویلوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ یہ آیت کافر کے حق میں ہے۔ ابن جریج اور ابن جبیر سے بھی یہی منقول ہے کہ "وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ" کا مطلب من لا یؤمن بما فصل سبحانہ من المواریث یعنی وہ شخص مراد ہے جو حق تعالیٰ کی بیان کردہ مواریث پر ایمان نہ لائے۔ وہ کافر ہے اور مخلد فی النار ہے۔ (روح المعانی)

تیسری آیت: "وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّداً فَجَزَآؤُہٗ جَھَنَّمُ الخ" میں چار تاویلات کی گئی ہیں:

① خلود فی النار کی وعید زجر وتوبیخ میں تغلیظ وتشدید پر محمول ہے، یعنی خلود فی النار مقصود نہیں ہے بلکہ ڈانٹ ڈپٹ میں سختی اختیار کرتے ہوئے یہ وعید سنائی گئی ہے تاکہ کوئی شخص مؤمن کو قتل کرنے کی جرأت وہمت نہ کرسکے، روایات میں بھی قتلِ مؤمن پر اس قسم کی وعیدیں زجر وتوبیخ کے طور پر وارد ہوئی ہیں۔

﴿عَنِ الْحَسَنِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ: نَازَلْتُ رَبِّیْ فِیْ قَاتِلِ الْمُؤْمِنِ اَنْ یَجْعَلَ لَہٗ تَوْبَۃً، فَاَبٰی عَلَیَّ.﴾ (رواہ عبد بن حمید۔ روح المعانی ج:۵ ص:۱۱۶)

ترجمہ: "حضرت حسن سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے مؤمن کے قاتل کے بارے میں درخواست کی کہ اس کی توبہ قبول کرلیا کریں تو حق تعالیٰ نے انکار فرما دیا۔ (کہ مؤمن کے قاتل کی دعا قبول نہیں کروں گا)"

یہ زجر وتوبیخ پر محمول ہے، ورنہ ہر گناہ کبیرہ سے حتی کہ کفر وشرک سے بھی توبہ قبول ہوجاتی ہے، اسی طرح حضرت سعید بن عیینہ سے منقول ہے کہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا، ایک شخص آیا، اس نے دریافت کیا کہ کیا

مؤمن کو قتل کرنے والے کی توبہ قبول ہو جاتی ہے؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "لَا وَالَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِی سَمِّ الْخِیَاطِ" قسم ہے اس ذات کی جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اس شخص کی توبہ قبول نہیں ہوتی وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے سوراخ میں داخل ہو جائے۔ (یعنی قاتلِ مؤمن کا جنت میں داخل ہونا محال ہے جیسا کہ اونٹ کا سوئی کے سوراخ میں داخل ہونا محال ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مشہور ہے کہ قاتلِ مؤمن کی توبہ قبول نہیں ہوتی، یہ سب زجر و توبیخ پر محمول ہے۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ حضرت ابن حمید اور امام نحاس رحمہما اللہ نے سعید بن عبیدہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص مؤمن کو قتل کر دے اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے، ایک مرتبہ ایک شخص نے آ کر ان سے سوال کیا کہ کیا قاتلِ مؤمن کی توبہ قبول ہو جاتی ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا نہیں، اس کے لئے تو صرف جہنم ہے۔ جب وہ شخص چلا گیا تو اہلِ مجلس نے عرض کیا آپ تو اس طرح کا فتویٰ نہیں دیتے ہیں آپ تو ہم سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ قاتلِ مؤمن کی توبہ قبول ہو جاتی ہے، آج کیا بات ہوئی؟ (کہ آپ نے فرما دیا اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی اس کے لئے صرف جہنم ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ شخص غصہ میں بھرا ہوا تھا، میرا گمان یہ ہے کہ اس کا ارادہ کسی مؤمن کو قتل کرنے کا تھا (یہ اسی لئے معلوم کرنے آیا تھا کہ اگر قبولیتِ توبہ کی گنجائش نکل آئی تو قتل کرنے کے بعد توبہ کر لوں گا، اس لئے میں نے اس سے کہہ دیا کہ قاتلِ مؤمن کی توبہ قبول نہیں ہوتی تا کہ یہ قتل سے رک جائے) لوگوں نے کسی شخص کو اس کے پیچھے بھیجا کہ دیکھ آئے وہ کہاں جاتا ہے، اس کا کیا ارادہ ہے، معلوم ہوا کہ واقعی اس کا ارادہ کسی مؤمن کو قتل کرنے کا تھا، اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ زجر و توبیخ کے طور پر فرما دیا کرتے تھے کہ قاتلِ مؤمن کی

توبہ قبول نہیں ہوتی، وہ مخلد فی النار ہوتا ہے، پس ایسے ہی آیت شریفہ بھی تغلیظ وتشدید فی الزجر والتوبیخ پر محمول ہے۔ (روح المعانی)

(۲) دوسری تاویل یہ ہے کہ مطلب آیت شریفہ کا یہ ہے کہ قتلِ مؤمن عمداً کی جزاءِ حقیقی تو تخلید فی النار ہی ہے، اگر حق تعالیٰ اس کو جزائے حقیقی دینا چاہیں تو تخلید فی النار کی سزا دیں گے مگر یہ حق تعالیٰ کے فضل وکرم کی بات ہے کہ اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں بھیج دیں گے۔ ابن منذر نے عون بن عبداللہ سے اس آیت کی تفسیر میں یہی نقل کیا ہے "فَجَزَآءُ هٗ جَهَنَّمُ اِنْ هُوَجَازَاهُ" ابوداوٗد شریف کی روایت میں حضرت ابومجلز سے یہی تفسیر منقول ہے "قَالَ: هِيَ جَزَآءُ هٗ فَاِنْ شَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَجَاوَزَ عَنْ جَزَائِهٖ فَعَلَ" کہ قتلِ مؤمن کی جزاء تو جہنم ہی ہے (معافی کا کوئی سوال نہیں) لیکن حق تعالیٰ شانہ اگر معاف کرنا چاہیں گے تو معاف فرمادیں گے۔ عذاب کی وعید بیان کرنے کے بعد اس کے خلاف کردینا، یعنی معاف کردینا اس کو کذب نہیں کہا جاتا ہے جیسے کوئی شخص کسی کو زجر وتوبیخ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تو نے فلاں حرکت کی تو تیری سزا قتل اور ضرب ہے، پھر اس حرکت کے کرنے پر اس کو وہ سزا نہ دے تو اس کو کذب نہیں کہا جاتا بلکہ یہ تو احسان وکرم شمار ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ سزا تو اس جرم کی قتل وضرب ہی تھی مگر ہم نے تجھ پر احسان وکرم کرتے ہوئے تجھ کو معاف کردیا، پس اسی طرح حق تعالیٰ وعید بیان کرنے کے بعد اگر چاہیں گے تو معاف فرمادیں گے، امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل وعدہ خلافی تو نہیں کرسکتے، البتہ وعید کے خلاف کرسکتے ہیں، حدیث میں بھی یہ مضمون وارد ہوا ہے:

﴿عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ وَّعَدَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى عَمَلِهٖ ثَوَابًا فَهُوْ مُنْجِزُلَهٗ، وَمَنْ اَوْعَدَهٗ عَلٰى عَمَلِهٖ عِقَابًا فَهُوَ بِالْخِيَارِ.﴾

(روح المعانی ج:۵ ص:۱۱۶)

ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ جس شخص سے اس کے عمل پر ثواب کا وعدہ فرما لیتے ہیں اس کو پورا فرماتے ہیں اور جس کے عمل پر عذاب کی وعید بیان کر دیتے ہیں تو حق تعالیٰ کو اختیار ہے (چاہیں تو عذاب دیدیں چاہیں معاف فرما دیں)۔“

بہر حال اس تفسیر کے بعد آیت سے مرتکبِ کبیرہ کا مخلد فی النار ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ فلا تعارض۔ (روح المعانی، مدارک، خازن)

③ تیسری تاویل یہ ہے کہ یہ استحلال پر محمول ہے، یعنی اگر کوئی شخص حلال سمجھ کر کسی مؤمن کو قتل کرے وہ مخلد فی النار ہے اور گناہ کبیرہ کو حلال سمجھنا کفر ہے اور کفر کی سزا تخلید فی النار ہے، حضرت عکرمہ اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے متعمداً کی تفسیر مستحلاً کے ساتھ کی ہے۔ (روح المعانی، وخازن، وجلالین)

④ چوتھی تاویل: آیت کا مطلب یہ ہے ”وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِناً لِكَوْنِه مُؤْمِناً“ کہ جو شخص کسی مؤمن کو اس کے مؤمن ہونے کی وجہ سے قتل کرے وہ مخلد فی النار ہے اور ظاہر ہے کہ کسی مؤمن کو اس وجہ سے قتل کرنا کہ وہ مؤمن ہے یہ کفر ہے کیونکہ یہ ایمان سے نفرت اور عداوت کی دلیل ہے اور ایمان سے عداوت ونفرت رکھنا کفر ہے، وجہ اس تاویل کی یہ ہے کہ جب کسی حکم کو کسی مشتق پر مرتب کیا جاتا ہے تو اس مشتق کا مصدر ترتبِ حکم کی علت ہوتا ہے، یہاں پر قتل مرتب ہو رہا ہے مؤمن پر جو کہ مشتق ہے، پس اس کا مصدر یعنی ایمان قتل کی علت بن جائے گا کہ یہ شخص ایمان کی وجہ سے اس کو قتل کر رہا ہے جیسے کہا جائے ”ضَرَبْتُ السَّارِقَ“ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے ”ضربت السارق لکونه سارقًا“ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ”اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا“ اس کا مطلب ہے ”فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا لِكَوْنِهِمَا سَارِقَيْنِ.“

(النبراس)

چوتھی آیت کی تاویل یہ ہے کہ "وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ" سے مراد توحید کے معاملہ میں نافرمانی کرنا ہے کیونکہ اوپر سے کلام توحید کے متعلق چل رہا ہے، مطلب یہ ہوگا "مَنْ لَّمْ یُؤْمِنْ بِالتَّوْحِیْدِ، فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَھَنَّمَ خَالِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا"

❷ اس تعارض کا دوسرا جواب چاروں آیات کا مجموعی جواب ہے کہ ان آیات میں خلود سے مراد مجازاً مکثِ طویل (زمانہ طویل تک رہنا) ہے، کہا جاتا ہے "سِجْن مُخلَّد" مراد اس سے لمبی قید ہوتی ہے، یہ تاویل ان آیات میں اکثر مفسرین نے کی ہے، اس صورت میں مرتکبِ کبیرہ کا مخلد فی النار ہونا اور عدم خروج من النار لازم نہیں آتا۔ پس یہ آیات اخیر کی دونوں آیتوں کے معارض نہیں ہوں گی۔

آیاتِ قرآنیہ میں حق تعالیٰ تبدیلی فرماتے ہیں یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱، ۱۱، ۱۴، ۲۶

(۱) ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا﴾

(پارہ: ۱ رکوع: ۱۳ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۱۶)

(۲) ﴿وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَّاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْا إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ﴾

(پارہ: ۱۴ رکوع: ۲۰ سورۂ نحل جلالین ص: ۲۲۶) ✦

(۳) ﴿لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ﴾ (پارہ: ۱۱ رکوع: ۱۲ سورۂ یونس جلالین ص: ۱۷۶)

(۴) ﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۱۶ سورۂ ق جلالین ص: ۴۳۱)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ اور ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ آیت قرآنیہ میں تبدیلی فرما دیتے ہیں کہ ایک آیت کو منسوخ کر کے اس کے بدلہ میں اس جیسی آیت یا اس سے بہتر لے آتے ہیں اور آیت نمبر ۳، ۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے کلمات واقوال میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت نمبر ۱ و ۲ میں تبدیل سے مراد تبدیلی احکام ہے، یعنی ایک حکم منسوخ کر کے اس کے بدلہ میں دوسرا حکم نازل فرما دیتے ہیں اور آیت نمبر ۳ و ۴ میں عدمِ تبدیل سے مراد عدم تبدیلِ وعد و وعید ہے، یعنی حق تعالیٰ کسی حکمت و مصلحت کی وجہ سے احکام میں تبدیلی فرما دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ جانتے ہیں کہ کس حال اور کس زمانہ میں کون سا حکم بندوں کے لئے مناسب ہے جیسا کہ ایک ماہر طبیب و ڈاکٹر مریض کے لئے دواؤں کا نسخہ بدل دیتا ہے، وہ اپنی مہارت فی الطب کی وجہ سے جانتا ہے کہ اتنے روز تک مریض کے لئے یہ دوا مفید ہوگی، اس کے بعد مریض کی حالت بدل جائے گی اور دوسری دوا اس کے لئے نافع ہوگی، حق تعالیٰ کے احکام امراض معنویہ و روحانیہ کے لئے دواؤں کی حیثیت رکھتے ہیں، حق تعالیٰ اپنے علم و حکمت کے مطابق ان میں تبدیلی کر دیتے ہیں لیکن حق تعالیٰ کے وعد و وعید میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی، حق تعالیٰ مغفرت و رحمت جنت اور ثواب وغیرہ کا جو وعدہ فرما لیتے ہیں اس کے خلاف نہیں کرتے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ."

اسی طرح عذابِ جہنم وغیرہ کی جو وعید بیان کرتے ہیں اس کے خلاف نہیں کرتے، آیت نمبر ۳ "لَاتَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہِ" میں کلمات سے مراد وعدے ہیں جیسا کہ آیت کے سیاق وسباق "لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ لَاتَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہِ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ" سے معلوم ہوتا ہے اور آیت نمبر ۴ "مَایُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ" میں قول سے مراد وعید ہے جیسا کہ آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے "لَاتَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْکُمْ بِالْوَعِیْدِ مَایُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ." (روح المعانی)

❷ اخیر کی دو آیتوں میں کلمات و اقوال سے مراد حق تعالیٰ کی قضاء یعنی ازل میں مقرر شدہ فیصلے ہیں، یعنی حق تعالیٰ شانہ نے جو فیصلہ کر دیا ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے، اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور احکام منسوخ کرنا اور بدلنا یہ بھی حق تعالیٰ کے

فیصلوں میں سے ایک فیصلہ ہے، حق تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ فلاں وقت تک فلاں حکم جاری رہے گا، اس کے بعد وہ حکم بدل جائے گا اس فیصلہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی، یعنی ایسا نہ ہوگا کہ وقت آنے پر وہ حکم نہ بدلے، لہٰذا احکام کا منسوخ ہو جانا اور بدل جانا "مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ" اور "لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ" کے عین موافق ومطابق ہے، ان میں کوئی تعارض نہیں۔ هذا ماسنح لي ولم اجده فيما تتبعته من الكتب التي عندي. والله اعلم.

سب سے بڑا ظالم کون شخص ہے؟

پارہ نمبر: ۱، ۷، ۸، ۱۱، ۱۲، ۲۱، ۲۴، ۲۸

آیات

① ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَاللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ﴾

(پارہ: ا رکوع: ۱۴ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۱۷) ✦

② ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ﴾

(پارہ: ا رکوع: ۱۶ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۲۰) ✦

③ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ﴾

(پارہ: ۷ رکوع: ۹ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۱۳)

④ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ﴾

(پارہ: ۷ رکوع: ۱۷ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۰)

⑤ ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾

(پارہ: ۸ رکوع: ۴ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۷)

⑥ ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا﴾

(پارہ: ۸ رکوع: ۷ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۸)

⑦ ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ﴾

(پارہ: ۸ رکوع: ۱۱ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۳۲)

⑧ ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ﴾ (پارہ: ۱۱ رکوع: ۷ سورۂ یونس جلالین ص: ۱۷۱)

⑨ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى

رَبِّهِمْ ﴾ (پارہ:۱۲ رکوع:۲ سورۂ ہود جلالین ص:۱۸۱)

(۱۰) ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ﴾

(پارہ:۲۱ رکوع:۱۵ سورۂ سجدۂ جلالین ص:۳۵۰)

(۱۱) ﴿ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ﴾

(پارہ:۲۴ رکوع:۱ سورۂ زمر جلالین ص:۳۸۷)

(۱۲) ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰۤى اِلَى الْاِسْلَامِ ﴾

(پارہ:۲۸ رکوع:۹ سورۂ صف جلالین ص:۴۵۹)

تشریحِ تعارض

وَمَنْ اَظْلَمُ کا صیغہ قرآن پاک میں، بہت سی جگہ آیا ہے جیسا کہ آیات مذکورہ سے ظاہر ہے، اس میں "من" استفہامیہ ہے، آیت نمبر ا کا ترجمہ یہ ہوگا کہ کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا ذکر کرنے سے لوگوں کو روکے؟ لیکن اس میں استفہام کے حقیقی معنی یعنی "استعلام کسی چیز کو معلوم کرنا، سمجھنا" مراد نہیں ہو سکتے اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ تو علیم بکل شئے ہیں، ان کے حق میں استفہام محال ہے اس لئے استفہام مجازاً نفی کے معنی میں ہے جس کو استفہامِ انکاری کہتے ہیں اور من اظلم کا مطلب لَا اَحَدٌ اَظْلَمَ ہے، اب ترجمہ یہ ہوگا کہ اس سے بڑا کوئی ظالم نہیں ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا ذکر کرنے سے روکے، یعنی سب سے بڑا ظالم مانع ذکر اللہ فی المساجد ہے، اسی طرح ہر آیت میں یہی مطلب نکلے گا کہ سب سے بڑا ظالم وہ شخص ہے جو اللہ پر افتراء پردازی کرے وہکذا۔

اب تعارض یہ ہے کہ آیت نمبر ا سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا ظالم مساجد میں اللہ کا ذکر کرنے سے روکنے والا ہے، اس سے بڑا کوئی ظالم نہیں اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا ظالم وہ شخص ہے جو شہادت کو چھپائے، اس سے

بڑا کوئی ظالم نہیں اور اخیر کی تمام آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا ظالم شخص وہ ہے جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے، آیاتِ خداوندی کی تکذیب کرے اور ان سے اعراض کرے، ان آیات میں متعدد لوگوں کو اظلم بتایا گیا ہے حالانکہ اظلم تو ایک ہی شخص ہوسکتا ہے، اگر مانع ذکر اللہ فی المسجد اظلم ہے تو کاتم شہادت اظلم نہیں ہوسکتا، اگر کاتمِ شہادت اظلم ہے تو مانعِ ذکر اظلم نہیں ہوسکتا، اسی طرح تمام آیات میں کہا جائے گا، پس ان آیات میں تعارض ہوگیا کہ ہر ایک کی اظلمیت کا اثبات بھی ہے اور اس کی نفی بھی ہورہی ہے۔ و ھذا ھو التعارض۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

(۱) ہر آیت میں جو ایک شخص کی اظلمیت میں تخصیص ہورہی ہے وہ ''من'' موصولہ کے بعد آنے والے صلہ کے مفہوم کے ساتھ ہے مثلاً ''مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ الخ'' کا مطلب یہ ہے کہ لا احد من المانعین اظلم ممن منع مساجد اللّٰه الخ یعنی نیک کاموں سے روکنے والے لوگوں میں سب سے بڑا ظالم وہ شخص ہے جو اللہ کی مسجدوں میں ذکر اللہ کرنے سے روکے۔ اسی طرح ''لا احد من الکاتمین اظلم ممن کتم شہادۃ عندہ من اللّٰه'' کہ کاتمین میں سے سب سے بڑا ظالم وہ شخص ہے جو شہادت من اللہ کا کتمان کرے۔ ایسے ہی ''لا احد من المفترین اظلم ممن افترٰی علی اللّٰه کذبا'' افتراء پردازی کرنے والوں میں سے سب سے بڑا ظالم وہ ہے جو اللہ پر افتراء پردازی کرے۔ ''لا احد من المکذبین اظلم ممن کذب بآیت اللّٰه، ولا احد من الکذابین ممن کذب علی اللّٰه، ولا احد من المعرضین اظلم ممن ذکر بآیت ربه، ثم اعرض عنها.'' اس صورت میں کوئی تعارض نہیں رہا، اسلئے

کہ ہر شخص کی اظلمیت کی نوعیت جداگانہ ہے۔ (جمل وروح المعانی)

❷ ان آیات میں مانع، کاتم، مفتری، کاذب، مکذب وغیرہم کو اظلم کہا گیا ہے، اس میں کوئی تعارض نہیں اس لئے کہ متعدد افراد اظلمیت میں برابر ہوسکتے ہیں، یہ لفظ تسویة فی الاظلمیت کی نفی پر دلالت نہیں کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ یہ سارے کے سارے اظلم ہونے میں برابر ہیں اور یہ سب اپنے علاوہ دیگر لوگوں سے اظلم ہیں جیسا کہ کہا جائے، لا احدا أفقه من زید وعمرو وخالد، زید عمرو وخالد سے زیادہ کوئی افقہ نہیں ہے، یعنی یہ تینوں سب سے بڑے فقیہ ہیں، اس کا مطلب عرف میں یہ ہوتا ہے کہ یہ تینوں افقہ ہونے میں برابر ہیں اور باقی تمام لوگ ان سے کم درجہ کے فقیہ ہیں۔ (روح المعانی، جمل)

❸ اس طرح کے کلام سے بسا اوقات صرف مبالغہ مقصود ہوتا ہے، مساوات یا زیادتی کی نفی مقصود نہیں ہوتی کہ دوسرا شخص اس سے بڑا ظالم ہے یا نہیں ہے، مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسا کرنے والا بڑا ظالم شخص ہے، بہت بری حرکت میں مبتلا ہے، اس کو ایسا نہ کرنا چاہئے، پس ان آیات میں بھی مبالغہ مقصود ہے کہ ایسے لوگ بڑے ظالم ہیں قطع نظر اس سے کہ دوسرے اظلم ہیں یا نہیں۔ فافهم. (روح المعانی)

مشرق ومغرب کی تعداد کتنی ہے؟

پارہ نمبر: ۱، ۱۹، ۲۳، ۲۷، ۲۹

① ﴿ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ﴾

(پارہ: ۱ رکوع: ۱۴ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۱۸)

② ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾

(پارہ: ۱۹ رکوع: ۲ سورۂ شعراء جلالین ص: ۳۱۰)

③ ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۳ سورۂ مزمل جلالین ص: ۴۷۸) ✦

④ ﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ۵ سورۂ صٰفّٰت جلالین ص: ۳۷۳)

⑤ ﴿ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ ﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۸ سورۂ معارج جلالین ص: ۴۷۴) ✦

⑥ ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۱ سورۂ رحمٰن جلالین ص: ۴۴۴)

تشریح تعارض

پہلی تین آیتوں میں مشرق ومغرب صیغۂ مفرد کے ساتھ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرق ومغرب ایک ایک ہیں اور آیت نمبر ۴ و ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشارق ومغارب کثیرہ ہیں اور آیت نمبر ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرق ومغرب دو دو ہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ پہلی تین آیتوں میں تو جنسِ مشرق و مغرب مراد ہے جو قلیل و کثیر سب کو شامل ہے اور آیت نمبر ۴ و ۵ میں ہر یوم کی مشرق و مغرب کے اعتبار سے جمع کا صیغہ لایا گیا ہے کیونکہ روزانہ مشرق و مغرب بدلتے رہتے ہیں، سال کے ایام کی تعداد کے مطابق تین سو ساٹھ (۳۶۰) مشارق اور تین سو ساٹھ (۳۶۰) مغارب ہیں، ابن عطیہ سے مروی ہے کہ یک سو اسی (۱۸۰) مشارق اور اتنے ہی مغارب ہیں، یا مطلق کواکب کے مشارق و مغارب مراد ہیں، اس لئے صیغۂ جمع لایا گیا ہے اور آیت نمبر ۶ میں مشرق صیف و شتاء اور مغرب صیف و شتاء کے اعتبار سے صیغۂ تثنیہ استعمال کیا گیا ہے، گرمی و سردی کے مشرق و مغرب مختلف ہوتے ہیں، یا مشرقِ شمس و قمر اور مغربِ شمس و قمر کے اعتبار سے مشرقین و مغربین کہہ دیا گیا ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (روح المعانی)

نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱، ۲

آیات

① ﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ (پارہ: ا رکوع: ۱۴ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۱۸) ✦

② ﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾

(پارہ: ۲ رکوع: ا و ۲ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۲۱ و ۲۲)

تشریح تعارض

آیت نمبر ا میں فرمایا کہ جدھر بھی رخ کرلو اسی طرف اللہ کی ذات موجود ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں، مصلی کو اختیار ہے جس طرف منہ کر کے چاہے نماز پڑھ لے اور آیت نمبر ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جہاں بھی کہیں ہو قبلہ (مسجد حرام) کی طرف رخ کرنا ضروری ہے، پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں:

❶ لفظ أينما جہت کے معنی میں ہو کر تُوَلُّوْا کا مفعول نہیں ہے بلکہ یہ مکان کے معنی میں ہے اور تولوا کا ظرف ہے اور وجہ اللہ میں "وجہ" سے مراد جہت ہے جیسا کہ وزن بمعنی زنۃ ہے، مطلب یہ ہوگا "فِيْ اَيِّ مَكَانٍ تُوَلُّوْا شَطْرَ الْقِبْلَةِ فَثَمَّ

وَجْهه اللّٰهِ الَّتِيْ اُمِرْتُمْ بِهَا" کہ جس جگہ رہ کر بھی تم قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لوگے اسی جگہ اللہ کی وہ جہت موجود ہے جس کی طرف تم کو رخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی نماز کسی مسجد اور کسی مکان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ پورے عالم میں جس مسجد میں یا جس جگہ، گھر یا جنگل وغیرہ میں (بشرطیکہ پاک جگہ ہو اور کوئی محذور شرعی نہو) قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لو، نماز درست ہو جائے گی۔ امت محمدیہ کے لئے پوری زمین کو مسجد اور طہور بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے: "جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وطُهُوْرًا"، امم سابقہ کے لئے ان کے معابد، بیعہ وکنائس میں نماز پڑھنا ضروری تھا، خارجِ معبد نماز درست نہیں تھی مگر یہ اس امت کی خصوصیت ہے کہ اَيْنَمَا تَوَلَّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ جس جگہ بھی قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لی جائے، اللہ کی مقرر کی ہوئی جہت موجود ہے، جہت کی اضافت اللہ کی طرف اس لئے کردی گئی ہے کہ اللہ نے اس جہتِ قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وجہ ذات کے معنی میں ہے جیسے "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" میں وجہ بمعنی ذات مستعمل ہے، اب ترجمہ یہ ہوگا کہ جس جگہ رہ کر بھی قبلہ کی طرف منہ کر لو اسی جگہ اللہ کی ذات موجود ہے۔ مگر اس وقت لفظ ذات کنایہ ہوگا علم اور اطلاع سے، یعنی اسی جگہ اللہ کو تمہارے نماز پڑھنے اور رخ کرنے کا علم ہے، اللہ تعالیٰ ہر جگہ اپنے بندوں کی عبادات پر مطلع ہیں۔

ابو منصور نے وجہ بمعنی جاہ لیا ہے اور جاہ سے مراد عظمت وجلالت ہے "اى فثم عظمة الله وجلالته" بہر حال "وجہ" جہت کے معنی میں ہو یا ذات وعظمت کے معنی میں ہو، مراد اس آیت سے کسی بھی مقام پر رہ کر قبلہ کی طرف رخ کرنا ہے، لہٰذا یہ آیت: فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَه کے معارض نہیں ہے۔ (روح المعانی)

❷ اَيْنَمَا جہت کے معنی میں ہو کر تولوا کا مفعول ہے جیسا کہ یہی استعمال اس کا

شائع ہے یعنی ای جھة توجهوا جس طرف بھی رخ کرلو ادھر ہی اللہ کی ذات موجود ہے، مگر یہ آیت تطوع علی الراحلة فی السفر کے بارے میں نازل ہوئی جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے (سفر سے مراد سفرِ لغوی) یعنی آبادی سے باہر سواری پر سوار ہو کر نفل نماز پڑھنے کے لئے جہتِ قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں ہے جس طرف بھی سواری کا رخ ہو اسی طرف نماز درست ہو جائے گی، اور آیت نمبر ۲ "حَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَهٗ" فرض نماز اور آبادی میں نماز کے متعلق ہے، یعنی فرض نماز خواہ آبادی میں ہو یا آبادی سے باہر اور نفل نماز جب کہ آبادی میں ہو غیر قبلہ کی طرف درست نہیں ہے، پس ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ (روح المعانی)

❸ اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کا حکم ان لوگوں کے لئے ہے جن پر قبلہ مشتبہ ہو جائے، وہ تحری کر کے جس طرف بھی نماز پڑھ لیں گے درست ہو جائے گی، اگرچہ فی الواقع غیر قبلہ کی طرف ہو، حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی مروی ہے کہ ایک غزوہ میں جس میں، میں بھی شریک تھا، لوگوں پر قبلہ مشتبہ ہو گیا تھا تو جنوب اور شمال کی طرف نماز پڑھ لی تھی، صبح کو خطا ظاہر ہوئی تھی کہ غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھی گئی، اس پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی "اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ"، "ای اذا اشتبهت علیکم القبلة، واذا لم تشتبه القبلة فولوا وجوهکم شطر المسجد الحرام"، فلا تعارض بینهما۔ (روح المعانی)

❹ آیت نمبر ا سے مصلیٰ کو کسی بھی طرف رخ کرنے میں اختیار دینا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ آیت تحویلِ قبلہ کی تمہید ہے، جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو یہود نے اعتراض کیا کہ مسلمان لوگ پہلے تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے اور اب مسجد حرام کی طرف نماز پڑھنے لگے ایسا کیوں کیا؟

حق تعالیٰ شانہ نے اس کا جواب دیا کہ اللہ جل شانہ تمام جہات کے مالک ہیں،

وہ اپنی مصلحت وحکمت سے جس جہت کو چاہیں قبلہ مقرر کردیں، تمہیں اس پر اعتراض کا کوئی حق نہیں، حق تعالیٰ نے چند مہینوں تک بیت المقدس کو قبلہ قرار کردیا، اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا جس سے اس بات کو واضح کردیا کہ کسی خاص جہت کو قبلہ بنانا اس وجہ سے نہیں کہ معاذ اللہ خدائے تعالیٰ اسی جہت یا اس مکان میں ہے، دوسری جہت میں نہیں ہے، حق تعالیٰ کی توجہ تو ہر سمت میں برابر ہے، حق تعالیٰ جہت ومکان سے منزہ ہیں، کسی جہت ومکان کے ساتھ مقید ومحدود نہیں ہیں، لہٰذا تم لوگ جس طرف بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ کی ذات موجود ہے۔ (تفسیر روح المعانی، وبیان القرآن)

۵ آیت نمبر ا منسوخ ہے آیت نمبر ۲ سے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے، ابتداء میں اختیار تھا جس طرف چاہے منہ کر کے نماز پڑھ لی جائے، پھر اس کو منسوخ کردیا گیا اور بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیدیا گیا۔

فلا تعارض بعد النسخ۔ (الاتقان فی علوم القرآن)

حق تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ مشابہت ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱، ۶، ۸، ۱۱، ۱۶، ۱۷، ۱۹، ۲۱، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۳۰

① ﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ (پارہ: ۱ رکوع: ۱۴ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۱۸)

② ﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ﴾ (پارہ: ۲۱ رکوع: ۷ سورۂ روم جلالین ص: ۳۴۳)

③ ﴿تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ﴾ (پارہ: ۲۱ رکوع: ۷ سورۂ روم جلالین ص: ۳۴۴)

④ ﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۲ سورۂ رحمٰن جلالین ص: ۴۴۴)

⑤ ﴿اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۱۷ سورۂ لیل جلالین ص: ۵۰۱)

⑥ ﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ﴾ (پارہ: ۶ رکوع: ۱۳ سورۂ مائدۃ جلالین ص: ۱۰۳)

⑦ ﴿فَسُبْحَانَ الَّذِىْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (پارہ: ۲۳ رکوع: ۴ سورۂ یٰس جلالین ص: ۳۷۳)

⑧ ﴿يَدُاللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ (پارہ: ۲۶ رکوع: ۹ سورۂ فتح جلالین ص: ۴۲۳)

⑨ ﴿وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ﴾ (پارہ: ۲۴ رکوع: ۴ سورۂ زمر جلالین ص: ۳۹۰)

⑩ ﴿وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۲۰ سورۂ حدید جلالین ص: ۴۵۲)

(۱۱) ﴿تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

(پارہ:۲۹ رکوع:۱ سورۂ ملک جلالین ص:۴۶۶)

(۱۲) ﴿اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيَاتِ رَبِّكَ﴾

(پارہ:۸ رکوع:۷ سورۂ انعام جلالین ص:۱۲۸)

(۱۳) ﴿أَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا﴾

(پارہ:۱۷ رکوع:۴ سورۂ انبیاء جلالین ص:۲۷۳)

(۱۴) ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَاعَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَآءً مَّنْثُوْراً﴾

(پارہ:۱۹ رکوع:۱ سورۂ فرقان جلالین ص:۳۰۴)

(۱۵) ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (پارہ:۳۰ رکوع:۱۴ سورۂ فجر جلالین ص:۴۹۹)

(۱۶) ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (پارہ:۸ رکوع:۱۴ سورۂ اعراف جلالین ص:۱۳۴)

(۱۷) ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَالخ﴾

(پارہ:۱۱ رکوع:۶ سورۂ یونس جلالین ص:۱۷۰)

(۱۸) ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (پارہ:۱۶ رکوع:۱۰ سورۂ طٰہٰ جلالین ص:۲۶۰)

(۱۹) ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ الرَّحْمٰنُ فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْراً﴾

(پارہ:۱۹ رکوع:۳ سورۂ فرقان جلالین:۳۰۷) ✦

(۲۰) ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (پارہ:۲۵ رکوع:۳ سورۂ شوریٰ جلالین ص:۴۰۲)

تشریح تعارض

پہلی پانچ آیات میں حق تعالیٰ کے لئے وجہ (چہرہ) ہونے کا ثبوت ہے، اس کے بعد آیت نمبر۶ تا ۱۱ میں ید اور یمین، یعنی ہاتھ کا ثبوت ہے، اس کے بعد آیت نمبر ۱۲ تا ۱۵ میں حق تعالیٰ کے لئے قدوم واتیان کو ثابت کیا گیا ہے، اس کے بعد آیت نمبر ۱۶ تا ۱۹ میں استواء علی العرش یعنی عرش پر بیٹھنا ثابت کیا گیا ہے، استواء کے معنی جلوس

کے آتے ہیں، ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے لئے بھی مخلوق کی طرح اعضاء و جوارح ہیں، چہرہ بھی ہے، ہاتھ پاؤں بھی ہیں جن سے پکڑتے ہیں اور چلتے پھرتے، آتے جاتے ہیں اور حق تعالیٰ تخت پر بھی بیٹھتے ہیں، ان آیات سے حق تعالیٰ کا مخلوق کے مشابہ و مماثل ہونا لازم آتا ہے اور اخیر کی آیت نمبر ۲۰ میں فرمایا کہ اللہ کے مثل کوئی شئے نہیں ہے، حق تعالیٰ جسمیت اور اعضاء و جوارح اور مماثلتِ مخلوق سے بالکل منزہ و مقدس ہے، پس اخیر کی یہ آیت پہلی آیات کے بظاہر معارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی آیات جن سے تشبیہ و تجسیم کا شبہ ہوتا ہے آیاتِ متشابہات کہلاتی ہیں، جن میں علماء کے دو مسلک ہیں: (۱) مسلکِ تفویض، (۲) مسلکِ تاویل۔ مسلک تفویض کا مطلب یہ ہے کہ ان کے معانی و مفاہیم کو حق تعالیٰ کے علم پر محول کر دیا جائے۔ یعنی یوں کہا جائے کہ حق تعالیٰ ہی ان کے مفہوم و مراد سے واقف ہیں، ہم اپنی طرف سے ان کی کوئی تاویل و تفسیر نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے اذہان و عقول ناقص ہیں، اگر ہم اپنی عقل و رائے سے کوئی تاویل و تفسیر کرتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ وہ مرادِ حق کے خلاف ہو اس لئے سکوت و تسلیم ہی احوط ہے، یہ طریقِ طریقِ اسلم کہلاتا ہے۔

حضراتِ سلف صالحین نے اسی مسلکِ تفویض کو اختیار کیا ہے جیسے امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام احمد، امام شافعی، محمد بن حسن، سعد بن معاذ مروزی، عبد اللہ بن مبارک، ابو معاذ خالد بن سلیمان، سفیان ثوری، اسحاق بن راہویہ، محمد بن اسماعیل بخاری، ابو عیسیٰ ترمذی، ابو داؤد سجستانی، قاضی ابو العلاء رحمہم اللہ تعالیٰ۔ صاعد بن محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتاب الاعتقاد میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "لا ینبغی

لاحد أن ينطق في الله تعالىٰ بشيء من ذاته، ولكن يصفه بماوصف سبحانه به نفسه، ولايقول فيه برايه شيئا، تبارك الله رب العالمين."

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ اہل قرون ثلاثہ کا اس پر اتفاق ہے جن کے خیر القرون ہونے کی صاحب شریعت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے شہادت دی ہے، امام الحرمین شیخ ابو المعالی عبد الملک بن عبد اللہ الجوینی رحمہ اللہ نے اپنے رسالۂ نظامیہ میں اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔

امام ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب میں جو اختلاف المضلین و مقالات الاسلامیین کے موضوع پر تصنیف کی ہے اسی کو اختیار کیا ہے اور اپنی کتاب "الابانہ فی اصول الدیانہ" میں اسی کو اختیار کرتے ہیں، قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ بھی "طوالع" میں فرماتے ہیں کہ آیاتِ متشابہات میں اول و بہتر سلف صالحین کی اتباع کرنا ہے اور اللہ کو تشبیہ و تجسیم سے منزہ مانتے ہوئے ان آیات کا علم حق تعالیٰ کے سپرد کر دینا ہے، محققین صوفیاء کرام بھی مسلکِ تفویض ہی کے قائل ہیں۔

دوسرا مسلک مسلکِ تاویل ہے، تاویل کا مطلب یہ ہے کہ ان الفاظ متشابہات کے ایسے معانی و مفاہیم بیان کئے جائیں جو حق تعالیٰ کی شان کے مناسب ہوں جن سے تشبیہ و تجسیم لازم نہ آئے، یہ مسلک حضرات متاخرین نے اختیار کیا ہے، امام الحرمین رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب "الارشاد" میں مسلک تاویل ہی کی طرف مائل ہیں، حق تعالیٰ نے ان حضرات کے قلوب پر الفاظ متشابہات کے ایسے معانی و مفاہیم منکشف فرمائے ہیں جو حق تعالیٰ کی شان جلالت کے مناسب اور تشبیہ و تجسیم سے بالکل منزہ و مقدس ہیں، یہ طریق طریقِ احکم کہلاتا ہے، چنانچہ یہ حضرات ان مذکورہ آیات متشابہات میں مندرجہ ذیل تاویلات کرتے ہیں۔

پہلی پانچ آیات میں "وجہ" سے مراد ذات ہے، چنانچہ محاورہ میں وجہ بول کر ذات کو مراد لیا جاتا ہے جیسے کوئی شخص کسی پر غصہ ہوتے ہوئے کہتا ہے تو آج سے مجھ کو

اپنا چہرہ مت دکھانا، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھ سے دور اور پوشیدہ ہو جا، میرے قریب بالکل نہ آنا۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ چہرہ پر نقاب ڈال کر میرے پاس آجایا کرنا، چہرے کے علاوہ باقی اعضاء مجھ کو دکھا دینا، صرف چہرہ مت دکھانا۔ بلکہ چہرہ اور صورت بول کر پوری ذات مراد ہوا کرتی ہے، پس آیات میں بھی وجہ سے مراد ذات ہے۔ فثم وجه الله أى ذات الله، يريدون وجه الله أى ذات الله، و يبقى وجه ربك أى ذات ربك وغيره.

اور آیت نمبر ۶ تا ۱۱ میں ید اور یمین سے مراد قوت و نصرت ہے ید الله فوق ایدیهم ای قوة الله ونصرة الله فوق قوتهم ونصرتهم اور مطویات بیمینه میں یمین سے مراد قدرت ہے کہ آسمان حق تعالیٰ کی قدرت سے لپٹے ہوں گے اور یداه مبسوطتان میں بسطِ یدین سے مراد سخاوت ہے، سخی آدمی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ یا ید سے مراد نعمت ہے کہ اللہ کی دونوں نعمتیں نعم دنیویہ و نعم اخرویہ یا نعم ظاہرہ و باطنہ وسیع اور پھیلی ہوئی ہیں۔

اور آیت نمبر ۱۲ تا ۱۵ میں یأتی ربك اور جاء ربك میں مضاف محذوف ہے یأتی امر ربك اور جاء امر ربك، اور قدمنا الی ماعملوا میں قدوم سے مراد قصد و ارادہ ہے ای عمدنا وقصدنا الی ماعملوا من عمل. حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی تفسیر منقول ہے، ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے مجاہد سے یہی معنی نقل کیے ہیں۔

اور آیت نمبر ۱۶ تا ۱۹ میں استواء سے مراد استیلاء اور غلبہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ عرش پر غالب و مستولی ہیں، یا استواء کنایہ ہے مِلک سے جیسا کہ علامہ زمخشری نے یہی معنی کیے ہیں کہ حق تعالیٰ عرش کے مالک ہیں، ملکیت کو جلوس و استواء سے تعبیر کر دیا جاتا ہے کہا جاتا ہے فلان استوی علی العرش کہ فلاں شخص شاہی تخت پر بیٹھا ہے، آج کل وزارت کی کرسی پر فلاں شخص بیٹھا ہے۔ ان جملوں سے مراد یہ ہوتی

ہے کہ شاہی تخت کا مالک اور کرسیٔ وزارت کا مالک آج کل فلاں شخص ہے، حقیقۃً جلوس واستواء مراد نہیں ہوتا کیونکہ یہ جملہ ''کہ وزارت کی کرسی پر فلاں شخص بیٹھا ہے'' اس وقت بھی کہا جاتا ہے جب کہ وزیر کرسی پر نہ بیٹھا ہو بلکہ کسی ضرورت سے باہر سفر پر گیا ہوا ہو، معلوم ہوا کہ جلوس واستواء سے مراد بیٹھنا نہیں بلکہ مالک ہونا ہے کہ حق تعالیٰ عرش کے مالک ہیں، یا استوی کے معنی علا علی العرش لئے جائیں کہ حق تعالیٰ عرش پر بلند ہیں۔

بہر حال ان تاویلات و معانی کے بعد حق تعالیٰ کے لئے جسمیت و اعضاء و جوارح اور مشابہت و مماثلت بالمخلوق کا ہونا لازم نہیں آئے گا اور ان آیات اور اخیر کی آیت لیس کمثلہ شیء میں کوئی تعارض نہیں رہے گا۔ (روح المعانی وغیرہ)

مرتکب کبیرہ مؤمن ہے یا کافر؟

پارہ نمبر: ۲، ۶، ۱۸، ۲۱، ۲۶، ۲۸

① ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ﴾

(پارہ:۲ رکوع:۶ سورۃ بقرہ جلالین ص:۲۵)

② ﴿ وَإِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ﴾

(پارہ:۲۶ رکوع:۱۳ سورۃ حجرات جلالین ص:۴۲۷)

③ ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا تُوْبُوْا إِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ﴾

(پارہ:۲۸ رکوع:۲۰ سورۃ تحریم جلالین ص:۴۶۶) ✦

④ ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ ﴾

(پارہ:۶ رکوع:۱۱ سورۃ مائدۃ جلالین ص۱۰۱)

⑤ ﴿ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ﴾

(پارہ:۱۸ رکوع:۱۳ سورۃ نور جلالین ص:۳۰۱)

⑥ ﴿ أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ﴾

(پارہ:۲۱ رکوع:۱۵ سورۃ سجدۃ جلالین ص:۳۵۰)

تشریح تعارض

پہلی تین آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتکب کبیرہ مؤمن رہتا ہے، ایمان سے خارج نہیں ہوتا کیونکہ آیت نمبر ا میں حق تعالیٰ نے فرمایا اے ایمان والو! تم پر مقتولین کے بارے میں قصاص فرض کیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی کسی کو قتل کر دے تو قاتل کو قصاصاً قتل کیا جائے۔ اور قتل کرنا گناہ کبیرہ ہے، اس کے باوجود حق تعالیٰ نے: یا

ایھا الذین آمنوا کے ساتھ خطاب کیا ہے، معلوم ہوا کہ گناہ کبیرہ کرنے سے آدمی ایمان کے ساتھ متصف رہتا ہے کافر نہیں ہوتا، اسی طرح آیت نمبر ۲ میں آپس میں قتل وقتال کرنے والی جماعتوں کو مؤمنین سے تعبیر کیا ہے اور آیت نمبر ۳ میں توبہ کا حکم دیا ہے اور توبہ کا مخاطب مرتکبِ کبیرہ ہے، اس کے باوجود یا أیھا الذین اٰمنوا کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، ان تمام آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرتکبِ کبیرہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا اور اخیر کی تین آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتکب کبیرہ کافر ہوجاتا ہے کیونکہ آیت نمبر ۴ میں ارشاد ہے کہ جو لوگ اللہ کے نازل شدہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہ لوگ کافر ہیں اور خلافِ شریعت فیصلہ کرنا گناہ کبیرہ ہے، اس کے مرتکب کو حق تعالیٰ نے کافر بتایا ہے، اسی طرح آیت نمبر ۵ میں فرمایا کہ ”جو اس کے بعد کفر کریں وہی لوگ فاسق ہیں“، کفر کرنے والے کو فاسق بتایا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق اور کافر دونوں ایک ہیں، بلکہ مبتداء وخبر کے درمیان ضمیر فصل لاکر حصر کیا گیا ہے کہ کافر ہی فاسق ہے، کافر کے علاوہ کوئی فاسق نہیں، معلوم ہوا کہ ہر فاسق کافر ہے اور فاسق مرتکب کبیرہ ہوتا ہے، پس لازم آیا کہ ہر مرتکب کبیرہ کافر ہے، ایسے ہی آیت نمبر ۶ میں فرمایا ”کیا وہ شخص جو مؤمن ہو وہ فاسق کی طرح ہوسکتا ہے؟“ یہ استفہام انکاری ہے یعنی مؤمن و فاسق دونوں برابر نہیں ہیں بلکہ دونوں میں مغایرت ہے، جو مؤمن ہے وہ فاسق نہیں، جو فاسق ہے وہ مؤمن نہیں، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فاسق مؤمن نہیں رہتا بلکہ کافر ہوجاتا ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ پہلی تین آیتوں سے معلوم ہوا کہ مرتکب کبیرہ مؤمن ہے، کافر نہیں اور اخیر کی تین آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ مرتکب کبیرہ کافر ہے، مؤمن نہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اصل بات تو وہی ہے جو پہلی تین آیتوں میں مذکور

ہے کہ مرتکب کبیرہ مؤمن رہتا ہے اور اخیر کی تین آیات جو مرتکب کبیرہ کے کافر ہونے پر دال ہیں یہ اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہیں بلکہ ان میں تاویل کی جائے گی جس سے ان آیات میں تطبیق پیدا ہو جائے اور تعارض ختم ہو جائے، چنانچہ آیت نمبر ۴ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ میں چند تاویلات کی گئی ہیں:

① حکم کا اطلاق اگرچہ عملِ قلبی اور عمل جوارح دونوں پر ہوتا ہے مگر یہاں عمل قلبی مراد ہے جس کو تصدیق کہا جاتا ہے اور ومن لم یحکم الخ کے معنی و من لم یصدِّق بما انزل اللّٰہ ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ کی طرف سے نازل شدہ امور کی تصدیق نہ کرے وہ کافر ہے۔ (روح المعانی)

② من لم یحکم بما انزل اللّٰہ علی سبیل الاستہانۃ مراد ہے کہ جو شخص ما انزل اللہ کی توہین و تحقیر کرتے ہوئے اس کے مطابق حکم نہ لگائے وہ کافر ہے اور ظاہر ہے کہ احکام منزلہ من اللہ کی توہین و تحقیر کرنا کفر ہے۔ (النبراس، وتفسیر ابو السعود)

③ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ میں کلمہ ما نکرہ ہے جو تحت النفی واقع ہے اور نکرہ تحت النفی عموم کا فائدہ دیتا ہے، مطلب یہ ہوگا من لم یحکم بشیء مما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الکافرون "کہ جو شخص اللہ کی طرف سے نازل شدہ امور میں سے کسی شئے کا بھی حکم نہ لگائے وہ کافر ہے" اور ما انزل اللہ میں ایمان و توحید بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جو ایمان و توحید کا بھی حکم نہ لگائے اس کے کافر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ (روح المعانی، والنبراس)

④ یہ آیت خاص کر یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ اللہ کی نازل شدہ آیات میں تحریف کرتے تھے اور تورات کے احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تھے، ان کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ لوگ کافر ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی مروی ہے۔ (خازن و روح المعانی)

اسی طرح آیت نمبر ۵ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ میں

بھی تین تاویلات کی گئی ہیں:

(۱) حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اس آیت میں کفر سے مراد کفرانِ نعمت یعنی ناشکری ہے، وہ کفر مراد نہیں جو ایمان کا مقابل ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو اللہ کی جانب سے عطا ہونے والے اس قدر انعامات کے بعد اس کی ناشکری کریں گے، وہ لوگ فاسق ہیں، آیت کے سباق سے یہی معلوم ہوتا ہے، حق تعالیٰ نے اس آیت میں مؤمنین صالحین سے وعدہ فرمایا ہے کہ ہم تم کو زمین میں حکومت عطا فرمادیں گے جس طرح قبطیوں کو ہلاک کر کے بنی اسرائیل کو مصر و شام پر حکومت عطا فرمائی تھی اور دین اسلام میں قوت عطا فرمائیں گے اور دشمنوں کی طرف سے ہونے والے خوف کو امن وسکون سے بدل دیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں اللہ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں جن پر اللہ کا شکر ادا کرنا ضروری ہے، جو ان نعمتوں کی ناشکری کرے وہ فاسق ہے، مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے ان نعمتوں کی ناشکری کرنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا۔ (روح المعانی، مدارک، خازن، النبراس وغیرہ)

(۲) فسق سے مراد فسق کامل ہے اور فسق کامل کفر کہلاتا ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ مؤمنین میں سے جو شخص ان نعمتوں کے وعدوں کے حصول کے بعد مرتد ہو جائے وہ بہت بڑا فاسق ہے، کامل فی الفسق ہے اور کامل فی الفسق مرتد اور کافر ہوتا ہے۔

(روح المعانی)

(۳) آیت شریفہ میں کافر کا فاسق پر جو حصر کیا گیا ہے کہ کافر ہی فاسق ہے، کافر کے علاوہ کوئی فاسق نہیں ہے، یہ حصر حقیقی نہیں ہے بلکہ حصر ادعائی ہے، یعنی مبالغہ مقصود ہے ورنہ تو کافر کے علاوہ بھی فاسق ہوتے ہیں جیسے مرتکب کبیرہ کہ یہ فاسق ہے کافر نہیں ہے کیونکہ اگر آیت میں حصر حقیقی مراد لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ جو آدمی ایمان کے بعد کفر کرے وہی فاسق ہے، اس سے یہ لازم آئے گا کہ جو ایمان سے پہلے کفر

کرے وہ فاسق نہیں ہے حالانکہ یہ غلط ہے، معلوم ہوا کہ یہ حصر حقیقی نہیں ہے، لہٰذا اس سے ہر فاسق کا کافر ہونا لازم نہیں آئے گا۔ ان تاویلات سے بھی واضح ہو گیا کہ آیت شریفہ سے مرتکب کبیرہ کا کافر ہونا لازم نہیں آتا۔

چھٹی آیت: اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقاً، کی تاویل یہ ہے کہ فاسقاً سے مراد مرتکب کبیرہ نہیں بلکہ کافر ہے یعنی اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ كَافِراً. فاسق سے مراد کافر لینے کا قرینہ ایک تو یہ ہے کہ فاسق مطلق بولا گیا ہے اور المطلق اذا اطلق يراد به الفرد الكامل اور کامل فی الفسق کافر ہوتا ہے لان الكفر اعظم الفسوق، دوسرا قرینہ آیت کا سیاق ہے، چنانچہ آگے ارشاد ہے: وَأَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ كُلَّمَآ أَرَادُوْآ أَنْ يَخْرُجُوْا مِنْهَآ أُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ، اور تکذیب کفر ہے، پس معلوم ہوا کہ فسق سے مراد کفر ہے۔ تیسرا قرینہ یہ ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، دونوں میں کسی بات پر مباحثہ ہو گیا، ولید بن عقبہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: اسكت فانك صبي وانا شيخ، خاموش ہو جاؤ، تم ابھی بچے ہو، میں بڑا آدمی ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اسكت فإنك فاسق، خاموش ہو جا، اس لئے کہ تو فاسق ہے، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: افمن كان مؤمنا كمن كان فاسقاً لا يستوٗن، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فاسق سے مراد کافر ہے، پس اس آیت سے بھی مرتکب کبیرہ کا کافر ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے، لہٰذا ان آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ (خازن، مدارک، النبراس)

رمضان کی راتوں میں، اکل وشرب وجماع بعد النوم حلال ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۲

آیات

① ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾

(پارہ: ۲ رکوع: ۷ سورۂ بقرۃ جلالین ص: ۲۶) ✦

② ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلَى نِسَآئِكُمْ. اِلٰى قَوْلِهٖ. وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (پارہ: ۲ رکوع: ۷ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۲۷)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اور جس کیفیت کے ساتھ امم سابقہ پر روزے فرض تھے، اسی کیفیت کے ساتھ امت محمدیہ پر روزے فرض کئے گئے اور امم سابقہ پر روزوں کی کیفیت یہ تھی کہ رات میں سونے سے قبل تو کھانا، پینا اور جماع کرنا حلال تھا مگر سونے کے بعد اکل وشرب اور جماع حرام ہوجاتا تھا، اگر طلوع فجر سے قبل رات میں آدمی کسی وقت بیدار ہوتا تو اس کے لئے کھانا، پینا، جماع کرنا جائز نہیں تھا، كَمَا كُتِبَ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی کیفیت امت محمدیہ کے روزوں کی ہے کہ رات میں سونے کے بعد اکل وشرب اور جماع حرام ہے اور آیت نمبر ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی رات میں طلوع فجر سے پہلے پہلے اکل وشرب اور جماع حلال ہے، پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیتِ اولیٰ آیتِ ثانیہ سے منسوخ ہے، یعنی ابتداءِ اسلام میں یہی حکم تھا کہ رمضان کی راتوں میں سونے کے بعد اکل و شرب اور جماع کی اجازت نہیں تھی، پھر یہ حکم منسوخ کردیا گیا اور اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلَى نِسَآئِكُمْ، اور كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ الخ کہہ کر طلوعِ فجر سے پہلے پہلے تک اکل وشرب و جماع کی اجازت دیدی گئی جیسا کہ امام احمد وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ولاتعارض بعد النسخ۔ (الروض النضیر)

❷ كَمَا كُتِبَ سے صرف نفسِ وجوب میں تشبیہ مقصود ہے، طریقِ ادا اور تحدیدِ اوقات وغیرہ تمام امور میں تشبیہ مقصود نہیں ہے، آیت اولیٰ کا مطلب صرف یہ ہے کہ امم سابقہ پر بھی روزے فرض کئے گئے، تم پر بھی فرض کردیئے گئے اگرچہ دونوں کے طریق ادا اور کیفیت میں اختلاف ہے کہ ان پر رات میں اکل وشرب و جماع بعد النوم حرام تھا اور تمہارے لئے حلال ہے، اس سے مسلمانوں کی دلجوئی مقصود ہے کہ روزہ کی فرضیت تمہارے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، امم سابقہ پر بھی روزے فرض تھے، روزہ اگرچہ مشقت کی چیز ہے مگر یہ مشقت تم سے پہلے لوگ بھی برداشت کرتے آئے ہیں اور یہ طبعی بات ہے کہ جب مشقت میں بہت سے لوگ مبتلا ہوں تو وہ ہلکی معلوم ہوتی ہے بلکہ تمہارے لئے تو آسانی کردی گئی کہ اکل وشرب و جماع بعد النوم رات میں حلال کردیا گیا، امم سابقہ کے لئے حرام تھا، اس تفسیر کے بعد دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں رہا، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے الفوز الکبیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ (الفوز الکبیر، وروح المعانی وغیرہ)

رمضان کا روزہ ہی رکھنا ضروری ہے یا فدیہ بھی دیا جاسکتا ہے؟

پارہ نمبر: ۲

① ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ﴾
(پارہ: ۲ رکوع: ۷ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۲۶)

② ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (پارہ: ۲ رکوع: ۷ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۲۷)

تشریح تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں مگر روزہ رکھنا نہ چاہیں تو ان کو اجازت ہے کہ وہ ایک روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلا کر فدیہ ادا کریں، یعنی جس کا دل چاہے روزہ رکھے، جس کا جی چاہے روزہ کے بدلہ میں فدیہ ادا کردے اور آیت ثانیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی رمضان کے مہینہ میں موجود ہو اس پر روزہ رکھنا فرض ہے، فدیہ دینے کا اختیار نہیں، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے چھ جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ آیت ثانیہ سے منسوخ ہے، ابتداء میں چونکہ لوگ روزہ رکھنے کے عادی نہیں تھے، روزہ رکھنے میں دشواری ہوتی تھی تو حق تعالیٰ نے آسانی فرمادی تھی اور

صوم وفدیہ میں اختیار دے دیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزہ رکھ لے جو چاہے فدیہ ادا کردے، جب رفتہ رفتہ لوگ عادی ہوگئے تو روزہ رکھنا لازم کردیا گیا اور فدیہ کا اختیار منسوخ فرمادیا، روایت صحیحہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔

﴿عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا نُزِلَتْ هَذِهِ الْاٰيَةُ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ كَانَ مَنْ شَاءَ مِنَّا صَامَ، وَمَنْ شَاءَ اَفْطَرَ، وَيَفْتَدِي، فَعَلَ ذٰلِكَ حَتّٰى نَزَلَ الْاٰيَةُ الَّتِيْ بَعْدَهَا، فَنَسَخَتْهَا فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (رواہ البخاری ومسلم وابوداؤد والترمذی والنسائی والطبرانی وغیرہم، روح المعانی ج:۲ص:۵۸)

ترجمہ: ”حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ الخ نازل ہوئی تو ہم میں سے جو چاہتا روزہ رکھ لیتا اور جو چاہتا افطار کرتا اور جو فدیہ ادا کرنا چاہتا وہ فدیہ ادا کردیتا، یہاں تک کہ اس کے بعد والی آیت: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نازل ہوئی، اس آیت نے پہلی آیت کو منسوخ کردیا۔“

اور ظاہر ہے کہ نسخ کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔

❷ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت نمبر ۱ ایسے مریض کے بارے میں ہے جو بیمار تو ہے مگر اس کی بیماری اس درجہ کی نہیں ہے کہ روزہ کی طاقت نہ ہو بلکہ وہ روزہ رکھ سکتا ہے مگر ضعف ومرض کی وجہ سے روزہ رکھنا ذرا دشوار معلوم ہوتا ہے، اس کو حق تعالیٰ نے ابتداء میں اختیار دیدیا تھا کہ جی چاہے روزہ رکھ لے، جی چاہے روزہ کے بدلہ میں فدیہ ادا کردے، پھر یہ حکم منسوخ فرمادیا کہ رمضان کے مہینہ میں ہر شخص کو روزہ رکھنا ضروری ہے، البتہ مریض کے لئے اتنی سہولت ہے کہ وہ ماہ رمضان میں افطار کرلے، جب تندرست ہوجائے تو روزہ کی قضاء کرلے، روزہ کے بدلہ میں فدیہ

دینا جائز نہیں۔ ولا تعارض بعد النسخ۔ (تفسیر خازن)

❸ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهُ الخ میں لا حرف نفی مقدر ہے ای وعلی الذین لا یطیقونه، حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک قرأت وعلی الذین لا یطیقونه مروی ہے جیسا کہ روح المعانی میں مذکور ہے اور یہ آیت شیخِ فانی کے بارے میں ہے کہ جو لوگ بوڑھے، انتہائی عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ ہر روزہ کے بدلہ میں فدیہ ادا کردیں، اور آیت نمبر۲ جوانوں اور طاقتور بوڑھوں کے متعلق ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں کیونکہ جب دو متعارض چیزوں کا مصداق جدا جدا ہو تو تعارض نہیں رہتا۔

❹ يُطِيْقُوْنَهُ باب افعال سے ہے اور باب افعال کا ہمزہ کبھی سلب ماخذ کے لئے ہوتا ہے جیسے افلس الرجل یعنی اس کے پاس فلوس (پیسے ختم) ہوگئے، وہ شخص مفلس ہوگیا۔ اشکیته میں نے اس کی شکایت کو دور کردیا، ختم کیا، اسی طرح یہاں پر یطیقونه کے معنی یہ ہوں گے کہ جن لوگوں میں روزہ کی طاقت نہیں رہی وہ فدیہ ادا کرسکتے ہیں، لہٰذا لاء نفی مقدر ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، دفع تعارض کی توجیہ اس صورت میں بھی وہی رہے گی جو اوپر گزری کہ یہ آیت شیخِ فانی کے بارے میں ہے اور آیت نمبر۲ غیر شیخ فانی کے بارے میں۔ فلا تعارض۔

❺ ایک توجیہ ایسی کی گئی ہے جس میں نہ حرف نفی مقدر ماننے کی ضرورت ہے اور نہ ہمزۂ افعال کو سلب کے لئے ماننے کی ضرورت، اس کے باوجود یہ آیت شیخ فانی کے بارے میں رہتی ہے، وہ توجیہ یہ ہے کہ لغت عرب اور ان کے طرز کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں شئے پر قادر ہونے کی مختلف تعبیرات ہوتی ہیں اور تعسر و دشواری کی کمی بیشی کے لحاظ سے قدرت کے مختلف درجات ہوتے ہیں، جس کا ادنی درجہ استطاعت اور آخری درجہ اطاقة ہے، لفظ اطاقة اس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں کسی کام کے کرنے میں انتہائی مشقت ہو، چنانچہ یہ نہیں کہا جاتا: انی اطیق ان ارفع

اللقمة الى فمي ''کہ میں اپنے منہ تک لقمہ اٹھانے کی طاقت رکھتا ہوں'' اس لئے کہ لقمہ اٹھانا ایک آسان چیز ہے اس میں کوئی مشقت نہیں، البتہ یہ کہا جاتا ہے: انی اطیق ان احمل هذا الحجر الثقيل ''کہ میں یہ بھاری پتھر اٹھانے کی طاقت رکھتا ہوں۔'' پس آیت شریفہ میں بھی اطاقة کا لفظ آیا ہے اس لئے آیت کے معنی اس صورت میں یہ ہوں گے کہ جو لوگ آسانی سے روزہ نہ رکھ پاتے ہوں بلکہ انتہائی شدت وتعب اور مشقت عظیمہ ہی کے ساتھ رکھ پاتے ہوں جیسے شیخ فانی اور بہت ہی بوڑھی عورت، ان کے لئے جائز ہے کہ وہ ہر روزہ کا فدیہ ادا کریں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت میں متعدد قرأتیں منقول ہیں:

① يُطَوَّقُوْنَهٗ بضم الياء وفتح الطاء والوا والمشددة، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہی قرات ہے،

② يُطَيِّقُوْنَهٗ بضم الياء الاولى وتشديد الياء الثانيه حضرت سعید ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کی یہی قرأت ہے،

③ يُطَّيَّقُوْنَهٗ بتشديدالطاء والياء الثانيه حضرت مجاہد اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہما کی یہی قرأت ہے،

④ يَتَطَوَّقُوْنَهٗ۔ ان کے معانی کسی کام کو مشقت اور تکلف کے ساتھ کر پانا، ان قراءت کے پیش نظر بھی آیت کے معنی یہی ہوں گے کہ جو لوگ روزہ انتہائی مشقت اور شدت کے ساتھ ہی رکھ پاتے ہوں وہ فدیہ ادا کر سکتے ہیں جیسے شیخ فانی اور عجوز کبیرہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد یہی ہے کہ ان الآية نزلت في الشيخ الكبير الهرم والعجوز الكبيرة الهرمة۔

❻ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ''الفوز الکبیر'' میں فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ میں روزہ کی طاقت اور عدم طاقت سے بحث ہی نہیں ہے اور فِدْيَةٌ

طَعَامُ مِسْكِيْنٍ سے مراد روزوں کا فدیہ نہیں ہے بلکہ فدیہ سے مراد صدقۂ فطر ہے اور یطیقونہ کی ضمیر فدیہ کی طرف راجع ہے، ترجمہ یہ ہوگا ''اور جو لوگ (صاحبِ نصاب ہونے کی وجہ سے) صدقۂ فطر دینے پر قادر ہیں ان پر صدقۂ فطر واجب ہے جو ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔'' اس پر دو اشکال ہوتے ہیں ایک یہ کہ اضمار قبل الذکر لازم آ رہا ہے اس کا جواب شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ فدیہ اگرچہ لفظاً موخر ہے مگر ترکیب میں رتبۃً مقدم ہے کیونکہ وعلى الذين يطيقونه خبر مقدم ہے اور فديةٌ طعامُ مسكينٍ مبتداء موخر ہے اور مبتداء کا رتبہ مقدم ہونے کا ہے اور جب مرجع رتبۃً مقدم ہو تو اضمار قبل الذکر صرف لفظاً ہوتا ہے جو کہ جائز ہے۔ دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ فدیہ مونث ہے اور یطیقونہ میں ضمیر مذکر ہے، ضمیر اور مرجع میں تذکیر و تانیث میں مطابقت نہیں رہی، اس کا جواب شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیتے ہیں کہ فدیۃ سے مراد طعام ہے اور طعام مذکر ہے تو فدیہ کو طعام کی تاویل میں لے کر ضمیر مذکر اس کی طرف لوٹا دی گئی، فلا اشکال۔ (الفوز الکبیر)

بہر حال شاہ صاحب کے نزدیک اس آیت شریفہ میں روزہ کی طاقت اور عدم طاقت اور فدیہ ادا کرنے سے کوئی گفتگو نہیں ہے، بلکہ اس میں ایک دوسرا حکم یعنی وجوبِ صدقۂ فطر کو بیان کیا گیا ہے، لہٰذا یہ آیت ''فمن شهد منكم الشهر فليصمهُ'' کے معارض نہیں ہے۔ فافہم۔

قرآن پاک لیلۃ القدر میں نازل ہوا یا لیلۃ البراءۃ میں؟

پارہ نمبر: ۲، ۲۵، ۳۰

① ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾

(پارہ: ۲ رکوع: ۷ سورۂ بقرۃ جلالین ص: ۲۷) ✦

② ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ﴾

(پارہ: ۲۵ رکوع: ۱۴ سورۂ دخان جلالین ص: ۴۱۰) ✦

③ ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۲۲ سورۂ قدر جلالین ص: ۵۰۳)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مقدس ماہِ رمضان میں نازل ہوا ہے اور دوسری آیت میں ہے کہ لیلۂ مبارکہ میں نازل ہوا اور لیلۂ مبارکہ کی تفسیر حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ایک جماعت سے لیلۃ البراءۃ یعنی لیلۃ نصف شعبان کے ساتھ منقول ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک شعبان کی پندرھویں رات میں نازل ہوا اور تیسری آیت میں ہے کہ شب قدر میں نازل ہوا ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ آیت ثانیہ میں لیلۂ مبارکہ سے مراد لیلۃ البراءۃ

نہیں ہے بلکہ لیلۃ القدر ہی مراد ہے، اکثر مفسرین رحمہم اللہ تعالیٰ اسی کے قائل ہیں، روح المعانی میں ہے هي ليلة القدر علی ماروی عن ابن عباس رضی الله تعالٰی عنه وقتادة وابن جبير ومجاهد وابن زيد والحسن وعليه اكثر المفسرين، تفسیرِ مدارک میں ہے (في ليلة مباركة) اي ليلة القدر اوليلة النصف من شعبان وقيل بينها وبين ليلة القدر اربعون ليلة والجمهور على الاول۔ تفسیر کبیر میں ہے "اختلفوا في هذه الليلة المباركة فقال الاكثرون انها ليلة القدر" بیان القرآن میں ہے کہ لیلۃ المبارکۃ کی تفسیر اکثر حضرات نے شب قدر سے کی ہے، معارف القرآن میں ہے کہ لیلۂ مبارکہ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک شب قدر ہے۔ لیلۂ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہونے کے متعدد دلائل ہیں جن کو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیرِ کبیر میں مفصل ذکر کیا ہے:

① سورۂ دخان کی آیت میں انزال قرآن کی رات کو لیلۂ مبارکہ کہا گیا ہے، کوئی تصریح نہیں کی گئی کہ یہ لیلۃ القدر ہے یا لیلۃ البراءۃ اور سورۂ قدر کی آیت میں تصریح ہے کہ "اِنَّآ اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ" والقرآن يفسر بعضه بعضاً، پس معلوم ہوا کہ لیلۃ البراءۃ سے مراد لیلۃ القدر ہے۔

② سورۂ دخان میں تو فرمایا کہ ہم نے قرآن لیلۂ مبارکہ میں نازل کیا اور سورہ بقرہ میں ہے کہ شہر رمضان میں نازل کیا، اس سے معلوم ہوا کہ لیلۂ مبارکہ ماہ رمضان میں واقع ہوتی ہے اور رمضان میں واقع ہونے والی لیلۃ القدر ہے نہ کہ لیلۃ البراءۃ، کیونکہ وہ تو شعبان میں ہوتی ہے، پس معلوم ہوا کہ لیلۂ مبارکہ شبِ قدر ہے۔

③ سورۂ قدر میں لیلۃ القدر کی جو صفات مذکور ہیں وہ موافق و متقارب ہیں ان صفات کے جو لیلۂ مبارکہ کی سورۂ دخان میں ذکر کی گئی ہیں، چنانچہ سورۂ قدر میں ہے: "تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ" کہ اس رات میں فرشتے اور روح القدس اپنے رب کے حکم سے ہر امر کو لے کر اترتے ہیں اور سورۂ دخان میں ہے:

"فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ" "اس رات میں ہر معاملے کو طے کر دیا جاتا ہے، ان دونوں باتوں کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے، سورۂ قدر میں ہے بِإِذْنِ رَبِّهِمْ، سورۂ دخان میں ہے أَمْرًا مِنْ عِنْدِنَا ان دونوں کا مفہوم متحد، سورۂ قدر میں ہے سلام هي سورۂ دخان میں ہے رحمة من ربك، ان دونوں (سلامتی و رحمت) کا مفہوم قریب قریب ہے، جب دونوں مقام پر بیان کردہ صفات متقارب ہیں تو لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لیلۂ مبارکہ اور لیلۃ القدر دونوں ایک ہیں۔

④ محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں حضرت قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے:

نزلت صحف ابراهيم في اول ليلة من رمضان، والتوراة لست ليال منه والزبور لاثنتي عشر ليلة مضت منه، والانجيل لثمان عشر ليلة مضت منه والقرآن لاربع وعشرين ليلة مضت من رمضان، والليلة المباركة هي ليلة القدر. (تفسیر کبیر)

"حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کے صحیفے رمضان کی پہلی شب میں نازل ہوئے اور تورات رمضان کی چھٹی شب میں، زبور بارہویں شب میں اور انجیل اٹھارویں شب میں اور قرآن پاک رمضان کی چوبیسویں شب میں نازل ہوا اور لیلۂ مبارکہ لیلۃ القدر ہی ہے۔" تفسیر قرطبی میں یہ روایت حضرت واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے۔

⑤ سورۂ دخان میں ہے فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ "اس رات میں ہر معاملہ کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔" اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ لیلۃ القدر میں ہوتا ہے، پس معلوم ہوا کہ لیلۂ مبارکہ لیلۃ القدر ہے۔

عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنه انه قال في ذٰلك يكتب من امّ الكتاب في ليلة القدر مايكون في السنة من رزق اوموت اوحياة

او مطر حتی یکتب الحاج یحج فلان ویحج فلان. اخرجه محمد بن نصروا بن المنذر وابن ابی حاتم. (روح المعانی)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس بارے میں فرمایا کہ شب قدر میں لوحِ محفوظ سے نقل کر کے وہ تمام امور لکھ دیئے جاتے ہیں جو پورے سال میں پیش آنے والے ہیں یعنی رزق، موت، حیات، بارش، یہاں تک کہ یہ بھی لکھ دیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں اس سال حج کرے گا۔''

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی مروی ہے:

﴿عن ربیعة بن کلثوم قال: کنت عندالحسن، فقال له رجل: یا ابا سعید، لیلة القدر فی کل رمضان هی؟ قال: ای واللّٰه: انها لفی کل رمضان! وانها للیلة یفرق فیها کل امر حکیم، فیها یقضی اللّٰه تعالٰی کل اجل و عمل ورزق الی مثلها. اخرجه عبد بن حمید وابن جریر.﴾ (روح المعانی)

ترجمہ: ''ربیعہ بن کلثوم رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میں حضرت حسن رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس تھا، ایک شخص نے ان سے دریافت کیا کہ اے ابو سعید! لیلۃ القدر ہر رمضان میں ہوتی ہے؟ فرمایا خدا کی قسم، وہ ہر رمضان میں ہوتی ہے اور یہی وہ رات ہے جس میں ہر معاملہ طے کر دیا جاتا ہے، اس رات میں حق تعالیٰ اس جیسی آئندہ رات تک ہونے والے تمام امور (موت، عمل، رزق) کے فیصلے فرما دیتے ہیں۔''

ان دلائلِ خمسہ مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ لیلہ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہے۔

رہا حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا قول کہ لیلہ مبارکہ سے مراد لیلۃ البراءۃ ہے سو اس کو علماء نے غیر معتبر قرار دیا ہے، امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں:

﴿واما القائلون بانّ المراد من الیلة المبارکة المذکورة فی

هذه الآية هي ليلة النصف من شعبان فما رأيت لهم فيه دليلاً يعول عليه.﴾

ترجمہ: ''جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ لیلۂ مبارکہ مذکورہ فی الآیۃ سے مراد نصف شعبان کی رات ہے میں نے اس بارے میں ان حضرات کی کوئی معتبر دلیل نہیں دیکھی۔''

تفسیر مظہری میں ہے:

﴿وما قيل انها ليلة النصف من شعبان فليس بشيء.﴾

حاشیہ جمل علی تفسیر الجلالین میں ہے:

﴿قوله اوليلة النصف من شعبان قال النووي رحمة الله عليه في باب صوم التطوع من شرح مسلم انه اخطاوالصواب وبه قال العلماء انها ليلة القدر.﴾

بیان القرآن میں ہے کہ یہ تفسیر صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

دراصل ان حضرات نے لیلۂ مبارکہ کی تفسیر لیلۃ القدر کے ساتھ اس روایت کے پیش نظر کردی ہے جس میں معاملات کا فیصلہ ہونا لیلۃ البراء ۃ میں مذکور ہے، تفسیر ابنِ کثیر اور روح المعانی میں عثمان بن محمد بن الاخفش رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت ہے:

﴿ان رسول اللّٰه صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وآله وسلم قال: "تقطع الآجال من شعبان الى شعبان حتى ان الرجل لينكح، ويولد له، وقد اخرج اسمه في الموتى.﴾

ترجمہ: ''کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک شعبان سے دوسرے شعبان تک تمام آجال کا فیصلہ کردیا جاتا ہے یہاں تک کہ یہ بھی کہ فلاں شخص نکاح کرے گا اس کے بچہ پیدا ہوگا حالانکہ اس کا نام مردوں میں لکھ دیا گیا۔''

مگر اس روایت کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے جو نصوص کے مقابلہ میں قابل اعتماد نہیں ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے:

﴿فهو حديث مرسل ومثله لا يعارض به النصوص﴾

معارف القرآن میں ہے کہ قاضی ابوبکر بن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نصف شعبان کی رات کے بارے میں کوئی قابل اعتماد روایت ایسی نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ رزق اور موت وحیات کے فیصلے اس رات میں ہوتے ہیں۔

پھر اس حدیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ البراءۃ میں فیصلے ہوتے ہیں، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن میں جو لیلۂ مبارکہ فرمایا گیا ہے اس سے مراد لیلۃ البراءۃ ہی ہے کسی آیت و روایت میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ نزول قرآن لیلۃ البراءۃ میں ہوا ہے، جب کہ لیلۃ القدر اور ماہِ رمضان میں نازل ہونا قرآن پاک میں مصرح ہے، البتہ سالانہ معاملات کے فیصلوں کے متعلق روایات میں تعارض ہے کہ لیلۃ القدر میں ہوتے ہیں یا لیلۃ البراءۃ میں، جیسا کہ اوپر دونوں قسم کی روایات مذکور ہوئی ہیں، ان میں تطبیق یہ ہے کہ سالانہ واقعات کے کاغذات لیلۃ البراءۃ میں لوحِ محفوظ سے نقل کر کے لکھنے شروع کر دیئے جاتے ہیں اور لیلۃ القدر میں فراغت ہو جاتی ہے، اس رات میں وہ کاغذات ملائکہ کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں، ارزاق کا رقعہ حضرت میکائیل علیہ الصلاۃ والسلام کے حوالہ کر دیا جاتا ہے اور لڑائیوں، زلزلوں اور بجلیوں وغیرہ کا رقعہ حضرت جبرئیل علیہ الصلاۃ والسلام کے حوالہ کر دیا جاتا ہے اور اعمال کا پرچہ حضرت اسماعیل علیہ الصلاۃ والسلام (جو کہ آسمانی دنیا پر ایک بڑے فرشتے ہیں) کے سپرد کر دیا جاتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ تطبیق مروی ہے۔

﴿قال: تقضى الاقضية كلها ليلة النصف من شهر شعبان، وتسلم الى اربابها ليلة السابع والعشرين من شهر رمضان.﴾

(روح المعانی)

ترجمہ: ''فرمایا کہ تمام فیصلے نصف شعبان کی شب میں کر دیئے جاتے ہیں اور ان امور کو رمضان کی ستائیسویں شب میں ان کے ذمہ دار فرشتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔''

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بیان القرآن میں فرماتے ہیں کہ لیلۂ مبارکہ کی تفسیر اکثر حضرات نے شب قدر سے کی ہے اور بعض نے اس کی تفسیر لیلۃ البراءۃ سے اس بنا پر کی ہے کہ روایات میں اس کی نسبت بھی واقعات سالانہ کا فیصلہ ہونا آیا ہے لیکن چونکہ کسی روایت میں اس میں قرآن کا نزول وارد نہیں ہے اور شبِ قدر میں نزول خود قرآن میں مذکور ہے: اِنَّآ اَنزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔ اس لئے یہ تفسیر صحیح نہیں معلوم ہوتی، اور واقعات کا فیصل ہونا اس شب میں اس کو مستلزم نہیں ہے کہ قرآن میں جو لیلۂ مبارکہ آیا ہے اس سے مراد یہی ہو، غایت مافی الباب اس کا قائل ہونا پڑے گا کہ دونوں شب میں واقعات فیصل ہوتے ہیں تو یہ کچھ بعید نہیں بلکہ ممکن ہے کہ واقعات لکھ تو لئے جاتے ہوں شب براءت میں اور سپرد کئے جاتے ہوں شب قدر میں۔

(بیان القرآن)

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ لیلۂ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہے پس آیتِ ثانیہ اور ثالثہ میں تعارض ختم ہوگیا، رہی آیت اولیٰ: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ۔ سو یہ بھی ان آیتوں کے معارض نہیں ہے اس لئے کہ روایتِ مرفوعہ صحیحہ سے یہ بات ثابت ہے کہ لیلۃ القدر ماہِ رمضان میں ہوتی ہے:

﴿عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ: ''تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ''﴾

(رواہ البخاری ومسلم واحمد والترمذی، روح المعانی)

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شب قدر کو ماہ رمضان کے عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔“

اور بھی بہت سی روایاتِ صحیحہ اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہوتی ہے، اکثر حضرات اسی کے قائل ہیں، اسی کو صحیح کہا گیا ہے، صرف حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ لیلۃ القدر نصف شعبان کی شب ہے مگر اس قول کے متعلق روح المعانی میں ہے وهو قول شاذ غريب كما فی تحفة المحتاج۔

بہرحال یہ ثابت ہوگیا کہ لیلۃ القدر ماہ رمضان میں ہوتی ہے، اس لئے آیت اولیٰ بھی دوسری دونوں آیتوں کے معارض نہیں رہی۔ فحصل التطبيق بين الآيات وارتفع التعارض فلله الحمد، فافهم واحفظ۔

ابتداء بالقتال مع الکفار جائز ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۲، ۵، ۱۰

آیات

① ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ (پارہ: ۲ رکوع: ۸ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۲۸) ✦

② ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ﴾ (پارہ: ۲ رکوع: ۸ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۲۸)

③ ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا﴾ (پارہ: ۵ رکوع: ۹ سورۂ نساء جلالین ص: ۸۳)

④ ﴿فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِيْنًا﴾ (پارہ: ۵ رکوع: ۹ سورۂ نساء جلالین ص: ۸۳)

⑤ ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ (پارہ: ۱۰ رکوع: ۷ سورۂ توبہ جلالین ص: ۱۵۵)

⑥ ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً﴾ (پارہ: ۱۰ رکوع: ۱۱ سورۂ توبہ جلالین ص: ۱۵۸)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ میں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے راستہ میں انہیں لوگوں سے قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں، ان پر زیادتی نہ کرو یعنی قتال کرنے میں ابتداء اور پہل نہ کرو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین جہاں بھی ملیں ایک دم ان سے قتال کی ابتداء نہ کرنی چاہیے، ہاں اگر وہ قتال کریں تو جواباً ان سے قتال کیا جائے گا اور اخیر کی پانچوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کردو، خواہ وہ قتال کریں یا نہ کریں۔ یعنی

ابتداء بالقتال کا حکم دیا گیا ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

(۱) آیتِ اولیٰ بعد کی پانچوں آیات سے، منسوخ ہے یعنی ابتداءِ اسلام میں ابتداء بالقتال سے منع کیا گیا کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی، اسلام کا ابھی غلبہ نہیں ہوا تھا اس لئے نرمی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا، جب اسلام کو قوت و غلبہ حاصل ہو گیا، مسلمانوں کی تعداد کثیر ہوگئی اور معجزاتِ رسالت وقتاً فوقتاً بار بار ظاہر ہونے کے باوجود بھی مشرکین اپنے شرک پر جمے رہے، ان سے اسلام کی ناامیدی ہوگئی تو حق تعالیٰ نے علی الاطلاق قتال کا حکم دے دیا "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ" اور "قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً." چنانچہ حضرت ربیعہ بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قَاتِلُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ قتال کے سلسلہ میں سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت ہے جس میں قتال کی ابتداء کرنے سے منع کیا گیا، پھر حق تعالیٰ نے "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً" اور "وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ" فرما کر تمام مشرکین سے مطلق قتال کا حکم فرما دیا خواہ وہ قتال کریں یا نہ کریں (یعنی ابتداء بالقتال کی اجازت دیدی) پس آیتِ سیف: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً، اور وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ۔ اس آیت (یعنی آیت نمبر ۱) کے لئے ناسخ ہے۔

(جلالین، خازن، تفسیر کبیر، تفسیر مظہری)

(۲) آیت اولیٰ میں ابتداء بالقتال کرنے یا نہ کرنے سے کوئی بحث نہیں ہے بلکہ اس آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ تم لوگ صرف ان کفار سے قتال کرو جو تمہارے مقابلہ میں قتال کے لئے آسکتے ہیں جن کی طرف سے قتال کی توقع ہے، یعنی عورتوں، بچوں اور زیادہ بوڑھوں اور پادریوں و راہبوں کو جو دنیا سے یکسو ہو کر عبادت میں مشغول رہتے

ہیں، اسی طرح اپاہجوں، معذوروں اور کفار کے یہاں مزدوری اور نوکری کرنے والوں کو جو قتال میں شریک نہیں ہوتے ہیں ان کو جہاد میں قتل نہ کرو اس لئے کہ یہ لوگ قتال میں مقابلہ پر آنے والے نہیں ہیں، اس صورت میں وَلَا تَعْتَدُوْا کا مطلب یہ ہوگا: وَلَا تَعْتَدُوْا بِقَتْلِ الصِّبْيَانِ وَالنِّسَاءِ وَالشُّيُوْخِ الْكِبَارِ وَ الرُّهْبَان وَغَيْرِهِمْ مِنَ الَّذِيْنَ لَمْ يُشَارِكُوْا فِي الْقِتَالِ، اس وقت یہ آیت منسوخ نہیں ہوگی بلکہ محکم رہے گی، وهو قول ابن عباس رضى الله تعالىٰ عنه و مجاهد رحمة الله عليه۔ (مظہری وقرطبی وغیرہ)

اور اخیر کی آیات میں جن مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان سے مراد بھی مشرکین مقاتلین ہیں وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ میں "هُمْ" ضمیر الذين يقاتلونكم کی طرف راجع ہے اور قَاتِلُوْا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً میں الف لام عہدی ہے، مراد مشرکین مقاتلین ہیں، یعنی نوجوان اور طاقتور لڑنے والے کفار کو جہاں پاؤ قتل کر ڈالو اور تمام مشرکین مقاتلین سے قتال کرو، پس ان آیات میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ اس تقریر کے بعد ان تمام آیات کا مضمون و مفہوم متحد ہو چکا ہے۔

اشہرِ حرم میں قتال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۲، ۶، ۱۰

آیات

① ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ﴾

(پارہ: ۲ رکوع: ۱۱ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۳۲)

② ﴿يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ﴾

(پارہ: ۶ رکوع: ۵ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۹۴) ✦

③ ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً﴾

(پارہ: ۱۰ رکوع: ۱۱ سورۂ توبہ جلالین ص: ۱۵۸)

تشریح تعارض

پہلی دو آیتوں سے اشہر حرم (شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ، رجب) میں قتال کرنے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے کیونکہ آیت نمبر ا میں ارشاد ہے قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ اشہر حرم میں قتال کرنا گناہِ کبیرہ ہے، اور آیت نمبر ۲ میں فرمایا کہ اللہ کی نشانیوں اور شہر حرام کی بے حرمتی نہ کرو اور شہر حرام میں جب قتال کرنے سے منع کر دیا گیا ہے تو اس میں قتال کرنا اس کی بے حرمتی کرنا ہے، پس مطلب اس آیت کا یہ ہوا کہ شہر حرام میں قتال کر کے اس کی بے حرمتی نہ کرو۔ اور آیت نمبر ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کرنا ممنوع نہیں ہے کیونکہ اس میں ارشاد ہے کہ تمام مشرکین سے قتال کرو جیسا کہ وہ تم سب سے قتال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین سے ہر زمانہ ہر مہینہ میں قتال کر سکتے ہو جیسا کہ وہ ہر مہینہ میں تم سے قتال کر لیتے ہیں، خواہ اشہر حرم ہوں یا غیر

اشہر حرم۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے جلالین میں اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے:
"قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً اَیْ جَمِيْعًا فِیْ جَمِيْعِ الشُّهُوْرِ كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً" اور یہ تفسیر ایک قاعدہ کے تحت کی گئی ہے، قاعدہ یہ ہے کہ عمومِ اشخاص مستلزم ہوتا ہے عمومِ احوال، عمومِ ازمان، عمومِ امکنہ کو، تو جب اس آیت میں تمام مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا ہے تو اس کا مطلب قاعدۂ مذکورہ کے پیش نظر یہ ہوگا: اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ جَمِيْعًا فِیْ اَیِّ حَالٍ فِیْ اَیِّ زَمَانٍ وَفِیْ اَیِّ مَكَانٍ "کہ جس حال میں، جس زمانہ میں، جس جگہ پاؤ قتال کرو۔" (جمل)

بہر حال خلاصہ یہ ہوا کہ پہلی دو آیتوں میں اشہر حرم میں قتال کی ممانعت اور تیسری آیت میں اجازت ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ پہلی دونوں آیتیں تیسری آیت سے منسوخ ہیں، یعنی ابتداء اشہر حرم میں قتال کرنا ممنوع تھا، بعد میں وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً نازل فرما کر ممانعت منسوخ کردی گئی اور اشہر حرم و غیر حرم تمام مہینوں میں قتال کی اجازت دے دی گئی، اب کسی بھی مہینہ میں قتال کرنا حرام نہیں ہے، حضرت عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے، بلکہ جمہور فقہاء نسخ ہی کے قائل ہیں۔ صاحب روح المعانی اور قاضی بیضاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اشہرِ حرم میں قتال کی حرمت کے منسوخ ہونے پر اجماع نقل کیا ہے، البتہ ناسخ کی تعیین میں اختلاف ہے، بعض نے تو قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً۔ کو ناسخ مانا ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے اور بعض نے فَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ کو ناسخ مانا ہے بایں طور کہ لفظ "حیث" کو زمانہ کے معنی میں لیا

ہے کہ مشرکین کو جس زمانہ میں پاؤ قتل کردو، بہر حال نسخ کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا کمامر غیر مرۃ۔ (مظہری وخازن وروح المعانی وغیرہ)

❷ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلی دو آیتوں سے اشہر حرم میں قتال کی ممانعت پر دلالت ہی نہیں ہے بلکہ یہ آیات تو اس کے جواز پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ پوری آیت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے، پوری آیت اس طرح ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ، قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَاللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ.

مطلب یہ ہے کہ شہر حرام میں قتال کرنا اگرچہ گناہ کی بات ہے لیکن لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکنا اور اسلام سے انکار کرنا اور مسجدِ حرام کی زیارت سے لوگوں کو روکنا اور اہلِ مکہ کو مکہ سے نکالنا یہ سب امور شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی زیادہ گناہ ہیں اور کفار برابر یہ حرکات کرتے رہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ شہر حرام میں بلا وجہ اور ناحق لڑنا بے شک اشد گناہ ہے مگر جو لوگ کہ حرم میں بھی کفر پھیلائیں اور بڑے بڑے فساد کریں ان سے لڑنا منع نہیں ہے بلکہ ان کی حرکات کی روک تھام کے لئے مقاتلہ جائز ہے کیونکہ اخف کے مقابلہ میں اشد کی مدافعت ضروری ہے۔

جب پہلی دو آیتوں سے قتال فی الشہر الحرام کی ممانعت ثابت ہی نہیں ہوتی تو تیسری آیت کے ساتھ ان کا کوئی تعارض نہیں رہا۔ (الفوز الکبیر وشرح الروض النضیر)

❸ تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ محکم ہے، حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ تعالیٰ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ قتال فی الشہر الحرام کی حرمت ہمیشہ کے لئے باقی ہے۔ اور بھی متعدد حضرات تابعین اس حکم کو ثابت اور غیر منسوخ مانتے ہیں، البتہ اس آیت میں قتال فی الشہر الحرام کو جو ممنوع قرار دیا گیا ہے

اس سے مراد ابتداءِ قتال ہے کہ اشہر حرم میں ابتداء بالقتال کرنا حرام ہے اور آیتِ ثالثہ میں قتال فی الاشہر الحرم کی جو اجازت ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اگر مشرکین اشہر حرم میں قتال کی ابتداء کریں تو جوابی کاروائی کرتے ہوئے تمہارے لئے بھی اشہر حرم میں قتال کرنا جائز ہے، اسی لئے فرمایا: كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً۔ کہ جس طرح یہ مشرکین تم سے ہر مہینہ میں قتال کر لیتے ہیں اشہر حرم کی پرواہ نہیں کرتے تم بھی جوابی کاروائی کرتے ہوئے اشہر حرم میں ان سے قتال کرلو جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے "الشهر الحرام بالشهر الحرام" شہرِ حرام شہرِ حرام کے عوض میں ہے، اگر وہ لوگ اس مہینہ کی حرمت کا خیال رکھیں اور قتال نہ کریں تو تم بھی اس کی حرمت کی رعایت کرو اور قتال نہ کرو اور اگر وہ لوگ اس ماہ کی رعایت نہ کرتے ہوئے تم سے اس ماہ میں قتال کریں تو تم بھی جواباً اس ماہ میں ان سے قتال کرو کیونکہ "الحرمات قصاص" حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں، جانبین سے اس کی رعایت ضروری ہے، وہ رعایت کرتے ہیں تم بھی کرو وہ رعایت نہ کریں تم بھی نہ کرو۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ابتداء قتال کرنا تو اشہر حرم میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے كما فى الآيتين الاوليين، البتہ ان کی طرف سے ابتداء کے بعد مدافعانہ قتال کرنا مسلمانوں کے لئے اشہر حرم میں جائز ہے كما فى الآية الثالثة، پس ان آیات میں کوئی تعارض نہیں رہا۔ (معارف القرآن)

عدتِ وفات چار ماہ دس دن ہے یا ایک سال؟

پارہ نمبر:۲

آیات

① ﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجاً يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ (پارہ:۲ رکوع:۱۴ سورۃ بقرہ جلالین ص:۳۶) ✦

② ﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجاً وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ﴾ (پارہ:۲ رکوع:۱۵ سورۃ بقرہ جلالین ص:۳۷)

تشریح تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ متوفی عنہا زوجہا کی عدتِ وفات چار ماہ دس دن ہے اور دوسری آیت میں ہے کہ یہ عورت ایک سال تک انتظار کرے گی اور اس کا نفقہ ایک سال تک شوہر کے ذمہ رہے گا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عدت وفات ایک سال ہے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ دوسری آیت پہلی آیت سے منسوخ ہے، پہلی آیت اگرچہ تلاوت کے اعتبار سے مقدم ہے لیکن نزول کے اعتبار سے موخر ہے، ابتداءً "تربص الی الحول" کا حکم تھا، پھر "تربص اربعة اشہر وعشرا" کا حکم نازل ہوگیا اور پہلا حکم منسوخ ہوگیا، جمہور مفسرین رحمہم اللہ نے نسخ ہی کو اختیار کیا ہے، ولا تعارض بعد النسخ۔

(جلالین والفوز الکبیر)

❷ عدت وفات تو اسلام میں ابتداء ہی سے چار ماہ دس دن رہی مگر میراث کا حکم نازل نہ ہونے کی وجہ سے عورت کے لئے اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ اگر وہ اپنے خاوند کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہے تو ایک سال تک رہنے کا حق حاصل ہے اور اس زمانہ میں اس کو شوہر کے ترکہ میں سے نان ونفقہ بھی دیا جائے گا اور شوہروں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی عورتوں کے لئے اس طرح کی وصیت کر جایا کریں اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا اور صاحبِ حق کو اپنا حق وصول کرنے نہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے اس لئے وارثین کے لئے عورت کو گھر سے نکالنا جائز نہ تھا، البتہ اگر عورت چار ماہ دس دن عدت پوری کرنے کے بعد شوہر کے گھر سے نکلنا چاہے اور اپنا حق ورثہ کو چھوڑ دے تو اس کے لئے نکلنا بھی درست تھا اور نکاح کرنا بھی۔ جب آیتِ میراث نازل ہوئی تو یہ حکم منسوخ ہوگیا کیونکہ اب اس کو گھر اور مال میں سے حقِ میراث مل گیا ہے، وہ اپنے حصہ میں رہے اور اپنے حصہ میں سے خرچ اٹھائے، اس صورت میں یہ آیت نہ منسوخ ہے، نہ پہلی آیت کے معارض ہے۔ (بیان القرآن)

ایک نیکی کا ثواب اسی کے مثل ملتا ہے یا تضاعف کے ساتھ، پھر تضاعف کی مقدار کیا ہے؟

پارہ نمبر: ۲، ۳، ۸، ۲۷، ۲۸

آیات

① ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً فَيُضَاعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافاً كَثِيْرَةً﴾
(پارہ: ۲ رکوع: ۱۶ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۳۷)

② ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ﴾
(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۷ سورۂ حدید جلالین ص: ۴۴۹)

③ ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضَاعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۸ سورۂ حدید جلالین ص: ۴۵۰)

④ ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضَاعِفْهُ لَكُمْ اِلخ﴾
(پارہ: ۲۸ رکوع: ۱۶ سورۂ تغابن جلالین ص: ۴۶۳) ✦

⑤ ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ (پارہ: ۳ رکوع: ۴ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۴۱) ✦

⑥ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾
(پارہ: ۸ رکوع: ۷ سورہ انعام جلالین ص: ۱۲۹) ✦

⑦ ﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۷ سورۂ نجم جلالین ص: ۴۳۹)

تشریحِ تعارض

ان آیات میں دو طرح سے تعارض ہے، ایک تو پہلی چھ آیات کے درمیان باہم

طور کہ پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ کو قرض حسن دیتا ہے، یعنی اس کے راستہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے، تو حق تعالیٰ اس کا ثواب بہت گنا بڑھا کر عطا فرماتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب کئی کئی گنا بڑھا کر دیا جاتا ہے، دس گنا یا سات سو گنا کی کوئی تحدید نہیں بلکہ حق تعالیٰ اس سے بھی زائد عطا فرمائیں گے، اور آیت نمبر ۵ میں ارشاد ہے کہ جو لوگ اللہ کے راستہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے کہ ایک دانہ کسی نے بویا، اس سے سات بالیں اگیں، ہر بال میں سو سو دانے ہوئے، یعنی ایک دانہ خرچ کرنے کا ثواب سات سو دانوں کے برابر ملتا ہے، معلوم ہوا کہ ایک نیکی کا ثواب سات سو گنا کر دیا جاتا ہے اور اس آیت کے جملۂ اخیرہ "وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ" کا مطلب اگر يضاعف الى اكثر من سبع مائة لیا جائے کہ جس کے لئے چاہتے ہیں سات سو سے بھی زیادہ بڑھا دیتے ہیں تو اس جملہ کا مضمون پہلی چار آیات کے مرادف ہوگا اور اگر يضاعف الى سبع مائة لمن يشاء مراد ہو تو اس کا مضمون اس آیت کے اول حصہ کے مرادف ہوگا، صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ ایک نیکی کا ثواب سات سو گنا کر دینا حق تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، جس کے لئے چاہتے ہیں سات سو گنا کر دیتے ہیں۔

بہر حال اس آیت کے اول حصہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب سات سو گنا ملتا ہے اور آیت نمبر ۶ میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا دیا جاتا ہے، پس ان آیات میں تعارض ہو رہا ہے کہ پہلی چار آیات میں تضاعف حسنہ بلا تحدید اور آیت نمبر ۵ میں تضاعف الى سبع مائة اور آیت نمبر ۷ میں تضاعف الى عشر امثالها ہے۔

دوسرا تعارض پہلی چھ آیات اور اخیر کی آیت نمبر ۷ کے درمیان ہے، بایں طور کہ پہلی چھ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب تضاعف کے ساتھ ملتا ہے اور آیت نمبر ۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی کا ثواب بغیر تضاعف کے اسی کے برابر ملتا

ہے کیونکہ اس میں ارشاد ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی ''کہ انسان کے لئے اسی عمل کا ثواب ہے جس کی اس نے سعی کی ہے۔'' اگر ایک نیکی کی ہے تو ایک ثواب، اگر دو کی ہیں تو دو ثواب، اگر تین کی ہیں تو تین، وعلیٰ ہذا القیاس، ایک نیکی کا ثواب دس گنا یا سات سو گنا نہیں دیا جاتا، پس یہ آیت نمبر ۷ پہلی چھ آیات کے بظاہر معارض ہے۔

دفع تعارض

پہلے تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ دس گنا اور سات سو گنا اور اس سے زائد تضاعف کا تفاوت اخلاص و مشقت میں تفاوت کے اعتبار سے ہے، جس شخص کی نیکی میں ادنیٰ درجہ کا اخلاص یا مشقت ہوتی ہے اس کو دس گنا ثواب ملتا ہے، اوسط درجہ کے اخلاص و مشقت میں سات سو گنا اور اعلیٰ درجہ کے اخلاص اور مشقت شدیدہ کی صورت میں اس سے زیادہ مثلاً سات لاکھ بلکہ اور زائد تک تضاعف ہوجاتا ہے جیسا کہ ایک روایت میں بیس لاکھ اور چالیس لاکھ تک کا ذکر ہے۔

﴿عن ابی عثمان النهدی قال: بلغنی عن ابی هريرة رضی الله تعالیٰ عنه انه قال: اِنّ الله ليكتب لعبده المؤمن بالحسنة الواحدة الف الف حسنة فحججت ذلك العام، ولم اكن اريد ان احج الا للقائه فی هذا الحديث، فلقيت ابا هريرة رضی الله تعالیٰ عنه، فقلت له، فقال: ليس هذا قلت، ولم يحفظ الذی حدثك، انما قلت: ان الله يعطی العبد المؤمن بالحسنة الواحدة الفی الف حسنة. ثم قال ابوهريرة رضی الله تعالیٰ عنه: اوليس تجدون هذا فی كتاب الله تعالی: "من ذا الذی يقرض اللّٰه قرضاً حسناً فيضاعفه له اضعافاً كثيرة" فالكثيرة

عنده تعالیٰ اکثرمن الفی الف والفی الف، والذی نفسی بیده لقد سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وآله وسلم یقول: ان اللّٰه یضاعف الحسنة الفی الفی حسنة.

(رواہ احمد وابن المنذر وابن ابی حاتم، روح المعانی ۲/۱۶۳)

ترجمہ: ''حضرت ابوعثمان نہدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھ کو خبر پہنچی کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یوں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندہ کے لئے ایک نیکی کا ثواب دس لاکھ نیکیوں کے برابر لکھتے ہیں، تو میں نے اسی سال حج کیا اور صرف اس ارادہ سے حج کیا، کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حج میں ملاقات ہوجائے گی، ان سے یہ حدیث معلوم کروں گا تو میری ملاقات حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوگئی، میں نے ان سے (اس حدیث کے متعلق) عرض کیا تو انہوں نے فرمایا میں نے یہ نہیں کہا تھا، جس نے آپ سے حدیث بیان کی اس کو یاد نہیں رہی، میں نے تو یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ مؤمن بندہ کو ایک نیکی کا ثواب بیس لاکھ لکھتے ہیں پھر فرمایا کیا تم اس چیز کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے "مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا الخ" جو اللہ کو قرض حسن دیتا ہے (یعنی انفاق فی سبیل اللہ) اس کے ثواب کو حق تعالیٰ بہت زیادہ گنا بڑھا دیتے ہیں اور اضعاف کثیرہ اللہ کے نزدیک بیس لاکھ اور بیس لاکھ سے زائد ہیں اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک حسنہ کو چالیس لاکھ حسنات تک بڑھا دیتے ہیں۔''

یا پھر وطن میں رہ کر اور سفر جہاد وغیرہ میں نکل کر نیکی کرنے کے اعتبار سے تفاوت ہوتا ہے، گھر میں رہ کر سات سو اور جہاد فی سبیل اللہ میں نکل کر سات لاکھ کا

ثواب ملتا ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت مرفوعہ میں ہے:

﴿عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ: مَنْ اَرْسَلَ بِنَفْقَةٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَقَامَ فِيْ بَيْتِهٖ، فَلَهٗ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُمِائَةِ دِرْهَمٍ، وَمَنْ غَزَا بِنَفْسِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى، وَاَنْفَقَ فِيْ وَجْهِهٖ ذٰلِكَ، فَلَهٗ بِكُلِّ دِرْهَمٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَبْعُ مِائَةِ اَلْفِ دِرْهَمٍ، ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ (مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ الخ)﴾

(اخرجہ ابن ماجہ وابن ابی حاتم۔ روح المعانی)

ترجمہ: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جس شخص نے اللہ کے راستہ میں خرچ بھیج دیا اور خود اپنے گھر مقیم رہا تو اس کو ہر درہم پر سات سو دراہم کا ثواب ملتا ہے اور جو آدمی خود اللہ کے راستہ میں غزوہ کے لئے نکل جائے اور وہاں جا کر خرچ کرے تو اس کو قیامت کے دن ہر درہم پر سات لاکھ درہم کا ثواب ملتا ہے، پھر آپ نے یہ آیت (مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ الخ) تلاوت فرمائی۔“

یا پھر مہاجرین واعراب کا فرق ہوتا ہے کہ اَعْراب کے لئے دس گنا اور مہاجرین کے لئے سات سو گنا ثواب ہوتا ہے جیسا کہ ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور ابوالشیخ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور عبد بن حمید وغیرہ نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ **فله عشر امثالها** والی روایت خاص کر اعراب (اہل دیہات) کے بارے میں نازل ہوئی ہے، بہر حال مہاجرین، تو ان کی نیکی تو سات سو گنا تک بڑھا دی جاتی ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ یہ تضاعف سب کے حق میں عام ہے اعراب ہوں یا غیر اعراب (ہاں اخلاص ومشقت کا تفاوت بہر

حال معتبر ہے) (تفسیر روح المعانی)

❷ عشرہ وغیرہ سے مراد تحدید نہیں ہے بلکہ تکثیر مقصود ہے کہ حق تعالیٰ ایک نیکی کا ثواب بہت زیادہ عطا فرمائیں گے، اس توجیہ پر تمام آیات کا مفہوم متحد ہو جاتا ہے اور کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (روح المعانی)

دوسرے تعارض کے چار جواب ہیں:

❶ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّامَاسَعٰی میں مثلیت کی تصریح نہیں ہے، یعنی لیس للانسان الامثل ماسعی نہیں فرمایا کہ انسان کو اس کی سعی حسن کے مثل ہی ثواب ملے گا، تضاعف کے ساتھ نہیں جیسا کہ سیئہ کے بارے میں ”مَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجْزٰی اِلَّا مِثْلَھَا“ میں مثلیت کی تصریح ہے بلکہ اس آیت میں تو مطلق کہا گیا ہے اور مقصود حصر کا یہ ہے کہ انسان کو صرف خود، اسی کی سعی کا ثواب ملتا ہے، دوسرے شخص کی سعی کا ثواب نہیں دیا جاتا ہے، البتہ ثواب کتنا دیا جاتا ہے، اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی، پہلی چھ آیات میں اس کو واضح کر دیا گیا کہ کسی کو دس گنا، کسی کو سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زائد ثواب دیا جاتا ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (مولف)

❷ اگر مثلیت مراد لی جائے تو جواب یہ ہے کہ یہ آیت عدل پر اور پہلی چھ آیات فضل پر محمول ہیں لہٰذا کوئی تعارض نہیں، یعنی عدل و نصاف کا تقاضہ تو یہی ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اسی کے مثل دیا جائے مگر حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ثواب میں اضافہ فرمادیں گے، والی خراسان عبداللہ بن طاہر نے حضرت حسین بن فضل رحمہ اللہ سے اس آیت اور وَاللّٰہُ یُضَاعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ کے درمیان تعارض کے متعلق سوال کیا تو حضرت حسن بن فضل رحمہ اللہ نے جواب دیا لیس له بالعدل الا ما سعی وله بالفضل ماشاء الله، ”کہ اگر حق تعالیٰ عدل سے کام لیں تو اس کی سعی کے مثل ہی ثواب دیں گے اور اگر فضل و کرم فرمادیں تو جتنا چاہیں بڑھا چڑھا کر ثواب عطا فرمادیں گے“، اس جواب کو سن کر والی خراسان نے حضرت حسین بن فضل رحمہ اللہ کا

سر چوم لیا۔ (روح المعانی)

❸ تضاعف ثواب اس صورت میں ہے جب کہ انسان اس نیت و امید پر نیکی کرے کہ حق تعالیٰ اس کا ثواب بڑھا کر عطا فرمائیں گے، اس وقت گویا اس کی سعی تضاعف کے ساتھ ہے تو اس کا ثواب بھی تضاعف کے ساتھ ہوگا۔ پس تضاعف کی صورت میں جزاء سعی کے مثل رہی، فوق السعی نہیں ہوئی، لہٰذا پہلی چھ آیات، آیت نمبر ۷ کے معارض نہیں ہیں۔ (تفسیر کبیر)

❹ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى، میں لام علیٰ کے معنیٰ میں ہے، یعنی انسان کو اس کی سیئہ پر اسی کے مثل عذاب دیا جائے گا، پس پہلی چھ آیات حسنات کے بارے میں ہیں کہ ان کے اجر و ثواب میں تضاعف ہوتا ہے اور آخیر کی آیت نمبر ۷ سیئات سے متعلق ہے کہ سیئہ کا بدلہ اسی کے مثل ملتا ہے كَقَوْلِهٖ تَعَالٰى "مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا" لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے مگر اس توجیہ کو صاحب روح المعانی نے بعید اور خلاف ظاہر کہا ہے۔ (روح المعانی)

بعث بعد الموت کی کیفیت کیا ہوگی؟

پارہ نمبر: ۳، ۱۷

آیات

(۱) ﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ (پارہ: ۳ رکوع: ۳ سورۂ بقرۃ جلالین ص: ۴۱)

(۲) ﴿ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَاۤ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾

(پارہ: ۱۷ رکوع: ۷ سورۂ انبیاء جلالین ص: ۱۳۱)

تشریح تعارض

پہلی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعث بعد الموت کی کیفیت یہ ہوگی کہ اجزاء متفرقہ کو جمع کر کے ان کے اجساد بنا کر ان میں روح ڈال دی جائے گی کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے احیاء موتیٰ کی کیفیت کے متعلق دریافت کیا تھا تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ چار پرندے لیکر پہلے ان کو خوب مانوس کرلو، پھر ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت کا پروں اور ہڈیوں سمیت خوب قیمہ سا بنا کر اس کے کئی حصے کر کے ہر پہاڑ پر ایک ایک حصہ رکھ دو، پھر ان سب پرندوں کو بلاؤ تو وہ سب زندہ ہوکر دوڑے ہوئے تمہارے پاس آجائیں گے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا، کہ چار پرندے (مرغ، مور، گدھ، کوا) لئے، ان کو مانوس کیا، پھر ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت، ہڈیوں اور پروں کو خوب باریک کاٹ کر اس کے سات حصے بنائے اور

ایک ایک حصہ ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیا، اس کے بعد ان جانوروں کو پکارا تو فوراً ہڈی سے ہڈی، پر سے پر اور خون سے خون، گوشت سے گوشت مل کر سب اپنی اصلی ہیئت پر زندہ ہوکر ان کے پاس آ گئے، حق تعالیٰ نے یہ منظر دکھا کر واضح کر دیا کہ ہم قیامت کے دن اس طرح مردوں کو زندہ کریں گے کہ تمام مخلوق کے اجزاء بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہوکر جو پورے عالم میں متفرق اور منتشر ہوں گے ان کو ہمارا منادی پکارے گا، ایتھا العظام البالیۃ، والجلود المتمزقۃ، و اللحوم المتفرقۃ، ھلموا الی عرض الرحمن. ''اے بوسیدہ ہڈیوں، متفرق کھالو، اور متفرق گوشت کے ٹکڑو، چلو اللہ کے سامنے پیش ہونے کے لئے۔'' چنانچہ تمام مخلوق کے اجزاء متفرقہ منتشرہ جمع ہوکر اجساد بن جائیں گے، ان میں حق تعالیٰ روح ڈال کر زندہ کر دیں گے اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعث بعد الموت کی کیفیت اعادہ بعد الاعدام ہے، یعنی ہر شئے کو بالکل معدوم اور فنا کر کے دوبارہ موجود کیا جائے گا، اس لئے کہ آیت ثانیہ میں فرمایا ''كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ'' جس طرح ہم نے ہر چیز کو اول مرتبہ پیدا کیا، اسی طرح ہم دوبارہ پیدا کر دیں گے اور ہر شئے کی اول پیدائش عدم سے وجود میں لا کر ہوئی ہے، پس اعادہ بھی ایجاد بعد الاعدام کے طور پر ہوگا، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں:

1. بعث بعد الموت کی کیفیت وہی ہے کہ جو آیت اولیٰ میں بیان کی گئی ہے، یعنی جمع بعد التفریق۔ اور آیت ثانیہ کمابد أنا اول خلق نعیدہ، میں جو خلق ثانی کو خلق اول کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، یہ سہولت و آسانی میں تشبیہ ہے جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حاشیہ بیان القرآن میں اس کی تصریح کی ہے اور مطلب یہ

ہے کہ جس طرح ہم نے آسانی اور سہولت سے ہر شئے کو اول مرتبہ پیدا کر دیا، اسی طرح آسانی اور سہولت سے دوبارہ پیدا کر دیں گے، بعث بعد الموت ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں ہے، پس آیت ثانیہ میں کیفیت بعث سے کوئی گفتگو ہی نہیں ہے، لہٰذا یہ آیت، آیت اولیٰ کے معارض نہیں ہے۔

❷ آیت ثانیہ میں نفس خلق میں تشبیہ مقصود ہے نہ کہ کیفیت خلق میں، مطلب یہ ہے کہ ہم نے ابتداء مخلوق کو پیدا کیا، اسی طرح ہم ثانیاً بھی پیدا فرمادیں گے، رہی کیفیت خلق سو وہ آیت اولیٰ سے معلوم ہو چکی ہے کہ **جمع بعد التفریق** ہے۔ **فلا تعارض بینهما۔**

❸ آیت ثانیہ میں احوال و اوصاف میں تشبیہ مقصود ہے کہ جس حالت اور جس صفت پر ہم نے اول مرتبہ پیدا کیا کہ حفاۃً وعراۃً، غرلاً، ننگے پاؤں، ننگے بدن، غیر مختون پیدا ہوئے، اسی حالت وصفت پر ہم قیامت کے روز زندہ کر کے اٹھائیں گے، اس کی تائید ایک صحیح روایت سے ہوتی ہے۔

﴿عن ابن عباس رضی اللّٰه تعالیٰ عنه قال: قام رسول اللّٰه صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وآله وسلم، وقال: یایها الناس انكم تحشرون الی اللّٰه حفاة، مشاة، عراة، غرلا، ثم قرأ كما بدأنا اول خلق نعیده، واول من یكسی من الخلائق ابراهیم علیه السلام.﴾

(رواہ الشیخان والترمذی، مظہری)

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (خطبہ دینے کے لئے) کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تم اللہ کی طرف ننگے پاؤں پیدل، ننگے بدن، غیر ختنہ شدہ لے جائے جاؤ گے، پھر آپ نے یہ آیت **كما بد أنا اول خلق نعیده** تلاوت فرمائی اور (فرمایا) مخلوق میں سب سے پہلے حضرت

ابراہیم علیہ السلام کو کپڑے پہنائے جائیں گے۔"

تفسیر ابن کثیر میں بھی ایک روایت ہے:

﴿عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قام فینا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بموعظۃ، فقال: انکم محشورون الی اللہ عزوجل حفاۃ، عراۃ، غرلاً، کما بدأنا اول خلق نعیدہ وعداً علینا، انا کنا فاعلین. ...... وذکر تمام الحدیث. اخرجاہ فی الصحیحین من حدیث شعبہ وذکرہ البخاری عند ہذہ الآیۃ فی کتابہ.﴾ (ابن کثیر ۲۳۲/۳)

ترجمہ: "حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان وعظ فرمانے کھڑے ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ تم کو اللہ عزوجل کی طرف ننگے پاؤں، ننگے بدن، غیر مختون لے جایا جائے گا (حق تعالیٰ کا ارشاد ہے) جیسا ہم نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ایسے ہی ہم لوٹائیں گے، یہ ہمارے اوپر وعدہ ہے، ہم اس کو پورا کرنے والے ہیں۔ راوی نے آگے پوری حدیث ذکر کی، اس کی تخریج امام بخاری وامام مسلم رحمہما اللہ نے اپنی صحیحین میں حضرت شعبہ رحمہ اللہ کی حدیث سے کی ہے اور امام بخاری نے اس کو اپنی کتاب میں اس آیت کے قریب ذکر کیا ہے۔" (ابن کثیر)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کَمَا بَدَأْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ سے مراد ایجاد بعد الاعدام نہیں ہے بلکہ بعث بعد الموت کی حالت وصفت کو بیان کرنا مقصود ہے، کیفیت بعث کی وہی ہے جو پہلی آیت میں ہے، یعنی جمع الاجزاء المتفرقۃ، پس یہ آیت پہلی آیت کے معارض نہیں ہے۔

❷ کَمَا بَدَأْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ، میں بھی جمع من الاجزاء المتفرقۃ میں

تشبیہ مقصود ہے جیسا کہ صاحب روح المعانی نے ۱۰۱/۱۷ پر ایک وجہ شبہ جمع من الاجزاء المتفرقة بھی بیان کی ہے، یعنی جس طرح ہم نے اجزاء متفرقہ کو جمع کر کے اولا پیدا کیا، اسی طرح دوبارہ بھی اجزاء متفرقہ کو جمع کر کے پیدا فرمائیں گے، تمام انسانوں اور حیوانوں کی پیدائش میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء و ذرات کو جمع کر کے ان کو پیدا کیا ہے، انسان کی آفرینش جن ماں باپ کے ذریعہ ہوتی ہے اور جن غذاؤں سے ان کا خون اور جسم بنتا ہے وہ خود دنیا بھر کے مختلف گوشوں سے سمٹے ہوئے ذرات ہوتے ہیں، پھر پیدائش کے بعد انسان جس غذا سے نشوونما پاتا ہے، جس سے اس کا خون اور گوشت پوست بنتا ہے، اس میں غور کیا جائے تو اس کی غذاؤں میں ایک ایک چیز ایسی ہے جو دنیا کے مختلف ذرات سے بنی ہوئی ہے، دودھ پیتا ہے تو وہ کسی گائے بھینس یا بکری کے اجزاء ہیں اور ان جانوروں میں یہ اجزاء اس گھاس دانے سے پیدا ہوئے جو انہوں نے کھائے ہیں، یہ گھاس دانے معلوم نہیں، کس کس خطۂ زمیں سے آئے ہیں اور ساری دنیا میں پھرنے والی ہواؤں نے کہاں کہاں کے ذرات کو ان کی ترتیب میں شامل کر دیا ہے، اسی طرح دنیا کا دانہ دانہ اور پھل اور ترکاریاں اور انسان کی تمام غذائیں اور دوائیں جو اس کے بدن کا جزو بنتی ہیں وہ کس کس گوشہ عالم سے کس کس طرح حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور نظام محکم نے ایک انسان کے بدن میں جمع فرما دیئے ہیں، اگر غافل اور کوتاہ نظر انسان دنیا کو چھوڑ کر اپنے بدن ہی کی تحقیق اور ریسرچ کرنے بیٹھے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ اس کا وجود خود ایسے بے شمار اجزاء سے مرکب ہے جو کوئی مشرق کا ہے، کوئی مغرب کا، کوئی جنوبی دنیا کا، کوئی شمالی حصہ کا، حق تعالیٰ نے جس طرح اجزائے منتشرہ کو جمع کر کے انسان بنا دیا، اسی طرح مرنے کے بعد یہ اجزاء پھر منتشر ہو جائیں گے، حق تعالیٰ قیامت کے روز ان اجزاء متفرقہ منتشرہ کو اپنی قدرت کاملہ سے جمع کر کے زندہ فرما دیں گے۔ (معارف القرآن)

قال الشاعر: ؎

زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

پس دونوں آیتوں میں کیفیت بعث کا بیان متحد ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے، لیکن یہ توجیہ صرف ان اشیاء میں جاری ہوگی جو عناصر سے مرکب ہیں جیسے انسان، حیوانات، نباتات وغیرہ، بخلاف نفس عناصر کے کہ ان میں یہ توجیہ مشکل ہے اس لئے کہ تمام مسلمین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عناصر کی تخلیق اولیٰ اجزاء متفرقہ سے نہیں ہوئی بلکہ حق تعالیٰ نے ان کو عدم سے وجود بخشا ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

⑤ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ بعث بعد الموت کی دونوں کیفیتیں متحقق ہوں گی، بعض کے اجزاء تو بالکل معدوم اور فنا ہوجائیں گے، ان کو ازسرنو پیدا کیا جائے گا جس کو آیت ثانیہ میں بیان کردیا گیا اور بعض کے اجزاء، متفرق اور منتشر ہوجائیں گے، ان کو جمع کر کے پیدا کردیا جائے گا جس کو آیت اولیٰ میں واضح کیا گیا ہے، پس دونوں میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ بعض حضرات کے بارے میں تو احادیث میں وارد ہوا ہے کہ ان کے اجسام بالکل محفوظ رہتے ہیں، نہ معدوم ہوتے ہیں نہ منتشر، جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام کے اجسام کہ حق تعالیٰ نے ان کو زمین پر حرام کردیا ہے، وہ جوں کے توں محفوظ رہتے ہیں، طبرانی شریف میں اخلاص کے ساتھ اذان دینے والوں کے بارے میں اور ابن مندہ کی حدیث میں، حاملین قرآن کے متعلق بھی یہی وارد ہے کہ ان کے اجسام محفوظ رہتے ہیں۔ (روح المعانی ۱۰۲/۱۷)

وساوس قلبیہ غیر اختیاریہ پر مؤاخذہ ہوگا یا نہیں؟

پارہ نمبر:۳

آیات

① ﴿وَإِنْ تُبْدُوْا مَافِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾

(پارہ:۳ رکوع:۸ سورۂ بقرہ جلالین ص:۴۵) ✦

② ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (پارہ:۳ رکوع:۸ سورۂ بقرہ جلالین ص:۴۵)

تشریح تعارض

آیتِ اولیٰ میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تمہارے قلوب میں جو خیالات و وساوس پیدا ہوتے ہیں اگر تم ان کو اپنے قول و عمل سے ظاہر کرو گے، یا ان کو اپنے قلوب ہی میں چھپائے رکھو گے دونوں صورتوں میں حق تعالیٰ تمہارا حساب لیں گے، حساب لینے کے بعد جس کو چاہیں گے معاف فرمادیں گے، جس کو چاہیں گے عذاب دیں گے، بہر حال اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قلوب میں آنے والے برے خیالات و وساوس خواہ اختیاریہ ہوں یا غیر اختیاریہ، انسان ان کے دفع کرنے پر قادر ہو یا نہ ہو، ہر حال میں ان خیالات کا حساب ہوگا اور ان پر مؤاخذہ بھی ہوسکتا ہے اور آیت ثانیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان انہیں چیزوں کا مکلّف ہے جو اس کی وسعت و طاقت میں ہیں اور جو امور اس کی وسعت سے باہر ہیں ان کا وہ مکلّف نہیں، ان کے کرنے نہ کرنے پر کوئی مؤاخذہ و گرفت نہیں ہے، معلوم ہوا کہ وساوس غیر اختیاریہ جن کے دفع کرنے پر انسان قادر نہیں ہے ان پر مؤاخذہ نہیں ہوگا، پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے، پہلی آیت میں وساوس قلبیہ غیر اختیاریہ پر مؤاخذہ کا اثبات اور

دوسری آیت میں مؤاخذہ کی نفی کی گئی ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں وساوس اختیاریہ مراد ہیں، یعنی وہ خیالات فاسدہ جن کو انسان اپنے دل میں اختیار سے جگہ دیتا ہے ان پر مؤاخذہ ہوگا اور آیت ثانیہ میں وساوس غیر اختیاریہ مراد ہیں کہ ان پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ (بیان القرآن)

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان رحمۃ اللہ علیہ سے معلوم کیا کہ ارادہ اور خیال پر بھی بندہ سے مؤاخذہ ہوگا؟ تو انہوں نے فرمایا: کہ ہاں، اگر وہ ارادہ عزم کے درجہ میں ہو تو مؤاخذہ ہوگا۔ (خازن)

❷ پہلی آیت دوسری آیت سے منسوخ ہے، جب "ان تبدواما في انفسکم اوتخفوہ یحاسبکم به اللّٰه" نازل ہوئی اور معلوم ہوا کہ دل کے خیالات پر بھی حساب اور گرفت ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم گھبرائے اور ڈرے کیونکہ ان خیالات سے احتراز ممکن نہیں ہے تو حق تعالیٰ نے اس کے بعد یہ آیت نازل فرمائی لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا "کہ اللہ تعالیٰ وسعت وقدرت سے زیادہ کا کسی کو مکلف نہیں بناتے۔" لہٰذا جو خیالات دل میں آجائیں اور ان پر عمل نہ ہو اس میں کوئی گناہ اور گرفت نہیں ہے، اس کی تائید ایک صحیح روایت سے ہوتی ہے:

﴿عن أبي هريرة رضى اللّٰه تعالىٰ عنه لما نزلت على رسول اللّٰه صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وآله وسلم وان تبدوا مافي انفسكم او تخفوه الآية فاشتد ذلك على اصحاب رسول اللّٰه صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وآله و سلم، فأتوا رسول اللّٰه صلى اللّٰه تعالىٰ عليه وآله وسلم، ثم جثوا على الركب،

فقالوا: یارسول الله، کلفنا من الاعمال مانطیق؛ الصلوۃ، و الصوم، والجهاد، والصدقة، وقد انزل الله علیك هذه الاية، ولا نطيقها، فقال رسول الله صلى الله تعالیٰ علیه وسلم: اتریدون ان تقولوا کما قال اهل الكتابين من قبلكم: سمعنا، وعصينا، بل قولوا: سمعنا، واطعنا، غفرانك ربنا، واليك المصير، فلما اقترأها القوم، وزلت بها السنتهم انزل اللّٰه في اثرها (آمن الرسول) الآية، فلما فعلوا ذلك، نسخها اللّٰه تعالى، فانزل سُبحانه: لا يكلف اللّٰه نفسًا الا وسعها.﴾ (رواہ احمد ومسلم۔ روح المعانی ۳/۶۴)

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر یہ چیز دشوار گزری، پس صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عرض کیا یا رسول اللہ! (اب تک تو) ہمیں ان اعمال کا مکلّف بنا گیا تھا جو ہماری طاقت وقدرت میں ہیں یعنی نماز، روزہ، جہاد، صدقہ اور اب اللہ نے آپ پر یہ آیت نازل فرمادی ہے۔ (وان تبدوامافی انفسكم الخ کہ دل میں آنے والے خیالات پر بھی مؤاخذہ ہوگا) ہم تو اس کی طاقت نہیں رکھتے (کہ ایسے خیالات بھی دل میں نہ آنے دیں، خیالات تو غیر اختیاری طور پر دلوں میں آ ہی جاتے ہیں، یہ معاملہ تو بہت دشوار ہوکر رہ جائے گا، ہم اس بارے میں حق تعالیٰ کی اطاعت کیسے کر پائیں گے؟) آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (کہ حق تعالیٰ کو اختیار ہے جو چاہیں حکم نازل فرمادیں، تمہیں حق

تعالیٰ کے حکم کی اطاعت ہر حال میں کرنی ہوگی اور خیالات قلبیہ سے احتراز کرنا ہوگا) کیا تمہارا ارادہ یہ ہے کہ تم بھی اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی طرح کہو سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (کہ ہم نے سن تو لیا مگر ہم آپ کے حکم کی فرمانبرداری نہیں کرتے بلکہ نافرمانی کرتے ہیں) بلکہ تم لوگ تو یوں کہو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا الخ کہ ہم نے سن لیا اور ہم آپ کی اطاعت کریں گے (اور کوشش کریں گے کہ دل میں خیالات نہ آئیں) اے اللہ، ہماری مغفرت فرما، تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پڑھا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا الخ مگر (یہ عہد و پیمان کرتے ہوئے) ان کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں (کہ ہم وعدہ کر تو رہے ہیں مگر معلوم نہیں پورا کر پائیں گے یا نہیں کیونکہ وساوس غیر اختیاریہ سے احتراز کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے) تو حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی آمَنَ الرَّسُوْلُ الخ (جس میں حق تعالیٰ نے ان عہد و پیمان کرنے والے مؤمنین کی مدح فرمائی) جب لوگوں نے یہ عہد و پیمان (سمعنا واطعنا) کیا تو حق تعالیٰ نے اس آیت کو منسوخ کر دیا اور لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا نازل فرمائی (جس میں بتا دیا کہ تم لوگ وسعت کے بقدر مکلّف ہو، لہٰذا غیر اختیاری خیالات و وساوس پر تمہاری کوئی گرفت نہیں ہوگی)

مگر اس توجیہ پر اشکال ہوتا ہے کہ نسخ تو انشاءات کے ساتھ مخصوص ہے، اخبار میں نسخ جاری نہیں ہوتا اور اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ الخ خبر ہے نہ کہ انشاء۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی کلام اگر لفظاً تو خبر ہو مگر معنیً انشاء ہو تو اس میں نسخ واقع ہو جاتا ہے اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اگرچہ خبر ہے مگر مقصود اس کا یہ ہے کہ "تم لوگ اپنے دلوں میں برے خیالات نہ آنے دو، ورنہ گرفت ہوگی اور یہ مفہوم از قبیل نہی ہے جو کہ انشاءات میں سے ہے، پس اس

میں نسخ کا جاری ہونا قابل اشکال نہیں ہے۔'' (روح المعانی ۳/۶۴)

❸ پہلی آیت میں اثبات محاسبہ کا ہے اور دوسری آیت میں نفی مؤاخذہ کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ امور قلبیہ پر محاسبہ تو ہوگا مگر مؤاخذہ نہیں ہوگا، اسی لئے یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ فرمایا یواخذکم به الله نہیں فرمایا، محاسبہ اور مؤاخذہ میں فرق ہے، محاسبہ تو یہ ہے کہ بندہ کو اس کے اعمال کی خبر دیدی جائے اور بتلا دیا جائے کہ تو نے یہ یہ اعمال کئے تھے، تیرے دل میں فلاں فلاں معاصی کے خیالات آئے تھے مگر ان پر کوئی گرفت نہ کی جائے بلکہ ان کو معاف کر دیا جائے اور مؤاخذہ کا مطلب عذاب و سزا دینا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی توجیہ منقول ہے، اس کی تائید روایت مرفوعہ صحیحہ سے ہوتی ہے۔

﴿عن صفوان بن محرز المازني قال: بينما ابن عمر يطوف اذ عرض له رجل، فقال: يا ابا عبدالرحمٰن، اخبرني ما سمعت عن رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وآله وسلم في النجوى، قال: سمعت رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وآله وسلم يقول: يدني المؤمن من ربه حتى يضع عليه كنفه، فيقرره بذنوبه: تعرف ذنب كذا، وكذا؟ فيقول: اعرف ربي، اعرف مرتين، فيقول الله: سترتها عليك في الدنيا، وانا اغفرها لك اليوم، ثم تطوى صحيفة حسابه، واما الاخرون، وهم الكفار والمنافقون، فينادى بهم على رؤوس الخلائق: هؤلاء الذين كذبوا على ربهم، الا لعنة الله على الظالمين.﴾ (رواہ البخاری ومسلم، الخازن ۱/۲۱۱)

ترجمہ: ''صفوان بن محرز المازنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ طواف کر رہے تھے کہ اچانک ایک شخص نے

سامنے آ کر دریافت کیا کہ آپ نے خیالِ قلبی کے بارے میں جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہو وہ مجھے بھی بتلایئے، انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ مؤمن اپنے رب کے قریب جائے گا، حق تعالیٰ اس پر اپنا پردہ ڈال دیں گے، اس کے بعد اس کے گناہوں کا اس سے اقرار کرائیں گے کہ تو فلاں فلاں گناہ جانتا ہے؟ وہ دو مرتبہ کہے گا اے رب جانتا ہوں (میں نے فلاں فلاں گناہ کیا ہے) حق تعالیٰ فرمائیں گے میں نے دنیا میں تیری پردہ پوشی کی تھی اور آج تیری مغفرت کرتا ہوں، پھر اس کے حساب کا صحیفہ لپیٹ دیا جائے گا، بہر حال دوسرے لوگ (جو کفار و منافقین ہیں) ان کو تو تمام مخلوق کے سامنے پکارا جائے گا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا ہے، یاد رکھو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔"

❷ پہلی آیت میں جس مواخذہ کا اثبات ہے وہ مؤاخذہ فی الدنیا ہے اور دوسری آیت میں جس مؤاخذہ کی نفی ہے وہ مؤاخذہ فی الآخرۃ ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں، کیونکہ جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں اور جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں، مطلب یہ ہوا کہ امورِ قلبیہ پر حق تعالیٰ دنیا میں مؤاخذہ فرماتے ہیں، جن لوگوں کے قلوب میں معاصی کے خیالات و وساوس آتے رہتے ہیں ان پر حق تعالیٰ دنیا ہی میں غموم و ہموم طاری فرما دیتے ہیں، آخرت میں ان پر کوئی عقاب نہیں ہوگا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ارشاد بلکہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی سے معلوم ہوتا ہے:

﴿روى الضحاك عن عائشةَ رضي الله تعالىٰ عنها انها قالت: ما احدث العبدبه نفسه من شر كانت محاسبة الله

عليه بغم يبتليه به في الدنيا، اوحزن، او اذى، فاذا جاءت الآخرة لم يسئل عنه، ولم يعاقب عليه، وروت انها سالت النبي صلى الله تعالىٰ عليه وآله وسلم عن هذه الاية، فاجابها بما هذا معناه.﴾ (التفسیر الکبیر ۷/۱۳۴)

ترجمہ: ''امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ بندے کے دل میں جو برا خیال آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا محاسبہ اس پر یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں اس کو کسی رنج وغم یا تکلیف میں مبتلا فرما دیتے ہیں، آخرت میں نہ اس سے سوال ہوگا نہ عذاب اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کا جواب دیا تھا۔''

۵ پہلی آیت میں جو مؤاخذہ کا اثبات ہے یہ تو اس شخص کے حق میں ہے جو خیالات فاسدہ کو اچھا سمجھے اور ان پر مصر رہے اور آیت ثانیہ میں جو مؤاخذہ کی نفی ہے یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو ان خیالات شر کو ناگوار سمجھے، ان سے نفرت کرے، اختلاف اشخاص کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (تفسیر کبیر ۷/۱۳۵)

بندہ کو مالا یطاق کا مکلّف بنایا جاتا ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۳، ۸

آیات

① ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (پارہ: ۳ رکوع: ۸ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۴۵)

② ﴿لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (پارہ: ۸ رکوع: ۶ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۸) ✦

③ ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ (پارہ: ۳ رکوع: ۸ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۴۵)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱، ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کسی بندہ کو ایسے امور کا مکلّف نہیں بناتے جو بندہ کی طاقت سے باہر ہوں اور آیت نمبر ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کو مالا یطاق کا مکلّف بنایا جاتا ہے کیونکہ اس میں حق تعالیٰ نے بندہ کو یہ دعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے کہ اے ہمارے رب، تو ہمارے اوپر ان امور کا بوجھ مت ڈال جن کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔ اور ایسی دعا اسی وقت کی جاسکتی ہے جب کہ حق تعالیٰ مالا یطاق کا مکلّف بناتے ہوں، اگر حق تعالیٰ کسی کو مالا یطاق کا مکلّف نہ بناتے ہوں تو پھر یہ دعا کرنا بے سود و بے معنی ہوگا کہ ہم کو مالا یطاق کا مکلّف نہ بنا، اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ مالا یطاق کا مکلّف بناتے ہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہوگیا کیونکہ پہلی دو آیتوں میں تکلیف مالا یطاق کی نفی اور تیسری میں اثبات ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

① آیت نمبر ۱، ۲ میں نفی تکلیف کی ہے اور تیسری آیت میں اثبات تحمیل کا ہے نہ

کہ تکلیف کا اور تکلیف وتحمیل میں فرق ہے، تکلیف کے معنی تو الزام مافیہ کلفة ومشقة ہے، ایسی چیز کو لازم کر دینا جس میں کلفت ومشقت ہو جیسے بندوں پر فرائض وواجبات کو لازم کر دیا گیا ہے اور تحمیل کے معنی عوارض وحوادث اور عقوبات کا نازل کرنا ہیں، پس پہلی دو آیتوں کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم بندوں پر ایسے امور کو واجب وفرض اور لازم نہیں کرتے جن کی بندوں میں طاقت نہ ہو اور تیسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رب! آپ عوارض وحوادث اور عقوبات نازل فرمانے والے ہیں، ہر قسم کے عوارض وحوادث کا نازل کرنا آپ کے قبضہ قدرت میں ہے مگر اے ہمارے رب! ہم پر ایسے حوادث وعوارض، مصائب وآلام مت ڈالنا جن کو ہم برداشت نہ کر پائیں، پس جس شئے کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں اور جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں کیونکہ اثبات تحمیل مالا یطاق کا ہے اور نفی تکلیف مالا یطاق کی ہے۔ فلا تعارض بینہما. (تفسیر روح المعانی بتغیر ۳/ ۶۹ و ۷۰)

❷ تحمیل کو تکلیف ہی کے معنی میں لے کر جواب یہ ہے کہ پہلی دو آیتوں میں تکلیف مالا یطاق کے وقوع کی نفی ہے کہ حق تعالیٰ تکلیف مالا یطاق واقع نہیں فرماتے، یعنی کسی کو مالا یطاق کا مکلف نہیں بناتے اور تیسری آیت میں تکلیف مالا یطاق کے امکان کا اثبات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے رب، آپ اگرچہ مالا یطاق کا مکلف بنا سکتے ہیں، تکلیف مالا یطاق ممکن ہے مگر ہم کو آپ مالا یطاق کا مکلف نہ بنایئے۔ پس نفی وقوع کی ہے اور اثبات امکان کا ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ ایسا جائز ہے کہ ایک شئے ممکن ہو مگر واقع نہ ہو، ہر ممکن کا واقع ہونا کوئی ضروری نہیں ہے، اہل سنت والجماعت کا مسلک بھی یہی ہے کہ تکلیف مالا یطاق ممکن ہے مگر واقع نہیں ہے، شرح عقائد اور اس کی شرح النبراس میں اس کی تفصیل ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ (مؤلف)

پورا قرآن متشابہ ہے یا محکم یا بعض متشابہ و بعض محکم ہے؟

پارہ نمبر: ۳، ۱۱، ۲۳

آیات

① ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ﴾ (پارہ: ۳ رکوع: ۹ سورہ آل عمران جلالین ص: ۴۶) ✦

② ﴿الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ آيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ﴾ (پارہ: ۱۱ رکوع: ۱۷ سورۂ ہود جلالین ص: ۱۷۹) ✦

③ ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ (پارہ: ۲۳ رکوع: ۱۷ سورۂ زمر جلالین ص: ۳۸۷)

تشریح تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا بعض حصہ محکم اور بعض حصہ متشابہ ہے اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تمام آیات یعنی پورا قرآن محکم ہے اور تیسری آیت میں کتاباً متشابہاً کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا قرآن متشابہ ہے، پس ان تینوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

پہلی آیت میں محکم اور متشابہ کے اصطلاحی معنی مراد ہیں اور دوسری و تیسری آیت میں محکم و متشابہ لغوی معنی کے اعتبار سے کہا گیا ہے، محکم کے معنی لغت میں مضبوط اور

متقن کے ہیں، یہ احکام بمعنی اتقان سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور متشابہ کے معنی لغت میں وہ شئے جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کے مشابہ و مماثل ہو، دونوں میں کوئی فرق نہ ہو اور اصطلاح میں محکم واضح الدلالۃ علی المراد کو کہا جاتا ہے، یعنی وہ لفظ جو مراد و مقصود پر واضح طور پر دلالت کرے اور متشابہ اصطلاح میں خفی الدلالۃ علی المراد کو کہا جاتا ہے، یعنی وہ لفظ جس کی دلالت مراد پر مخفی ہو جس کے معنی و مقصود ظاہر و واضح نہ ہوں، دفع تعارض کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں قرآن کے بعض حصہ کو محکم اور بعض کو متشابہ اصطلاحی معنی کے اعتبار سے کہا گیا ہے کہ قرآن کی بعض آیات ایسی ہیں جو مراد و مقصود پر واضح طور پر دلالت کرتی ہیں جیسے آیاتِ احکام، آیات وعد و وعید وغیرہ اور بعض آیات ایسی ہیں جن کی مراد مخفی ہے جیسے سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات الٓمّٓ، الٓر، الٓمّٓر، الٓمّٓصٓ، طٰسٓ، طٰسٓمّٓ، حٰمٓ وغیرہ اور دوسری آیت میں جو تمام آیات کو محکم کہا گیا ہے یہ معنیٔ لغوی کے اعتبار سے ہے کہ قرآن کی تمام آیات مضبوط و مستحکم ہیں ان میں کوئی خلل، کوئی عیب و نقص نہیں ہے، پورا قرآن تناقض، فسادِ معنی، رکاکتِ لفظ اور دیگر تمام عیوب و نقائص سے منزہ و مقدس ہے، نیز تغیر و تبدل اور تحریف سے بھی محفوظ ہے، کسی کی مجال نہیں کہ قرآن میں کوئی تغیر و تبدل اور تحریف کر دے، حق تعالیٰ کا وعدہ ہے "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" محکم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام آیات واضحات الدلالۃ ہیں، اور تیسری آیت میں جو پورے قرآن کو متشابہ کہا گیا ہے یہ بھی معنیٔ لغوی کے اعتبار سے ہے، یعنی فصاحت و بلاغت میں، حسن و صداقت میں قرآن کا ایک حصہ دوسرے کے مشابہ ہے، قرآن کی تمام آیات لفظاً و معنیً فصیح و بلیغ ہیں، تمام آیات میں حسن و صداقت ہے، پورا قرآن حسن ترتیب سے مزین ہے، یہ مطلب نہیں کہ قرآن کی تمام آیات متشابہ اور غیر واضحات الدلالۃ ہیں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (جلالین و روح المعانی و صاوی)

غزوۂ بدر میں کفار کو مسلمانوں کی تعداد زیادہ نظر آ رہی تھی یا کم؟

پارہ نمبر: ۳، ۱۰

① ﴿ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: ۱۰ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۴۷) ✦

② ﴿ وَيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ﴾

(پارہ: ۱۰ رکوع: ۱ سورۂ انفال جلالین ص: ۱۵۱)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں غزوۂ بدر کی کیفیت بیان کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ." کہ جب مسلمانوں اور کفار کی دونوں جماعتیں باہم ایک دوسرے کے مقابل ہوگئی تھیں تو کفار مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے، حالانکہ کفار کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی اور مسلمان تین سو سے کچھ زائد تھے مگر کفار کو مسلمان دیکھنے میں دوگنے نظر آ رہے تھے۔ یہ مطلب اس احتمال پر ہے کہ یرونہم کی ضمیر فاعل کفار کی طرف اور ہم ضمیر مفعول مسلمین کی طرف راجع ہے اور مثلیہم کی ضمیر بھی کفار کی طرف لوٹ رہی ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اسی احتمال کو لے کر ترجمہ کیا ہے "اور دوسری فوج کافروں کی ہے دیکھتے ہیں، یہ ان کو اپنے سے دو چند، صریح آنکھوں سے۔" اگرچہ ان ضمائر کے مراجع میں اور بھی متعدد احتمالات ہیں

مگر طوالت کے خوف سے ہم نے ان کو ترک کر دیا ہے۔

بہر حال مسلمانوں کی تعداد قلیل ہونے کے باوجود حق تعالیٰ نے کفار کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد کو کثیر دکھلایا اور آیت ثانیہ میں ارشاد ہے "ویقللکم فی اعینھم" کہ حق تعالیٰ تم لوگوں کو کفار کی نگاہوں میں قلیل دکھلا رہے تھے کہ کفار تم کو تعداد میں بہت کم دیکھ رہے تھے، ویسے تو واقع میں بھی مسلمانوں کی تعداد کفار سے کم تھی مگر حق تعالیٰ نے اور زیادہ کم کر کے دکھلائی جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوجہل نے مسلمانوں کے لشکر کو دیکھ کر اپنے اصحاب سے کہا کہ ان کی تعداد تو فقط اتنی معلوم ہوتی ہے جن کی خوراک ایک اونٹ ہو، عرب میں ایک اونٹ کو سو آدمیوں کی خوراک سمجھا جاتا تھا گویا کفار کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کی تعداد سو سے زائد نہیں ہے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے کہ پہلی آیت میں تو ہے کہ کفار مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا یعنی دو ہزار کے قریب دیکھ رہے تھے اور دوسری آیت میں ہے کہ بہت کم دیکھ رہے تھے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

(۱) اختلاف زمان پر محمول ہے، مطلب یہ ہے کہ لڑائی سے قبل تو حق تعالیٰ نے کفار کو مسلمانوں کی تعداد بہت کم دکھلائی، حکمت اس میں یہ تھی اگر مسلمانوں کی تعداد شروع ہی میں کفار کو زیادہ دکھلا دی جاتی تو کفار پر رعب طاری ہو جاتا اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے اور لڑائی کی نوبت نہ آتی اور حق تعالیٰ نے جو مشرکین کی ہلاکت کا فیصلہ کر رکھا تھا اس کا ظہور نہ ہوتا اس لئے حق تعالیٰ نے ابتداءً لڑائی شروع ہونے سے قبل مسلمانوں کی تعداد کفار کو بہت کم دکھلائی تا کہ وہ ان کی تعداد کو کم دیکھ کر کوئی خاص تیاری کئے بغیر لڑائی کے میدان میں آجائیں اور جب لڑائی شروع ہوگئی تو کفار

مسلمانوں کی تعداد کو اپنے سے دو گنا دیکھ رہے تھے اور کفار پر مسلمانوں کا ایک رعب طاری ہو رہا تھا اور مسلمانوں کو کفار کی تعداد بہت قلیل نظر آ رہی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہماری نظروں میں کفار صرف نوے کی تعداد میں دکھائی دے رہے تھے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ آیت اولیٰ لڑائی کے شروع ہونے کے بعد کے زمانہ پر محمول ہے اور آیت ثانیہ لڑائی شروع ہونے سے قبل کے زمانہ پر محمول ہے اور جب دو متعارض چیزوں کا زمانہ مختلف ہو تو تعارض نہیں رہتا۔

(جلالین، تفسیر ابوالسعود وغیرہ)

۲ آیت اولیٰ میں یرونھم کی ضمیر فاعل اور ضمیر مفعول دونوں کفار کی طرف راجع ہیں اور مثلیھم کی ضمیر مسلمین کی طرف راجع ہے، ترجمہ یہ ہوگا کہ "کفار اپنے آپ کو مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ دیکھ رہے تھے۔" حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں یہی ترجمہ کیا ہے، مثلین اگرچہ تثنیہ کا صیغہ ہے مگر مراد اس سے اکثریت کو بیان کرنا ہے، تحدید مقصود نہیں ہے، کیونکہ کفار تو مسلمانوں سے واقع میں ہی تقریباً تین گنا زائد تھے، مسلمانوں کی تعداد ان کو بہت کم نظر آنے کی وجہ سے اپنی تعداد ان کو تین گنے سے بھی زیادہ نظر آ رہی تھی، اس احتمال پر ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ کفار اپنے کو زیادہ اور مسلمانوں کو کم دیکھ رہے تھے۔

ایمان اسلام میں اتحاد ہے یا مغایرت؟

پارہ نمبر: ۳، ۲۶، ۲۷

آیات

① ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ (پارہ: ۳ رکوع: ۱۰ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۴۸)

② ﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: ۱۷ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۶)

③ ﴿فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۱ سورۂ ذاریات جلالین ص: ۴۳۳) ✦

④ ﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُل لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِن قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۱۴ سورۂ حجرات جلالین ص: ۴۲۸)

تشریح تعارض

پہلی تین آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور اسلام دونوں متحد ہیں اور چوتھی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں مغایرت ہے اس لئے کہ آیت اولیٰ میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین فقط اسلام ہے، اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین اللہ کو پسند نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان بھی اسلام ہی ہے کیونکہ اگر ایمان اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین ہوتو اللہ کے نزدیک ایمان غیر پسندیدہ دین ٹھہرے گا اور ظاہر ہے کہ ایمان کے متعلق یہ کہنا کہ یہ حق تعالیٰ کو پسند نہیں ہے باطل اور غلط ہے، پس معلوم ہوا کہ ایمان و اسلام دونوں متحد ہیں، اور دوسری آیت میں فرمایا جو شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی تلاش میں ہو وہ دین اس کا مقبول نہیں ہوگا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایمان عین اسلام ہے کیونکہ اگر غیر اسلام ہوتو

ایمان مقبول عند اللہ نہیں رہے گا وہ باطل، اور تیسری آیت میں حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے متبعین کو اولاً مؤمنین سے، ثانیاً مسلمین سے تعبیر کیا پہلے تو فرمایا "فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" کہ جب ہم نے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل کرنا چاہا تو اس بستی میں جتنے مؤمنین تھے سب کو باہر کر دیا، اس کے بعد فرمایا "فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ" کہ جب ہم نے مؤمنین کو نکالنے کا ارادہ کیا تو ہم کو اس بستی میں مسلمانوں کے صرف ایک گھر کے علاوہ اور کوئی گھر مسلمانوں کا نہیں ملا اور وہ گھر حضرت لوط علیہ السلام کا تھا جس میں بقول مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی دو بیٹیاں تھیں اور بقول حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کل تیرہ افراد تھے۔ (کما فی روح المعانی)

پس حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے اہل کو اولاً مؤمنین سے اور ثانیاً مسلمین سے تعبیر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان و اسلام متحد ہیں، بہر حال یہ تینوں آیتیں ایمان و اسلام کے اتحاد پر دال ہیں اور چوتھی آیت سے دونوں میں مغایرت ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قبیلہ بنو اسد کے کچھ دیہاتی لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا "امنا" کہ ہم ایمان لائے۔" حق تعالیٰ نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہہ دیجئے کہ تم لوگ ابھی ایمان نہیں لائے لہٰذا آمنا مت کہو، تم لوگ ابھی صرف اسلام لائے ہو اس لئے یوں کہو اسلمنا کہ ہم اسلام لے آئے۔ تو اس آیت میں ان دیہاتیوں کے ایمان کی نفی اور اسلام کا اثبات کیا گیا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایمان و اسلام میں مغایرت ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اسلام لغوی معنی کے اعتبار سے تو ایمان کے مغایر

ہے مگر اصطلاح شرع میں دونوں کا مصداق متحد ہے۔ اسلام لغت میں انقیاد ظاہری کو کہا جاتا ہے، یعنی ظاہری افعال میں اطاعت کرنا اگرچہ تصدیق قلبی حاصل نہ ہو اور اصطلاح شرع میں اسلام انقیاد باطنی کو کہتے ہیں، یعنی تلفظ بالشہادتین بشرط التصديق القلبي کا نام شرع میں اسلام ہے، اور ایمان شرع میں التصديق القلبي بشرط التلفظ بالشهادتين کو کہتے ہیں پس اصطلاح شرع میں دونوں متحد ہوئے، پہلی تین آیتوں سے جو ایمان و اسلام کا اتحاد ثابت ہو رہا ہے وہ مصداق شرعی کے اعتبار سے ہے اور آیت نمبر ۴ میں جو مغایرت ہے وہ مفہوم لغوی کے اعتبار سے ہے، آنے والے اَعراب ظاہری افعال میں تو اطاعت کرتے تھے جیسا کہ منافقین ظاہراً اطاعت کرتے تھے مگر ان کے قلوب میں تصدیق داخل نہیں ہوئی تھی اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تم لوگ ابھی ظاہری مسلمان ہو، تصدیق قلبی تم کو حاصل نہیں ہے۔ پس اس آیت سے اسلام لغوی اور ایمان میں مغایرت ثابت ہوتی ہے نہ کہ اسلام اصطلاحی شرعی اور ایمان اصطلاحی شرعی میں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(جمل وغیرہ)

کفار سے دوستی مطلقاً جائز نہیں یا صرف عدم ضرر کے وقت؟

پارہ نمبر: ۳، ۵، ۶، ۲۸

آیات

① ﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً﴾
(پارہ:۳ رکوع:۱۱ سورۂ آل عمران جلالین ص:۴۹) ✦

② ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾
(پارہ:۵ رکوع:۱۸ سورۂ نساء جلالین ص:۹۰)

③ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ﴾ (پارہ:۶ رکوع:۱۲ سورۂ مائدہ جلالین ص:۱۰۱)

④ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ﴾
(پارہ:۶ رکوع ۱۳ سورۂ مائدہ جلالین ص:۱۰۲)

⑤ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ (پارہ:۲۸ رکوع:۷ سورۂ ممتحنہ جلالین ص:۴۵۶)

تشریح تعارض

آیت نمبرا سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر کفار کی طرف سے کسی قسم کے ضرر کا اندیشہ ہو تو ان سے موالاۃ اور دوستی رکھنا جائز ہے ورنہ جائز نہیں کیونکہ اس میں اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُ تُقٰةً کا استثناء کیا گیا ہے اور آیت نمبر۲، تا ۵ میں چونکہ کوئی استثناء نہیں ہے

اس لئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار و مشرکین، یہود و نصاریٰ سے کسی حال میں بھی دوستی جائز نہیں، ضرر کا اندیشہ ہو یا نہ ہو، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ پہلی آیت میں موالاۃ مجازیہ اور اخیر کی آیتوں میں موالات حقیقیہ مراد ہے، موالاۃ حقیقیہ قلبی تعلق اور حقیقی دوستی کو کہا جاتا ہے اور مجازاً اس کا اطلاق مداراۃ یعنی ظاہری خوش خلقی پر ہوتا ہے، آیت اولیٰ کا مقصد یہ ہے کہ اگر تمہیں کفار کی طرف سے کسی قسم کے ضرر کا اندیشہ ہو تو ان کے ساتھ مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی کرنا درست ہے، گفتگو اور ظاہری معاملات میں ان سے اچھا برتاؤ کیا جائے تاکہ وہ ضرر رسانی نہ کریں۔ البتہ قلبی تعلق قائم نہ کرے اور اگر کوئی ضرر کا اندیشہ نہ ہو تو مداراۃ بھی درست نہیں اور بھی دیگر حالات ایسے ہیں جن میں مداراۃ کرنا درست ہے جیسے مداراۃ کرنے سے اگر کافر کے ہدایت پر آنے کی توقع ہو، یا کوئی کافر مہمان بن کر آئے تو اکرام ضیف کی خاطر مداراۃ کرنا جائز ہے۔ اور اخیر کی چار آیات میں موالاۃِ حقیقیہ یعنی قلبی دوستی و تعلق مراد ہے جو کفار کے ساتھ کسی بھی حال میں درست نہیں خوہ ضرر کا اندیشہ ہو یا نہ ہو، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (بیان القرآن)

❷ پہلی آیت غلبۂ اسلام سے قبل پر محمول ہے اور بعد کی آیات غلبۂ اسلام کے بعد پر محمول ہیں، جب تک اسلام کو قوت حاصل نہیں ہوئی تھی، کفار کا غلبہ تھا اس وقت اندیشۂ ضرر کی صورت میں موالاۃ اور دوستی کی اجازت دیدی گئی تھی، جب اسلام کو قوت حاصل ہوگئی، دین اسلام تمام ادیان پر غالب آگیا تو موالاۃ سے مطلقاً منع کردیا گیا، اب بھی جن ممالک اور جن علاقوں میں کفار کا غلبہ ہو ان میں یہی حکم ہے کہ کفار کے ساتھ موالاۃ کی اجازت ہے، ورنہ وہ لوگ ضرر رسانی کے درپے ہوں گے۔ (جلالین)

حضرت زکریا علیہ السلام کے لئے علامت، تکلم سے تین دن رکنا تھا یا تین رات؟

پارہ نمبر: ۱۶،۳

آیات

① ﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَنْ لَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا﴾ (پارہ: ۳ رکوع: ۱۲ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۰) ✦

② ﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَنْ لَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا﴾ (پارہ: ۱۶ رکوع: ۴ سورۂ مریم جلالین ص: ۲۵۴)

تشریح تعارض

جب حق تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے یہاں بڑھاپے اور ضعیفی کی عمر میں لڑکا پیدا ہونے کی بشارت دی تو حضرت زکریا علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے درخواست کی کہ بیوی کے استقرار حمل کی کوئی علامت بتلا دیجئے جس سے میں سمجھ جاؤں کہ میری بیوی حاملہ ہوچکی ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ استقرار حمل کی علامت یہ ہے کہ آپ لوگوں سے تین دن تک بات چیت نہیں کرسکو گے، آپ کی زبان بند ہوجائے گی، صرف اشارہ سے بات چیت کرسکو گے، جب ایسا ہوجائے تو سمجھ لینا کہ بیوی حاملہ ہوچکی ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے آیتِ اولیٰ میں "ان لا تکلم الناس ثلثة ایام" فرمایا "کہ تین دن بات نہ کرو گے۔" اور آیتِ ثانیہ میں "ثَلٰثَ لَيَالٍ" ہے "کہ تین رات بات نہ کرسکو گے۔" یعنی پہلی آیت میں ایام اور دوسری میں لیالی کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ یوم ولیل میں تعارض ہے، پس دونوں آیتوں میں بظاہر

تعارض ہورہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ دونوں کا مجموعہ مراد ہے، یعنی تین دن تین رات تک بات نہ کرسکو گے، پہلی آیت میں ثلثة ایام بلیالیہا اور دوسری آیت میں ثلث لیال بایامہا مراد ہے، البتہ سورۂ آل عمران میں ایام اور سورۂ مریم میں لیالی کہنے کی حکمت یہ ہے کہ رات دن پر مقدم ہوتی ہے اور سورۂ مریم مکیہ ہونے کی وجہ سے مقدم اور سورہ آل عمران مدنیہ ہونے کی وجہ سے مؤخر ہے، پس سورۂ متقدمہ میں مقدم یعنی لیالی کو ذکر فرمایا اور سورۂ متاخرہ میں موخر یعنی ایام کو ذکر کیا۔ (صاوی)

خالق صرف حق تعالیٰ ہیں یا بندے بھی خالق ہیں؟

پارہ نمبر: ۳، ۷، ۱۳، ۱۸، ۲۳

آیات

① ﴿ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: ۱۳ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۱)

② ﴿ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ ﴾ (پارہ: ۷ رکوع: ۵ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۱۱۰)

③ ﴿ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ﴾ (پارہ: ۱۸ رکوع: ۱ سورۂ مؤمنون جلالین ص: ۲۸۷)

④ ﴿ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخٰلِقِیْنَ ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ۸ سورۂ صافات جلالین ص: ۳۷۸) ✦

⑤ ﴿ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَّخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ وَّهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ﴾

(پارہ: ۷ رکوع: ۱۹ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۲)

⑥ ﴿ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾

(پارہ: ۱۳ رکوع ۸ سورۂ رعد جلالین ص: ۲۰۲)

تشریح تعارض

پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ بھی بعض اشیاء کا خالق ہے جیسا کہ معتزلہ کا مسلک ہے کیونکہ پہلی دو آیتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ مٹی سے پرندہ پیدا کرتے تھے، خلق کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی

طرف کی گئی ہے جو اللہ کے بندے ہیں اور تیسری اور چوتھی آیت میں ہے اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ”کہ حق تعالیٰ پیدا کرنے والوں میں سے بہترین پیدا کرنے والے ہیں“، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیدا کرنے والے اللہ کے علاوہ اللہ کے بندے بھی ہیں، مگر حق تعالیٰ بہتر پیدا کرنے والے ہیں اور اخیر کی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں، جیسا کہ اہل سنت والجماعت رحمہم اللہ کا مسلک ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ خلق کے معنی ایجاد وتکوین کے بھی آتے ہیں، یعنی کسی شئے کو عدم سے وجود میں لانا اور خلق کا اطلاق تقدیر وتصویر اور تسویہ کے معنی پر بھی ہوتا ہے، یعنی کسی شئے کو ایک اندازے کے ساتھ تیار کرنا، کسی شئے کی صورت وشکل بنانا اور اس کو برابر درست کرنا، خلق بمعنی ایجاد وتکوین تو حق تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے، اللہ کے علاوہ کوئی مکون وموجد نہیں ہے اور خلق بمعنی التقدیر والتصویر کا اطلاق بندوں پر بھی درست ہے، اندازے کے ساتھ کسی شئے کی صورت وشکل بندہ بھی بنا دیتا ہے، پتھر، لکڑی وغیرہ سے مجسمے اور صورتیں تراش دیتا ہے، ان کو چھیل کر، رگڑ کر درست اور برابر کر دیتا ہے پس پہلی چار آیتوں میں لفظ خلق اسی دوسرے معنی میں مستعمل ہے، ایجاد وتکوین مراد نہیں ہے، قرینہ اس کا یہ ہے کہ ایجاد وتکوین بغیر مادہ کے ہوتا ہے، حق تعالیٰ بغیر مادہ کے ابتداء اشیاء کو عدم سے وجود بخش دیتے ہیں اور تصویر مادہ سے بنائی جاتی ہے اور اس آیت میں مادۂ طین کا ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی لے کر اس سے پرندہ کی صورت بناتے تھے، یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ خلق یہاں پر ایجاد وتکوین کے معنی میں نہیں بلکہ تصویر کے معنی میں ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی سے پرندے کی صرف شکل وصورت بنا دیتے تھے جیسا کہ کَهَيْئَةِ الطَّيْرِ سے صاف ظاہر ہے، اس میں روح اور جان پیدا کرنا حقیقی پرندہ بنانا یہ حق تعالیٰ کا کام تھا، چنانچہ آگے ارشاد ہے: فَيَكُوْنُ طَيْراً بِإِذْنِ اللّٰهِ ایسے ہی آیت نمبر ۳ و ۴ میں احسن الخالقین کے معنی احسن المصورین و المقدرین ہیں کہ حق تعالیٰ تصویر بنانے والوں میں سے بہترین تصویر بنانے والے ہیں، نہایت مستحکم و مستحسن اور مناسب تصویر بناتے ہیں۔ اور اخیر کی دو آیتوں میں خلق بمعنی ایجاد و تکوین ہے کہ ہر شئے کے مکون و موجد حق تعالیٰ ہیں، اس کے علاوہ اور کوئی مکون و موجد نہیں ہے۔ فاندفع التعارض بين تلك الآيات۔

(روح المعانی، تفسیر خازن، مظہری، ابن کثیر وغیرہ)

❷ دوسرا جواب صرف آیت نمبر ۳ و ۴ احسن الخالقین سے متعلق ہے کہ یہ علی سبیل الفرض کہا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگرچہ نفس الامر میں اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا خالق نہیں ہے لیکن اگر فرض کیا جائے کہ حق تعالیٰ کے علاوہ اور بھی دوسرے خالقین ہیں تو حق تعالیٰ ان سے بہترین خالق ہیں، پس آیت نمبر ۳ و ۴ میں غیر اللہ کو خالق علی سبیل الفرض کہا گیا ہے اور اخیر کی دو آیتوں میں ہر شئے کا خالق حق تعالیٰ کو نفس الامر کے اعتبار سے کہا گیا ہے۔ فلا تعارض بينهما۔ (تفسیر مظہری)

حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام کی تخلیق کس چیز سے ہوئی؟

پارہ نمبر: ۳، ۸، ۱۴، ۱۸، ۲۱، ۲۳، ۲۷

① ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ (پارہ: ۳ رکوع: ۱۴ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۲)

② ﴿قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ﴾

(پارہ: ۸ رکوع: ۹ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۳۰)

③ ﴿وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ﴾ (پارہ: ۲۱ رکوع: ۱۴ سورۂ سجدہ جلالین ص: ۳۴۹)

④ ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ۱۴ سورۂ ص جلالین ص: ۳۸۴) ✦

⑤ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ﴾

(پارہ: ۱۸ رکوع: ۱ سورۂ مؤمنون جلالین ص: ۲۸۷) ✦

⑥ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ﴾

(پارہ: ۱۴ رکوع: ۳ سورۂ حجر جلالین ص: ۲۱۲)

⑦ ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ﴾ (پارہ: ۱۴ رکوع: ۳ سورۂ حجر جلالین ص: ۲۱۲)

⑧ ﴿قَالَ لَمْ أَكُن لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ﴾

(پارہ: ۱۴ رکوع: ۳ سورۂ حجر جلالین ص: ۲۱۳) ✦

⑨ ﴿اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ﴾ (پارہ: ۲۳ رکوع: ۵ سورۂ صافات جلالین ص ۳۷۲) ✦

⑩ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۱ سورۂ رحمٰن جلالین ص: ۴۴۴)

تشریح تعارض

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کس چیز سے ہوئی اس بارے میں آیات متعارض ہیں، پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مطلق مٹی سے پیدا کیا اور آیت نمبر ۵ میں ہے کہ مٹی کے خلاصہ اور جوہر سے پیدا کیا، سلالہ کے معنی کسی شےء سے نکالا ہوا جوہر اور خلاصہ، سللت الشیء من الشیء سے ماخوذ ہے، بمعنی ایک چیز کو دوسری چیز سے نکالنا اور کھینچنا۔ سلالۃ من طین کا مطلب یہ ہوگا کہ مٹی میں سے خالص جوہر نکال کر اس سے آدم علیہ السلام کو بنایا، تفسیر ابوالسعود میں ہے خلق من صفرۃ سُلَّتْ مِنْ طِيْنٍ، صفوۃ کے معنی ہر شےء کا خالص اور عمدہ جزء۔ اور آیت نمبر ۶، ۷ و ۸ میں فرمایا کہ ہم نے انسان کو یعنی آدم علیہ السلام کو بدبودار گارے کی کھن کھن بجنے والی مٹی سے پیدا کیا۔ صلصال کے معنی بجنے والی مٹی، یعنی جب اس پر چٹکی ماری جائے تو اس سے آواز نکلے، حماء کے معنی طین اسود، کالی مٹی یعنی گارا، مسنون کے معنی متغیر اور بدبودار۔ اور آیت نمبر ۹ میں ہے کہ چپکنے والی مٹی سے پیدا فرمایا اور آیت نمبر ۱۰ میں ارشاد ہے کہ انسان (آدم) کو ٹھیکرے کی طرح بجنے والی مٹی سے پیدا کیا، فخار کے معنی آگ میں پکائی ہوئی مٹی یعنی ٹھیکرا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ ان آیات سے اس طرف اشارہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مختلف اطوار و احوال کے ساتھ ہوئی ہے، سب سے پہلے حق

تعالیٰ نے زمین سے مٹی لی، اس کے اندر سے اس کا خلاصہ اور جوہر یعنی خالص اور عمدہ جزء نکالا، اس کو پانی میں گوندھا، جس سے وہ طین لازب چپکنے والی مٹی ہوگئی جیسے آٹا گوندھنے کے بعد ہاتھوں پر چپکنے لگتا ہے، پھر اس کو کچھ عرصہ تک اسی طرح چھوڑے رکھا یہاں تک کہ حمأمسنون بن گئی، یعنی اس کے رنگ و بو میں پیدا ہوگیا، پھر اس سے حضرت آدم علیہ السلام کا پتلہ اور مجسمہ تیار کیا جیسے لوٹا، پیالہ وغیرہ دیگر برتن بنائے جاتے ہیں پھر اس کو ہوا میں سکھا دیا جس سے وہ صلصال کالفخار انتہائی سخت ٹھیکرے کی مانند ہوگیا کہ اگر اس پر چٹکی ماری جائے تو آواز نکلے (یا یوں کہا جائے کہ اس مجسمہ کو سکھا کر آگ میں پکا دیا جس سے وہ ٹھیکرے کی طرح ہوگیا جیسے مٹی کے برتن، سکھانے کے بعد آگ میں پکا کر ان کو پختہ کردیا جاتا ہے)، اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق عناصر اربعہ (مٹی، پانی، ہوا، آگ) سے ہوئی کہ مٹی کو پانی میں ملا کر، ہوا میں سکھا کر آگ میں پکا دیا مگر چونکہ جزء غالب مٹی ہے اس لئے کہہ دیا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے جیسے مٹی کا لوٹا، پیالہ وغیرہ عناصر اربعہ سے بنایا جاتا ہے کہ مٹی کو پانی میں ملا کر برتن کی صورت بنا کر ہوا میں سکھانے کے بعد آگ میں پکایا جاتا ہے مگر جزء غالب مٹی ہونے کی وجہ سے مٹی کا لوٹا، مٹی کا پیالہ کہا جاتا ہے، یہ کوئی نہیں کہتا کہ یہ آگ، پانی، مٹی، ہوا کا لوٹا ہے۔

بہر حال حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مختلف احوال واطوار کے ساتھ ہوئی ہے، پہلی چار آیات میں ابتدائی حالت اور آیت نمبر ۵، ۶، ۷، ۸، و ۹ میں درمیانی حالت اور آیت نمبر ۱۰ میں حالت اخیرہ کو بیان کردیا گیا۔ فلا تعارض بین تلك الآیات۔ (صاوی، جمل وغیرہ)

کافر کی توبہ قبول ہوتی ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۳،۴

آیات

① ﴿لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: ۱۷ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۶) ✦

② ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: ۱۷ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۶)

③ ﴿وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ حَتّٰی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْاٰنَ﴾ (پارہ: ۴ رکوع: ۱۴ سورۂ نساء جلالین ص: ۷۲)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کی توبہ قبول ہوجاتی ہے کیونکہ آیت میں پہلے تو کفار کے لئے عذاب کی وعید سنائی، پھر اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا الخ کہہ کر استثناء فرمایا کہ جو کفار توبہ کر لیتے ہیں اور اپنے عمل کی اصلاح کر لیتے ہیں ان کی حق تعالیٰ مغفرت فرما دیتے ہیں اور ان پر رحم فرماتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کافر کی توبہ قبول ہوجاتی ہے اور آیت نمبر ۲ و ۳ میں لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ اور وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ الخ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کی توبہ قبول نہیں ہوتی، پس بظاہر ان آیات میں تعارض ہے۔

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ پہلی آیت اس صورت پر محمول ہے جب کہ کافر حضور موت اور حالت نزع سے پہلے پہلے توبہ کر لے اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے اور دوسری و تیسری آیت میں مراد یہ ہے کہ جب موت کا وقت آ جائے، نزع کی حالت طاری ہو جائے، عالم آخرت کی چیزیں نظر آنے لگیں اس وقت کافر کفر سے توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی جیسا کہ تیسری آیت میں تصریح ہے حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْآنَ الخ پس قبولیت توبہ کا اثبات قبل حضور الموت پر اور قبولیت کی نفی عند حضور الموت پر محمول ہے۔ فلا تعارض بینهما۔ (حاشیہ جلالین ص:۵٦)

❷ کافر اگر کفر سے توبہ کرے اور اسلام لے آئے تو قبول ہو جاتی ہے لیکن اگر کافر کفر پر رہتے ہوئے اپنے گناہوں سے توبہ کرے تو یہ قبول نہیں ہوتی اس لئے کہ توبہ عن المعاصی کے لئے ایمان شرط ہے جو کافر میں مفقود ہے، پس آیت اولیٰ توبہ عن الکفر پر محمول ہے اور آیت نمبر ۲ و ۳ توبہ عن المعاصی پر محمول ہیں۔ فلا تعارض بینها۔

(مفہوم من بیان القرآن پارہ:۳)

حق تعالیٰ سے کتنا ڈرنا چاہیے؟

پارہ نمبر: ۴، ۲۸

آیات

① ﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ ﴾

(پارہ: ۴ رکوع: ۲ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۷) ✦

② ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا ﴾

(پارہ: ۲۸ رکوع: ۱۶ سورۂ تغابن جلالین ص: ۴۶۳)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں حکم دیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، یعنی اس کی شایان شان اس کی عظمت وجلالت کے لائق تقویٰ اختیار کرو اور دوسری آیت میں فرمایا کہ تم حق تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنی تم میں طاقت ہے، پس دونوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں:

① آیت اولیٰ، آیت ثانیہ سے منسوخ ہے، حق تعالیٰ نے اولاً تو اپنی شایان شان ڈرنے کا حکم دیا ہے مگر چونکہ یہ بات لوگوں پر شاق گزری اس لئے کہ حق تعالیٰ کی شان عظمت وجلالت کے لائق ڈرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ بندہ ہر لمحہ اللہ کی اطاعت میں لگا رہے، ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی اللہ کی نافرمانی نہ کرے، ہر وقت اللہ کا شکر کرتا رہے، کبھی ناشکری نہ کرے، ہر وقت اللہ کا ذکر کرتا رہے، کبھی غافل نہ ہو، اللہ کے

معاملہ میں لومۃ لائم کا بالکل اندیشہ نہ کرے اور ہر چیز میں انصاف کرے، خواہ وہ اپنے یا اپنے باپ اور بیٹے کے خلاف کیوں نہ ہو اور ظاہر ہے کہ اتنا تقویٰ اختیار کرنا بندہ کی طرف سے ناممکن ہے اس کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم حق تقویٰ ادا کرنے کی کوشش کرتے اور پوری پوری رات عبادت میں گزارتے یہاں تک کہ ان کے پاؤں پر ورم آنے لگا، جب لوگوں پر یہ امر شاق گزرا تو حق تعالیٰ نے تخفیف فرمادی اور آیت ثانیہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ نازل فرما کر حکم اول کو منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ جتنی تم میں طاقت ہے اتنا تقویٰ اختیار کرو، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے:

﴿عن سعيدبن جبيرقال: لمانزلت اشتد على القوم العمل، فقاموا حتى ورمت عراقيهم وتقرحت جباههم، فانزل اللّٰه تعالىٰ تخفيفا على المسلمين فاتقوا اللّٰه ما استطعتم، فنسخت الاية الاولى.﴾ (رواہ ابن ابی حاتم۔ روح المعانی)

ترجمہ: ”حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں پر عمل کرنا بھاری ہوگیا، لوگ اللہ کی عبادت میں کھڑے رہتے یہاں تک کہ ان کی رگوں پر ورم آنے لگا، ان کی پیشانیوں پر زخم ہوگئے تو اللہ نے مسلمانوں پر تخفیف فرماتے ہوئے آیت فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ نازل فرمائی، پس پہلی آیت منسوخ ہوگئی۔“

بہت سے حضرات نے اس آیت کے متعلق نسخ ہی کا دعویٰ کیا ہے، حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سورت میں اس آیت کے علاوہ کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے نسخ کا دعویٰ کیا جائے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی نسخ کے قائل ہیں، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، قتادہ، ابن زید، اور علامہ سدی رحمۃ اللہ علیہم سے بھی یہی مروی ہے یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک

روایت ہے ولا تعارض بعد النسخ۔ (روح المعانی، خازن، مظہری)

❷ حَقَّ تُقَاتِهٖ میں "حق" حَقَّ الشَّیْءُ بمعنی ثبت و وجب سے ماخوذ ہے اور حق کی اضافت "تقاتہ" کی طرف اضافۃ الصفۃ الی الموصوف کے قبیل سے ہے، اصل اس کی یہ ہے کہ اتقوا اللّٰه اتقاء حقاً ای ثابتا واجباً یعنی اللہ سے اتنا ڈرو جتنا ڈرنا اللہ کی طرف سے تم پر واجب ہے اور ڈرنا کتنا واجب ہے اس کو حق تعالیٰ نے دوسری آیت میں بیان کردیا فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ کہ "تم پر حسب استطاعت تقویٰ واجب ہے" پس بقدر طاقت تم اللہ سے ڈرتے رہو، آیت ثانیہ آیت اولیٰ کا بیان ہے۔ پس کوئی تعارض نہیں ہے۔ (روح المعانی)

❸ فَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ کفر و شرک اور امور اعتقادیہ سے متعلق ہے اور فاتقوا اللّٰه ما استطعتم کا تعلق اعمال سے ہے، مطلب یہ ہے کہ کفر و شرک اور امور اعتقادیہ میں تو حق تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنا حق ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کو واحد مانو، کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ، اس کو ذات و صفات میں تمام عیوب و نقائص سے منزہ اور مقدس مانو، اور اعمال میں حسب استطاعت تقویٰ اختیار کرو، اگر وضو کی طاقت نہ ہو تو تیمم کرلیا کرو، اگر قیام پر قدرت نہ ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھ لیا کرو، اس توجیہ کو علامہ زرکشی نے البرہان میں شیخ ابوالحسن شاذلی سے نقل کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے الفوز الکبیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ (الروض النضیر شرح الفوز الکبیر)

❹ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ کا مطلب یہ ہے کہ تمام معاصی سے اجتناب کرو۔ اب یہ آیت نہ تو دوسری آیت سے منسوخ ہوگی کیونکہ جمیع معاصی سے اجتناب کے حکم کو منسوخ کرنے کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ بعض معاصی کے کرنے کی اجازت دی جارہی ہے حالانکہ یہ باطل ہے اور نہ ہی یہ آیت دوسری آیت کے معارض ہوگی اس لئے کہ تمام معاصی سے بچنا انسان کی طاقت سے باہر نہیں، پس جو آدمی صلاح و عفت کے ساتھ زندگی گزارے، معاصی سے اجتناب کرتا رہے اس نے اتقوا اللّٰه حق تقاتہ

اور فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم دونوں آیتوں پر عمل کرلیا اور دونوں آیتوں کا مفہوم اس صورت میں متحد ہوگیا۔ فلا تعارض بینہما۔ (تفسیر کبیر)

۵ ابن عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلی آیت مقربین رحمہم اللہ کے حق میں ہے اور دوسری آیت ابرار کے حق میں ہے، حضرات مقربین رحمہم اللہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ وجود مجازی سے نکل کر وجود حقیقی کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں، حق تعالیٰ کے علاوہ ان کو کسی شئے کا وجود نظر نہیں آتا اور وہ لوگ لاموجود الا اللّٰہ کا نعرہ لگاتے ہیں، یہی حق تقویٰ ہے جو مقربین حضرات رحمہم اللہ ادا کرتے ہیں، پس آیت اولیٰ میں مقربین رحمہم اللہ کو خطاب ہے کہ تم لوگ حق تقویٰ ادا کرو، اور آیت ثانیہ میں ابرار عوام الناس کو خطاب ہے کہ تم لوگ بقدر وسعت و طاقت اللہ سے ڈرو، حق تقویٰ تم سے ادا نہیں ہوسکتا۔ فاندفع التعارض بینہما۔ (الروض النضیر مع زیادۃ)

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی امداد کے لئے کتنے فرشتے بھیجے گئے؟

پارۂ نمبر: ۴، ۹

آیات

① ﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ﴾ (پارہ: ۴ رکوع: ۴ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۹، ۶۰) ✦

② ﴿يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ﴾ (پارہ: ۴ رکوع: ۴ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۶۰) ✦

③ ﴿فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ﴾ (پارہ: ۹ رکوع: ۱۵ سورۂ انفال جلالین ص: ۱۴۸)

تشریحِ تعارض

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد کم اور مشرکین کی تعداد زیادہ تھی، حق تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد فرمائی تھی لیکن فرشتوں کی تعداد کی متعلق آیات مختلف ہیں، پہلی آیت میں ہے کہ تین ہزار فرشتوں کو بھیج کر مدد فرمائی، دوسری آیت میں ہے کہ پانچ ہزار فرشتوں کے ذریعہ مدد فرمائی اور تیسری آیت میں ایک ہزار فرشتوں کا ذکر ہے، پس بظاہر ان میں تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو ایک ہزار فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا، پھر

رفتہ رفتہ فرشتوں کی تعداد میں اضافہ فرما دیا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے جب دیکھا کہ مشرکین ایک ہزار کی تعداد میں ہیں اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم صرف تین سو ہیں، تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے قبلہ رو ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی اے اللہ! آپ نے مجھ سے نصرت کا وعدہ کر رکھا ہے وہ پورا فرما دیجئے، اے اللہ! اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو روئے زمین پر کوئی تیری عبادت کرنے والا نہیں رہے گا۔ نہایت الحاح و زاری کے ساتھ آپ یہ دعا کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کی چادر مبارک آپ کے شانۂ مبارک سے نیچے گر گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اٹھا کر آپ کے شانۂ مبارک پر ڈالی اور پیچھے کی طرف سے آ کر آپ سے چمٹ گئے اور عرض کیا اے اللہ کے نبی، آپ کا حق تعالیٰ سے دعا کر لینا کافی ہے (آپ فکر نہ کریں)، اب حق تعالیٰ وعدہ ضرور پورا فرمائیں گے۔ چنانچہ دعا قبول ہوئی اور ایک ہزار فرشتے بھیجنے کا وعدہ فرمایا کہ یکے بعد دیگرے ایک ہزار فرشتے آئیں گے، اسی کو سورۂ انفال کی آیت میں فرمایا گیا: فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام پانچ سو فرشتوں کے ساتھ نازل ہوئے اور مسلمانوں کے لشکر کے دائیں حصہ میں جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے شریک ہو کر قتال کیا اور پانچ سو فرشتے حضرت میکائیل علیہ السلام لے کر نازل ہوئے انہوں نے لشکر کے بائیں حصہ میں جس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے شامل ہو کر قتال کیا، اس کے بعد مسلمانوں کی خبر ملی کہ مشرکین کی امداد کے لئے اور لوگ آرہے ہیں، چنانچہ ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ اور ابن منذر رحمہ اللہ وغیرہ نے حضرت امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ مسلمانوں کو غزوۂ بدر میں یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کی امداد کا ارادہ رکھتا ہے، اس سے مسلمانوں کو بے چینی ہوئی، حق تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی: اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ

الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ۔ جس میں تین ہزار فرشتے امداد کے لئے بھیجنے کا وعدہ فرمایا، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اگر کفار نے ایک دم حملہ کردیا اور تم لوگ صبر وتقویٰ پر ثابت قدم رہے تو حق تعالیٰ پانچ ہزار فرشتے خاص نشانی کے ساتھ بھیج کر امداد فرمادیں گے، چنانچہ سفید عمامہ باندھے ہوئے فرشتے نازل ہوئے اور مسلمانوں کا تعاون کیا اور حق تعالیٰ نے اس طرح مسلمانوں کو نصرت عطا فرمائی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اولاً ایک ہزار فرشتے نازل ہوئے، پھر دو ہزار فرشتے اور آئے، کل تین ہزار ہوگئے، پھر دو ہزار اور بھیجے گئے، کل پانچ ہزار ہوگئے، حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے یہی مروی ہے، بعض یہ کہتے ہیں کہ اولاً ایک ہزار آئے، پھر مزید تین ہزار آئے، پھر ان کے علاوہ پانچ ہزار آئے، کل تعداد نو ہزار ہوگئی اور اگر اس امداد کو غزوۂ احد کے واقعہ پر محمول کیا جائے تو کل تعداد آٹھ ہزار ہوتی ہے کیونکہ غزوۂ احد میں ایک ہزار والی پہلی امداد کا ذکر نہیں ہے۔ کما فی الخازن، اور روح المعانی میں جو تعداد کا مجموعہ آٹھ ہزار مذکور ہے وہ غزوۂ احد پر محمول کرنے کی صورت میں ہے، بہرحال اس تفصیل کے بعد ان آیات میں کوئی تعارض نہیں رہا۔

(روح المعانی، خازن، صاوی، تفسیر ابوالسعود، بیان القرآن، جمل وغیرہ)

تمام گناہوں کی مغفرت ہوگی یا بعض کی؟

پارہ نمبر: ۴، ۵، ۶، ۲۰، ۲۴، ۲۶، ۳۰

① ﴿ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (پارہ: ۴ رکوع: ۴ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۶۰)

② ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾

(پارہ: ۵ رکوع: ۱۵ سورۂ نساء جلالین ص: ۸۷)

③ ﴿ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (پارہ: ۶ رکوع: ۷ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۹۷)

④ ﴿ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾

(پارہ: ۶ رکوع: ۱۰ سورۂ مائدۃ جلالین ص: ۱۰۰)

⑤ ﴿ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴾

(پارہ: ۲۰ رکوع: ۱۴ سورۂ عنکبوت جلالین ص: ۳۳۶)

⑥ ﴿ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۱۰ سورۂ فتح جلالین ص: ۴۲۴) ✦

⑦ ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾

(پارہ: ۲۴ رکوع: ۳ سورۂ زمر جلالین ص: ۳۸۹)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شرک کے علاوہ جن گناہوں کو چاہیں گے معاف فرمادیں گے، جن پر چاہیں گے عذاب دیں گے، مطلب یہ ہے کہ

تمام گناہوں کی مغفرت ضروری نہیں ہے بلکہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، وہ عذاب دینا چاہیں گے تو عذاب بھی دیں گے اور آیت نمبر ۷ میں ارشاد ہے کہ اے حد سے تجاوز کرنے والو! میرے گنہگار بندو! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ تمام گناہوں کی مغفرت فرمادیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام گناہوں کی مغفرت یقینی ہے کسی گناہ پر عذاب نہیں ہوگا، پس یہ آیت پہلی چھ آیتوں کے بظاہر معارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

(۱) پہلی چھ آیات قبل التوبہ پر محمول ہیں اور ساتویں آیت بعد التوبہ پر محمول ہے، مطلب یہ ہے کہ آدمی اگر گناہوں سے توبہ کئے بغیر مر گیا اگر وہ مشرک ہے تو اس کی مغفرت نہیں ہوگی اور اگر مؤمن عاصی ہے تو اس کے گناہوں کا مسئلہ حق تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے اگر چاہیں گے تو معاف فرمادیں گے، چاہیں گے تو عذاب دے دیں گے اور اگر کافر اپنے کفر و شرک سے توبہ کر لیتا ہے اور مشرف بہ اسلام ہوجاتا ہے تو حالت کفر میں کئے ہوئے تمام معاصی معاف ہوجاتے ہیں "ان الاسلام یھدم ما کان قبلہ" اور اگر مؤمن عاصی ہے اور وہ اپنے تمام گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے اور اس کی توبہ شرائط صحت پر پوری اترتی ہے تو حق تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں، کسی گناہ پر عذاب نہیں دیں گے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (جمل)

(۲) آیت نمبر ۷ میں اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا مقید ہے لمن یشآء کی قید کے ساتھ، قرینہ اس کا یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں اس کی تصریح وارد ہوئی ہے، پس اس آیت میں بھی پہلی چھ آیات کی طرح مغفرت، اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (روح المعانی)

جنت پیدا شدہ ہے یا قیامت کے بعد پیدا کی جائے گی؟

پارہ نمبر: ۴، ۲۰، ۲۷

آیات

① ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (پارہ: ۴ رکوع: ۵ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۶۰)

② ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۹ سورۂ حدید جلالین ص: ۴۵۱) ✦

③ ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا﴾ (پارہ: ۲۰ رکوع: ۱۲ سورۂ قصص جلالین ص: ۳۳۴)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ا و ۲ میں جنت کے متعلق اُعِدَّتْ صیغۂ ماضی استعمال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت پیدا کی جا چکی ہے جیسا کہ اہل سنت والجماعت رحمہم اللہ کا مسلک ہے اور آیت نمبر ۳ میں جنت کے متعلق ارشاد ہے کہ یہ آخرت کا گھر ہم اس کو ان لوگوں کے لئے بنائیں گے جو زمین میں تکبر اور فساد کا ارادہ نہیں رکھتے، اس میں نَجْعَلُهَا مضارع کا صیغہ ہے جو اس بات پر دال ہے کہ جنت ابھی پیدا نہیں کی گئی ہے بلکہ قیامت کے بعد پیدا کی جائے گی جیسا کہ معتزلہ کا مسلک ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ صیغۂ مضارع فقط استقبال ہی کے لئے نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ حقیقۃً تو حال کے لئے ہے اور مجازاً استمرار کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے جس میں ماضی، حال و استقبال تینوں داخل ہیں جیسے **يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَمَافِي الْاَرْضِ** میں **یسبح** صیغۂ مضارع استمرار کے لئے مستعمل ہے، ایسے ہی نجعلها میں صیغہ مضارع استمرار کے لئے ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جنت پیدا کی جا چکی ہے اور اب بھی موجود ہے، آئندہ بھی موجود رہے گی، پس یہ آیت اُعِدَّتْ والی آیتوں کے معارض نہیں ہے۔

(النبراس)

❷ نجعلها میں جعل خلق کے معنی میں مستعمل نہیں ہے جو متعدی بیک مفعول ہوتا ہے بلکہ یہ تملیک کے معنی میں ہے جو متعدی بدو مفعول ہوتا ہے، مفعول اول "ها" ضمیر ہے اور مفعول ثانی للذین الخ ہے، معنی یہ ہوں گے کہ ہم مالک بنادیں گے جنت کا ان لوگوں کو جو زمین میں تکبر و فساد نہیں کرتے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جنت اسی وقت پیدا کی جائے گی بلکہ جنت تو پہلے ہی پیدا کی جا چکی ہے، البتہ اب تک اہل جنت کو جنت کا مالک نہیں بنایا گیا ہے، قیامت کے بعد مالک بنایا جائے گا، پس مضارع استقبال کے معنی میں ہونے کے باوجود یہ آیت پہلی دونوں آیتوں کے معارض نہیں رہی۔ (النبراس)

مؤمنین کے لئے آخرت میں رسوائی ہوگی یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۴، ۲۸

① ﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ﴾

(پارہ: ۴ رکوع: ۱۱ سورۃ آل عمران جلالین ص: ۶۷)

② ﴿يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِىَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾

(پارہ: ۲۸ رکوع: ۲۰ سورۃ تحریم جلالین ص: ۴۶۶)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ جس کو بھی جہنم میں داخل فرمائیں گے اس کو رسوا اور ذلیل فرمائیں گے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جن گنہ گار مؤمنین کو حق تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق جہنم میں داخل کریں گے وہ بھی رسوا اور ذلیل ہوں گے اور دوسری آیت میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ اور مؤمنین کو رسوا نہیں فرمائیں گے، پس دونوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے چار جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں ادخال فی النار سے مراد ہمیشہ کے لئے داخل کرنا ہے، یعنی حق تعالیٰ جس کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل کریں گے اس کو رسوا فرمائیں گے اور ہمیشہ کے لئے داخل ہونے والے کفار ہیں، پس یہ آیت کفار کے متعلق ہے کہ یہ لوگ جہنم میں رسوا اور ذلیل ہوں گے اور دوسری آیت مؤمنین کے لئے ہے کہ ان کو رسوائی اور

ذلت نہیں ہوگی، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سعید بن المسیب، قتادہ، اور ابن جریج رحمہم اللہ تعالیٰ سے یہی منقول ہے اور اختلاف اشخاص کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔

(صاوی، روح المعانی)

❷ اختلاف اشخاص ہی پر محمول ہے بایں طور کہ آیت ثانیہ میں **آمنوا معه** سے مراد صحابہ ہیں کہ جو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے ان کو آپ کی معیت اور صحبت نصیب ہوئی ان کو رسوا نہیں فرمائیں گے اور آیت اولیٰ میں کفار اور عصاۃِ مؤمنین مراد ہیں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (روح المعانی)

❸ آیتِ ثانیہ میں دائمی رسوائی کی نفی مقصود ہے کہ حق تعالیٰ مؤمنین کو ہمیشہ کے لئے رسوا نہیں کریں گے، اگر بعض عصاۃِ مؤمنین کو جہنم میں داخل کر کے رسوائی ملے گی تو وہ ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگی، بلکہ ایک عرصہ تک عذاب ہونے کے بعد جہنم سے نکال کر جنت میں بھیج دیا جائے گا اور رسوائی سے نجات مل جائے گی، پس آیت اولیٰ میں اثبات مؤمنین کے حق میں خزیِ غیر دائمی کا ہے اور آیتِ ثانیہ میں نفی خزی دائمی کی ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (روح المعانی)

❹ لفظ اخزاء مشترک ہے دو معنی کے درمیان ایک تخجیل (شرمندہ کرنا) دوسرے اہلاک (ہلاک کر دینا) آیت اولیٰ میں اثباتِ اخزاء بمعنی **تخجیل** کا ہے اور آیت ثانیہ میں نفیِ اخزاء بمعنی اہلاک ہے، مطلب یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ عصاۃ مؤمنین کو شرمندہ تو فرمائیں گے مگر ہلاک نہیں کریں گے، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں، جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں۔ **فلا تعارض بينهما**۔ (روح المعانی)

انسان اپنی ازواج متعددہ کے مابین عدل ومساوات کرسکتا ہے یا نہیں؟

پارۂ نمبر: ۴، ۵

آیات

① ﴿ فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ﴾ (پارہ:۴ رکوع:۱۲ سورۂ نساء جلالین ص:۶۹) ✦

② ﴿ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ﴾

(پارہ:۵ رکوع:۱۶ سورۂ نساء جلالین ص:۸۸)

تشریح تعارض

اللہ جل شانہ نے مرد کو ایک سے لے کر چار عورتوں تک سے شادی کرنے کی اجازت دی ہے، اس کے ساتھ ساتھ بیویوں کے مابین عدل و مساوات قائم کرنا واجب قرار دیا اور یہ بھی فرمایا: فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً یعنی (اگر تمہیں یقین ہے کہ متعدد بیویوں کے مابین عدل و مساوات قائم کرسکو گے تو متعدد عورتوں سے نکاح کی اجازت ہے) اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ ان کے مابین عدل و انصاف نہیں ہو سکے گا تو صرف ایک عورت سے شادی کرو، متعدد عورتوں سے نکاح کی اجازت نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر چاہے تو متعدد بیویوں کے مابین عدل و انصاف کر سکتا ہے، پس اگر عدل کر سکے تو متعدد شادیاں کرے، ورنہ ایک کی اجازت ہے متعدد کی نہیں، اور آیت ثانیہ میں قطعی طور پر فرما دیا گیا کہ تم متعدد عورتوں کے درمیان ہرگز عدل و مساوات نہیں کر سکتے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ متعدد شادیاں کرنے کے مطلق اجازت نہیں ہے، فقط ایک سے شادی کرے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض

ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ آیت اولیٰ میں ان امور میں مساوات مراد ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں جیسے نان ونفقہ میں مساوات کرنا، رات گزارنے میں برابری کرنا وغیرہ کہ ان امور میں عدل ومساوات بین النساء واجب ہے، اگر ان چیزوں میں مساوات کرنے کا یقین ہے تو متعدد شادیاں کرسکتا ہے اور اگر عدم مساوات کا اندیشہ ہے تو تعدد کی اجازت نہیں فقط ایک شادی کرے اور آیت ثانیہ میں جو مساوات پر قدرت کی نفی کی گئی ہے یہ امور غیر اختیاریہ کے بارے میں ہے جیسے محبت اور قلبی میلان اور جماع کرنا، چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبیدہ سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد لَنْ تَسْتَطِيعُوا ذٰلِكَ فِي الْحُبِّ وَالْجِمَاعِ ہے، ابن منذر نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت جماع کے بارے میں ہے، ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن رحمہ اللہ سے اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ محبت سے متعلق ہے، ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے ابو ملیکہ سے نقل کیا ہے کہ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں نازل ہوئی کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بہ نسبت دیگر ازواج مطہرات کے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ محبت رکھتے تھے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے:

﴿كان النبي صلى الله تعالىٰ عليه وآله وسلم يقسم بين نسائه، فيعدل، ثم يقول: اللهم هذا قسمي فيما املك، فلاتلمني فيما تملك ولا املك. يعني القلب (اي عني رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وآله وسلم بما تملك

المحبة وميل القلب الغير الاختياري﴾

(رواہ احمد ابوداؤد والترمذی وغیرہم۔ روح المعانی ۵/۱۶۳)

ترجمہ: ''نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اپنی عورتوں کے درمیان تقسیم کرتے تو عدل فرماتے تھے، پھر ارشاد فرماتے کہ اے اللہ یہ میری تقسیم ہے اس چیز میں جس کا میں مالک ہوں، پس جس چیز کا تو مالک ہے اور میں مالک نہیں ہوں یعنی قلبی محبت، سو اس میں (اگر مجھ سے کچھ کمی بیشی ہوجائے) تو مجھے ملامت نہ فرمانا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ماتملک سے محبت اور قلب کا غیر اختیاری میلان مراد لیا ہے۔''

بہر حال محبت، جماع اور قلبی میلان میں مساوات کرنا انسان کے اختیار کی بات نہیں، اس میں انسان مجبور و معذور ہوتا ہے، اس کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا: ''وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ.'' کہ تم غیر اختیاری امور میں مساوات نہیں کر سکتے یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے، پس متعدد بیویوں میں سے اگر قلبی میلان کسی ایک کی طرف ہوجائے تو کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، البتہ اس کا ضرور خیال رکھو کہ دوسری عورت کو بالکل نظر انداز نہ کردو: ''فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ'' ایک ہی کی طرف بالکل مائل نہ ہو جاؤ کہ بیچاری دوسری کو معلق کرکے چھوڑ دو، وہ نہ ادھر کی رہے نہ ادھر کی، کہ شوہر نہ تو اس کو طلاق ہی دیتا ہے کہ جس سے وہ دوسری جگہ شادی کرے اور نہ اس کی خبر گیری اور خیال رکھتا ہے، بلکہ تم کو چاہئے کہ قلبی محبت و میلان ایک طرف ہونے کے باوجود نان ونفقہ وشب باشی سب کا برابر خیال رکھو، پس ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

(روح المعانی، ومعارف القرآن)

رازق صرف اللہ ہے یا بندے بھی رازق ہیں؟

پارۂ نمبر: ۴، ۷، ۱۷، ۲۲، ۲۷

① ﴿وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا﴾

(پارہ: ۴ رکوع: ۱۲ سورۂ نساء جلالین ص: ۶۹)

② ﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا﴾ (پارہ: ۴ رکوع: ۱۲ سورۂ نساء جلالین ص: ۷۰)

③ ﴿وَارْزُقْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ﴾ (پارہ: ۷ رکوع: ۵ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۱۱۰)

④ ﴿وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ﴾ (پارہ: ۱۷ رکوع: ۱۵ سورۂ حج جلالین ص: ۲۸۴)

⑤ ﴿وَمَا أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۱۱ سورۂ سبأ جلالین ص: ۳۶۲) ✦

⑥ ﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۲ سورۂ ذاریات جلالین ص: ۴۳۴)

تشریح تعارض

پہلی دو آیتوں میں "ارزقوهم" کہہ کر رزق عطا کرنے کی نسبت بندوں کی طرف کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے بھی رزق عطا کرتے ہیں، اسی طرح آیت نمبر ۳، ۴ و ۵ میں حق تعالیٰ کی صفت خیر الرزاقین بیان کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ رزق دینے والوں میں سے بہتر رزق عطا کرنے والے ہیں، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے علاوہ بندے بھی رازق ہیں، خلاصہ یہ ہوا کہ ان پانچوں آیتوں

میں صفت رَازقیت حق تعالیٰ اور بندوں کے درمیان عام کردیا گیا ہے اور آیت نمبر ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ رازقیت حق تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے کیونکہ اِنَّ کے اسم وخبر کے درمیان ہو ضمیر لائی گئی ہے جو حصر واختصاص پر دال ہوتی ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہورہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ رازقیت کا عموم بین اللہ والعباد ایصال کے اعتبار سے ہے اور اختصاص للہ خلق کے اعتبار سے ہے، یعنی رزق پیدا کرنے والے تو صرف حق تعالیٰ ہیں بندے نہیں اور رزق پہنچانے والے اللہ بھی ہیں اور بندے بھی، بندہ بھی اللہ کی پیدا کی ہوئی اور عطا کی ہوئی رزق میں سے دوسروں تک رزق پہنچاتا ہے، کہا جاتا ہے فلان یرزق عائلته "فلاں شخص اپنے بال بچوں کو رزق دیتا ہے" یعنی ان کے لئے رزق کماتا ہے اور ان کو پہنچاتا ہے، ان کو کھلاتا پلاتا ہے، بہرحال جہت خلق و ایصال کا فرق ہونے کے بعد تعارض نہیں رہا۔ (صاوی، جمل وغیرہ)

❷ عموم رازقیت کا ہے اور اختصاص رزاقیت کا ہے، یعنی رازق تو حق تعالیٰ بھی ہیں اور بندے بھی، البتہ رزّاق صرف حق تعالیٰ ہیں۔ رزّاق مبالغہ کا صیغہ ہے بمعنی تمام مخلوق کو رزق عطا کرنے والا اور بہت زیادہ رزق دینے والا اور ظاہر ہے کہ یہ صفت حق تعالیٰ کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ (صاوی)

زنا کاری کی سزا کیا ہے؟

پارہ نمبر: ۴، ۱۸

آیات

① ﴿ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآءِ كُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴾ (پارہ:۴ رکوع:۱۴ سورۂ نساء جلالین ۷۲) ✦

② ﴿ لَذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ﴾

(پارہ:۴ رکوع:۱۴ سورۂ نساء جلالین ۷۲) ✦

③ ﴿ اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾

(پارہ:۱۸ رکوع:۷ سورۂ نور جلالین ۲۹۴)

تشریح تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زانیہ عورت کا زنا جب چار گواہوں کے ذریعے ثابت ہو جائے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو گھر میں روک لیا جائے، باہر نکلنے نہ دیا جائے یہاں تک کہ وہ مر جائے یا اس کے لیے اللہ کوئی اور راستہ نکال دے اور آیت نمبر ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا کرنے والے مرد و عورت کی سزا یہ ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائی جائے (یعنی اس کو شرمندہ کیا جائے اور پٹائی کی جائے) اگر وہ توبہ کر لیں اور اپنا عمل درست کر لیں تو ان کو چھوڑ دیا جائے، کوئی سزا نہ دی جائے اور آیت نمبر ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ زانی اور زانیہ (اگر غیر شادی شدہ ہوں تو ان) کے ۱۰۰/۱۰۰ کوڑے مارے جائیں، پس ان تینوں آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

(۱) دوسری آیت پہلی آیت سے منسوخ ہے، پھر پہلی آیت تیسری آیت سے منسوخ ہوچکی ہے، چنانچہ حضرت حسن رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے زنا کی سزا ایذا رسانی نازل ہوئی کہ جو مرد وعورت زنا کرلیں ان کو تکلیف پہنچاؤ، ایذا کی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تعییر اور ضرب بالنعال کے ساتھ منقول ہے کہ ان کو شرمندہ کرو (مثلاً یوں کہو کہ تمہیں زنا کرتے ہوئے شرم نہیں آئی، خدا کا خوف نہیں آیا؟ تم نے بہت بری حرکت کی ہے، وغیرہ وغیرہ) اور جوتوں سے پٹائی کرو، حضرت قتادہ، مجاہد اور سدی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ایذا کی تفسیر فقط تعییر اور توبیخ کے ساتھ کی ہے کہ ان کو شرم دلاؤ اور ڈانٹو۔ اس کے بعد یہ آیت منسوخ ہوگئی اور آیت اولیٰ والتی یاتین الفاحشة الخ نازل ہوئی، جس میں زنا کی سزا امساک فی البیوت بیان فرمائی کہ جو عورت زنا کرے اس کو گھر میں قید کردو، باہر نہ نکلنے دو یہاں تک کہ اس کو موت آجائے یا اللہ کوئی دوسرا حکم نازل فرمادیں، اس لئے کہ عورت عام طور سے زنا میں جو مبتلا ہوتی ہے وہ باہر نکلنے اور مردوں کے سامنے آنے کی وجہ سے ہوتی ہے، جب وہ گھر میں محبوس رہے گی تو زنا کاری سے بچی رہے گی، پھر یہ حکم بھی منسوخ ہوگیا اور دوسرا حکم نازل ہوگیا، چنانچہ سورۂ نور کی آیت اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ نازل ہوئی کہ زانی اور زانیہ کے (جب کہ وہ غیر شادی شدہ ہوں) ۱۰۰/۱۰۰ کوڑے لگاؤ، ولاتعارض بعد النسخ۔ (مدارک، مظہری وغیرہ)

(۲) ابو مسلم اصفہانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پہلی آیت سحاقات کے بارے میں ہے سحاقات وہ عورتیں کہلاتی ہیں، جو آپس میں ایک عورت دوسری عورت سے استمتاع کرکے اپنی شہوت پوری کرلیتی ہیں ان عورتوں کی سزا یہ بیان فرمائی کہ ان کو گھروں میں روک لو، مراد یہ ہے کہ ایسی عورتوں کا آپس میں اختلاط نہ ہونے دو، ان کے

درمیان تفریق اور جدائی کر کے ان کو اپنے اپنے گھروں میں محبوس کر دو، ایک کو دوسری کے پاس جانے نہ دو اور آیت نمبر ۲ لواطت کرنے والے مردوں کے بارے میں ہے، ان کی سزا یہ بیان کی کہ ان کو ایذا رسانی کرو، ان کم بختوں کو شرم دلاؤ اور ان کی پٹائی کرو اور تیسری آیت زنا کرنے والوں کے بارے میں ہے کہ ان کی سزا سو کوڑے لگانا ہے (اور اگر شادی شدہ ہوں تو رجم کرنا ہے جیسا کہ آیت منسوخۃ التلاوۃ "اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ اِذَازَنَیَا فَارْجِمُوْ ھُمَا اَلْبَتَّۃَ نَکَالًا مِّنَ اللّٰہِ" ہے، نیز حدیث سے ثابت ہے) اور جب تینوں آیتوں کا مصداق جدا جدا ہے، تو کوئی تعارض نہیں رہا۔

(تفسیر کبیر، روح المعانی)

۳ ابو سلیمان خطابی رحمۃ اللہ علیہ معالم السنن میں فرماتے ہیں کہ آیت اولیٰ منسوخ نہیں ہے بلکہ یہ تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورتوں کا گھروں میں مقید کرنا اس وقت تک ممتد ہے جب تک کہ اللہ ان کے بارے میں کوئی اور راستہ نکال دے، مطلب یہ ہے کہ ابھی ان عورتوں کو گھروں میں روکے رکھو، ہم ان کے بارے میں عنقریب کوئی سبیل نکالیں گے، اب وہ سبیل کیا ہے اس کو مجمل رکھا گیا، پھر حق تعالیٰ نے آیت نور "الزانیۃ والزانی الخ" نازل فرما کر اس سبیل کو بیان کر دیا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "خذوا عنی، خذوا عنی قد جعل اللّٰہ لھن سبیلاً۔ (رواہ مسلم)

پس آیت نور اور یہ حدیث، آیت اولیٰ کے اجمال کا بیان ہے، نہ کہ ناسخ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی الفوز الکبیر میں اسی کو اختیار کیا ہے، اور اجمال کے بعد بیان کر دینے کو تعارض نہیں کہا جاتا، مگر اس پر سوال یہ ہے کہ پہلی آیت میں امساك فی البیوت اور دوسری آیت میں ایذا کا حکم ہے ان میں تطبیق کیسے ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امساک فی البیوت ثیبہ کے بارے میں ہے اور ایذا باکرہ کے حق میں ہے۔ (مظہری، روح المعانی، خازن، الفوز الکبیر)

وراثت اقرباء کے لئے ہے یا مولی الموالاۃ کے لئے؟

پارہ نمبر: ۵، ۱۰، ۲۱

آیات

① ﴿وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا﴾ (پارہ: ۵ رکوع: ۲ سورۂ نساء جلالین ص: ۷۵) ✦

② ﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (پارہ: ۱۰ رکوع: ۶ سورۂ انفال جلالین ص: ۱۵۴)

③ ﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهَاجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْا اِلٰى اَوْلِيَآئِكُمْ مَعْرُوْفًا﴾

(پارہ: ۲۱ رکوع: ۱۷ سورۂ احزاب جلالین ص: ۳۵۱)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ میں ارشاد ہے کہ جن لوگوں سے تمہارے معاہدے ہو چکے ہیں ان کو میراث کا حصہ دو، یعنی اجنبی لوگ جو ایک دوسرے کے رشتہ دار نہ ہوں اگر آپس میں یہ معاہدہ کرلیں کہ ہم ایک دوسرے کے مددگار رہیں گے، اگر ہم میں سے کسی پر کوئی دیت واجب ہوگی تو دوسرا اس کو ادا کردے گا، اگر ہم میں سے کوئی مر گیا تو دوسرا اس کے مال کا وارث ہو جائے گا ایسے معاہدہ کرنے والے شخص کو مولی الموالاۃ کہا جاتا ہے، ایسی صورت میں شرعی حکم آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مابین وراثت جاری ہوگی، ان کو میراث کا حصہ دیا جائے گا اور اخیر کی دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ

وراثت رشتہ داروں میں جاری ہوتی ہے، آدمی کے مرنے کے بعد اس کے مال کی میراث اس کے اقرباء میں تقسیم کی جائے گی، جس کی تفصیل آیات میراث میں موجود ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ آیت نمبرا، اخیر کی دونوں آیتوں سے منسوخ ہے، زمانہ جاہلیت میں لوگ آپس میں اس طرح کا معاہدہ کرلیا کرتے تھے اور ان میں وراثت جاری ہوتی تھی، ابتداء اسلام میں جب تک اکثر لوگوں کے رشتہ دار مسلمان نہیں ہوئے تھے یہی حکم رہا کہ مرنے والے کی ساری میراث اس کے معاہدہ کرنے والے حلیف کو دیدی جاتی تھی، جب اکثر لوگ مسلمان ہوگئے تو کچھ ترمیم فرمادی کہ حلیف کو ساری میراث تو نہیں البتہ مال کا چھٹا حصہ دیدیا کرو، اسی کو آیت نمبرا میں بیان کیا گیا ہے، پوری آیت اس طرح ہے "وَلِكُلٍّ جَعَلْنَامَوَالِيَ مِمَّاتَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ" کہ ہم نے ہر شخص کے لئے اس کے والدین اور رشتہ داروں کے ترکہ میں وارثین مقرر کردیئے ہیں اور جن لوگوں کے ساتھ تمہارے پہلے سے معاہدے ہوچکے ہیں ان کو ان کا حصہ یعنی سدس مال دیدیا کرو، نصیب سے مراد سدس (چھٹا حصہ) ہے، پھر دوسری اور تیسری آیت نازل فرما کر مولی الموالاۃ کے حصہ کو بالکل ہی منسوخ کردیا گیا۔ (من بیان القرآن)

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی کے قریب قریب نقل کیا ہے:

﴿عن قتادة قال: كان الرجل يعاقدالرجل في الجاهلية، فيقول: دمي دمك، وهدمي هدمك، ترثني وأرثك، وتطلب بي و أطلب

بك، فجعل له السدس من جميع المال في الاسلام، ثم يقسم اهل الميراث ميراثهم، فنسخ ذلك بعد في سورة الانفال بقوله سبحانه وتعالىٰ: واولوا الارحام بعضهم اولى ببعض في كتاب الله.﴾ (اخرجہ ابن جریر وغیرہ۔ روح المعانی ۵/۲۲)

ترجمہ: ''حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک شخص دوسرے شخص سے معاہدہ کر لیتا تھا کہ اگر کسی نے میرا خون کر دیا تو سمجھو تمہارا خون کر دیا اور میری آبرو ریزی کی تو سمجھو تمہاری عزت پر دھبہ لگایا، تم میرے وارث رہو گے میں تمہارا وارث بنوں گا، تم میرے خون کا مطالبہ کرنا میں تمہارے خون کا مطالبہ کروں گا، اسلام میں ایسے شخص کو میت کے جمیع مال میں سے چھٹا حصہ دیا جاتا تھا، پھر باقی مال میں سے اہل میراث کو ان کی میراث تقسیم کی جاتی تھی، اس کے بعد سورۂ انفال کی آیت: وَأُوْلُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلٰى بِبَعْضٍ الآية سے یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔''

خلاصہ یہ ہوا کہ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ منسوخ ہے اور اخیر کی دونوں آیتیں اس کے لئے ناسخ ہیں۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے یہ ہے کہ ناسخ اس کے لئے آیت کا جزء اول "وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ" ہے۔ (رواہ الطبری کمافی الجمل)

بہتر یہ ہے کہ تینوں ہی اس کے لئے ناسخ ہیں اس آیت کا جزءِ اول بھی اور اخیر کی دونوں آیتیں بھی جیسا کہ علامہ صاوی نے اختیار کیا ہے، بہر حال نسخ کے بعد تعارض نہیں رہتا، پس آیت نمبر ۱ آیت نمبر ۲ و ۳ کے معارض نہیں ہے۔

(روح المعانی، جمل، صاوی)

❷ جوابِ اول میں تو "وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ" میں عقد سے مراد عقدِ محالفة

اور موالاۃ ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ عقد سے مراد عقدِ مؤاخاۃ فی الدین ہے جو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ابتداءِ ہجرت میں مہاجرین وانصار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان قائم فرمادی تھی اور "نصیبھم" سے مراد حصۂ میراث نہیں بلکہ نصرت و امداد اور خیر خواہی ہے، دراصل مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اپنا وطن، اپنے اعزاء واقارب کو چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی، لوگ تنہا تنہا مسلمان ہوئے تھے، ان کے کنبے قبیلے کے لوگ کافر تھے جو مکہ میں تھے، مدینہ میں حضرات مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی کسی سے قرابت داری نہیں تھی تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین وانصارِ مدینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مابین مواخاۃ قائم فرمادی تھی، ان میں سے دو دو آدمیوں (ایک مہاجر اور ایک انصاری) کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا تھا، اُخوتِ ایمانی کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے، جب مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دوسرے رشتہ دار بھی مسلمان ہو کر مدینہ آگئے تو ایمان و ہجرت والی وراثت کو حق تعالیٰ نے منسوخ کر کے وراثت بالقرابۃ کا حکم نازل فرما دیا اور سورۂ نساء کی آیت وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ الخ نازل ہوئی کہ ہم نے ہر ایک کے لئے اس کے والدین اور اقرباء کے ترکہ میں وارثین مقرر کردیئے ہیں، ان ہی کو میراث کا مال تقسیم کیا جائے، مؤاخاۃ فی الدین کی وجہ سے کسی کو وراثت نہیں ملے گی، البتہ ایمانی اور دینی بھائیوں کے لئے آگے فرمادیا "وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَآتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ" یعنی جن لوگوں کے ساتھ تمہارے بھائی چارگی کے تعلقات قائم ہوگئے ہیں ان کے ساتھ نصرت و امداد اور خیر خواہی کا معاملہ کرتے رہو ان کے لئے کوئی وصیت کر جاؤ یا ان کی بطور تبرع واحسان کے امداد کردو، "نصیبھم" سے مراد حصۂ میراث نہیں بلکہ نصرت و امداد اور خیر خواہی کرنا ہے، آیت اولیٰ کی یہ مذکورہ تفسیر بخاری شریف وغیرہ کی روایت میں موجود ہے۔

﴿عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال: کان المھاجرون لما قدموا المدینۃ یرث المھاجر الانصاری دون ذوی رحمہ للاخوۃ التی آخی النبی صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بینھم، فلما نزلت ولکل جعلنا موالی الخ نسخت، ثم قال: والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم من النصرو الرفادۃ والنصیحۃ، وقدذھب المیراث ویوصی لہ.﴾

(اخرجہ البخاری وابوداؤد والنسائی وجماعۃ۔ روح المعانی ۲۳/۵)

ترجمہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ مہاجرین جب مدینہ آئے تو مہاجر اپنے قرابت داروں کے بجائے انصاری کا وارث ہوتا تھا اس اخوت کی وجہ سے جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے مابین قائم فرما دی تھی، پس جب آیت ”وَلِكُلٍّ جَعَلْنَامَوَالِيَ الخ نازل ہوئی تو یہ وراثت بالاخوۃ والدین منسوخ ہوگئی، پھر حق تعالیٰ نے (موالی فی الدین یعنی دینی بھائیوں اور دوستوں کے بارے میں) فرما دیا ”وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ“ کہ جن لوگوں کے ساتھ تمہارے دینی تعلقات قائم ہوگئے ہیں ان کو ان کا حصہ دو، یعنی ان کی نصرت و امداد اور خیر خواہی کرو، ان کی میراث ختم ہوگئی البتہ ان کے لئے وصیت کی جا سکتی ہے۔“

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی کے مثل مروی ہے، اس تفسیر سے یہ بات سامنے آئی کہ آیتِ اولیٰ کا مضمون دو حکموں پر مشتمل ہے، حکم اول یہ کہ وراثت اعزاء و اقارب میں جاری ہوگی، یہ تو آیت کے جزء اول ”وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ“ میں مذکور ہے۔ حکم دوم یہ کہ موالی فی الدین کے ساتھ نصرت و امداد اور خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے یہ آیت کے جزء ثانی ”وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ

اَیْمَانُکُمْ فَاٰتُوْھُمْ الخ'' میں بیان کیا گیا ہے، یہی مضمون اخیر کی دونوں آیتوں کا ہے، آیت ثانیہ میں ''وَاُولُوا الْاَرْحَامِ اَوْلٰی بَعْضُھُمْ بِبَعْضٍ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ'' کہہ کر حکم اول کو بیان کیا گیا ہے کہ اہلِ قرابت آپس میں وارثین بننے میں اجانب سے اولیٰ واقدم ہیں، اجانب کو تو ضرورت کی وجہ سے ان میں مؤاخاۃ فی الدین قائم کر کے وارث بنا دیا گیا تھا، جب ضرورت مرتفع ہوگئی تو وراثت بالأخوۃ الدینیۃ کو منسوخ کر کے وراثت بالقرابۃ کو جاری کر دیا گیا، اور آیتِ ثالثہ میں دونوں حکموں کی تصریح ہے ''وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُھَاجِرِیْنَ'' میں حکمِ اوّل اور ''اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْا اِلٰی اَوْلِیَائِکُمْ مَعْرُوْفاً'' میں حکمِ ثانی کا بیان ہے کہ اپنے دینی دوستوں اور بھائیوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو جب تینوں آیتوں کا مضمون متحد و مساوی ہوگیا تو کوئی تعارض نہیں رہا۔

۳ تیسرا جواب یہ ہے کہ آیت نمبر ا میں جو مولی الموالاۃ کو حصہ میراث دینے کا حکم دیا گیا ہے یہ اس حالت پر محمول ہے جب کہ میت کے اقارب اولوا الارحام اور عصبات نہ ہوں، ایسی حالت میں میراث مولی الموالاۃ (یعنی جس سے معاہدہ ومحالفہ ہوگیا ہو جو جواب اول میں ذکر کیا گیا ہے) کو ملے گی اور آیت نمبر ۲ و ۳ اس حالت پر محمول ہیں جبکہ میت کے اقارب موجود ہوں ایسی صورت میں اقارب مقدم ہوں گے مولی الموالاۃ پر، اس لئے کہ اخیر کی آیتوں میں مولی الموالاۃ کو مطلقاً میراث دینے کی نفی نہیں ہے بلکہ اولوا الارحام کو اقدم واولیٰ بتایا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اقارب اور مولی الموالاۃ دونوں ہوں تو اقارب کو مقدم رکھا جائے گا، مولی الموالاۃ کو وراثت نہیں ملے گی اور اگر اقارب موجود نہ ہوں تو مولی الموالاۃ کو میراث دی جائے گی۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہو اور دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث بننے اور ایک دوسرے کی

دیت ادا کرنے کا معاہدہ کرلیں تو یہ درست ہے، ایسی صورت میں اگر میت کا اس حلیف کے علاوہ کوئی اور قرابتی وارث نہ ہو تو وراثت اس حلیف کو ملے گی اس توجیہ پر نہ تو آیت اولیٰ منسوخ ہوئی اور نہ ان آیات میں کوئی تعارض رہا اس لئے کہ یہ علیحدہ علیحدہ حالتوں پر محمول ہیں۔ (روح المعانی وغیرہ)

مشرکین قیامت کے دن کوئی بات چھپائیں گے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۵، ۷

① ﴿وَلَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثًا﴾ (پارہ: ۵ رکوع: ۳ سورۂ نساء، جلالین ص: ۷۷) ✦

② ﴿ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ [1] إِلَّآ أَنْ قَالُوا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ﴾

(پارہ: ۷ رکوع: ۹ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۱۳)

تشریح تعارض

آیت نمبر ا سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین قیامت کے دن اللہ کے سامنے کوئی بات نہیں چھپائیں گے، ہر بات صحیح صحیح بتلادیں گے اور آیت نمبر ۲ میں ہے کہ جب حق تعالیٰ قیامت کے دن مشرکین سے فرمائیں گے "أَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ" تمہارے وہ شرکاء کہاں ہیں جن کے بارے میں تم اللہ کے شرکاء ہونے کا گمان کرتے تھے تو مشرکین کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ وہ یوں کہیں گے "وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ" ہمارے خدائے پروردگار کی قسم ہم تو کسی کو بھی آپ کا شریک نہیں ٹھہراتے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اللہ کے سامنے جھوٹی قسم کھا کر اپنا شرک چھپائیں گے پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے کیونکہ آیت اولیٰ میں کتمان کی نفی اور دوسری میں کتمان کا اثبات ہے۔

(۱) فتنۃ سے مراد عذر یعنی جواب، اس کو فتنۃ سے اس لئے تعبیر کر دیا کہ ان کا یہ جواب کذب ہے، والکذب فتنۃ۔ (جمل)

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اختلاف اوقات پر محمول ہے، ایک وقت تو وہ اپنا شرک چھپائیں گے لیکن دوسرے وقت میں چھپا نہیں پائیں گے بلکہ صحیح صحیح بیان کردیں گے، یعنی ابتداء تو وہ جھوٹی قسم کھا کر اپنا شرک چھپائیں گے مگر جب حق تعالیٰ ان کی زبانوں پر مہر لگا کر ان کے اعضاء و جوارح سے گواہی دلوائیں گے، تو اعضاء و جوارح ان کا کفر و شرک صحیح صحیح بیان کردیں گے، اس وقت یہ لوگ کوئی بات چھپا نہیں پائیں گے، اعضاء و جوارح کی گواہی کے وقت وہ کسی بات کو چھپانے اور انکار کرنے پر قادر ہی نہیں ہوں گے یہ توجیہ بخاری شریف کی روایت سے ثابت ہے۔

﴿عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ فی قولہ تعالٰی: "ولایکتمون اللّٰہ حدیثا" وقولہ تعالٰی: "واللّٰہ ربنا ماکنا مشرکین"، انہ قال: ان المشرکین لمارأوایوم القیامۃ ان اللّٰہ یغفر لاھل الاسلام، ویغفر الذنوب، ولا یغفر الشرک جحد وارجاء ان یغفرلھم، فقالوا: واللہ ربنا ماکنا مشرکین، فیختم اللّٰہ علی افواھھم، وتکلمت ایدیھم وارجلھم بما کانوا یعملون، فعند ذلک یودالذین کفروا وعصوا الرسول لوتسوی بھم الارض، ولایکتمون اللّٰہ حدیثا.﴾ (رواہ البخاری وغیرہ تفسیر مظہری)

ترجمہ: ’’حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اللہ کے قول "وَلَایَکْتُمُوْنَ اللّٰہَ حَدِیْثًا" اور اللہ کے قول "وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَاکُنَّا مُشْرِکِیْنَ" کے بارے میں روایت ہے: فرمایا کہ مشرکین جب قیامت کے دن دیکھیں گے کہ حق تعالیٰ اہل اسلام کی مغفرت فرمارہے ہیں اور

گناہوں کو بخش رہے ہیں مگر شرک کی مغفرت نہیں فرما رہے ہیں تو مشرکین! اس امید پر کہ ان کی مغفرت ہو جائے اپنے شرک کا انکار کردیں گے اور کہہ دینگے اللہ کی قسم ہمارے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے۔ پس حق تعالیٰ ان کی زبانوں پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ پاؤں بولیں گے، ان کا کفر و شرک اور ان کے اعمال صحیح صحیح بیان کردیں گے، پس اس وقت کفار اور رسول کے نافرمان تمنا کریں گے کہ کاش ہم کو زمین کی مٹی میں ملا کر زمین کو ہموار کردیا جاتا اور اس وقت وہ لوگ اللہ سے کوئی بات چھپا نہیں پائیں گے۔"

بخاری شریف کی ایک روایت ہے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قرآن کی چند آیات کے درمیان تعارض کے متعلق سوال کیا جن میں سے دو آیتیں یہی ہیں تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہی جواب دیا جو ابھی اوپر گزرا۔

(تفسیر مظہری)

نعمت ومصیبت سب اللہ کی طرف سے ہے یا مصیبت بندہ کی جانب سے ہے؟

پارہ نمبر: ۵

آیات

① ﴿ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾

(پارہ: ۵ رکوع: ۸ سورۂ نساء جلالین ص: ۸۱، ۸۲) ✦

② ﴿ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ﴾

(پارہ: ۵ رکوع: ۸ سورۂ نساء جلالین ص: ۸۲)

تشریح تعارض

مدینہ میں منافقین کو جب خوشحالی پیش آتی تھی تو کہتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے آئی ہے اور جب کوئی مصیبت اور بدحالی پیش آتی تھی، تو اس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کہتے تھے کہ یہ مصیبت اور بدحالی نعوذ باللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نحوست سے آئی ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا "قل کل من عند اللّٰہ" کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ نعمت ومصیبت سب اللہ کی طرف سے آتی ہے میرا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمت ومصیبت، راحت وتکلیف سب اللہ کی طرف سے آتی ہیں اور آیت ثانیہ میں ارشاد ہے کہ راحت ونعمت تو اللہ کی طرف سے ہے اور مصیبت وپریشانی خود بندہ کی طرف سے آتی ہیں، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

آیت اولیٰ میں اجمال اور دوسری آیت میں اس کی تفصیل ہے اور تفصیل بعد الاجمال کو تعارض نہیں کہا جاتا ہے، وضاحت اس کی یہ ہے کہ آیت اولیٰ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ خوش حالی و بد حالی ہر چیز کا خلق و ایجاد حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، البتہ خوش حالی تو حق تعالیٰ بلا واسطہ محض اپنے فضل سے عطا فرماتے ہیں اور بد حالی بواسطہ معاصی عباد، نازل فرماتے ہیں لیکن بلا واسطہ اور بالواسطہ کی تفصیل اس آیت میں بیان نہیں کی گئی بلکہ ''قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ'' کہہ کر اس کو مجمل طور پر ذکر کر دیا، آیت ثانیہ میں اس کی تفصیل بیان فرما دی ''مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ'' کہ جو نعمت و خوش حالی تم کو پہنچتی ہے وہ بلا واسطہ محض اللہ کے فضل و کرم سے پہنچتی ہے اور ''مَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ'' جو مصیبت و بد حالی آتی ہے یہ تمہارے گناہوں کے واسطے سے آتی ہے، حقیقت یہی ہے کہ نعمتوں اور راحتوں کے نزول میں بندہ کی عبادات کو کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی نعمتیں تو اس قدر ہیں کہ بندہ اپنی تمام عبادات سے ان کا حق شکر ادا نہیں کر سکتا، حق تعالیٰ نے بندہ کو وجود بخشا اور اس کو عبادت کرنے کی توفیق عطا فرمائی، یہ وجود اور توفیق عبادت خود اتنی بڑی بڑی نعمتیں ہیں کہ بندہ کی تمام عبادات و طاعات ان ہی کی مکافات نہیں کر سکتی ہیں چہ جائیکہ دیگر نعمتوں کا حق ادا کر سکیں، بلکہ حق تو یہ ہے کہ بندہ کی پوری زندگی کے اعمال حسنہ اور عبادتیں خدا کی ایک چھوٹی سی چھوٹی نعمت کا حق ادا نہیں کر سکتیں، پس معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہر لحہ اور ہر آن، جو بندوں پر نعمتوں اور رحمتوں کی بارشیں ہوتی رہتی ہیں اس کا سبب بندوں کی عبادات نہیں ہیں، بلکہ یہ محض اللہ کا فضل و احسان ہے، اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿لَنْ يُّدْخِلَ اَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ، قِيْلَ: وَلَا اَنْتَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ!

قَالَ: وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ مِنْہُ بِفَضْلٍ وَرَحْمَۃٍ.﴾

(رواہ البخاری ومسلم عن ابی ہریرۃ، روح المعانی)

ترجمہ: ''کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا، عرض کیا گیا، یا رسول اللہ، آپ بھی (اپنے عمل کی وجہ سے داخل) نہیں (ہوں گے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور میں بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنے فضل ورحمت میں چھپالیں۔''

البتہ مصائب وآلام کا آنا بندوں کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے ''مَآ أَصَابَکُمْ مِنْ مُصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ أَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْعَنْ کَثِیْرٍ.'' حدیث میں بھی یہی مضمون وارد ہوا ہے:

﴿عن أبی موسی رضی اللّٰہ عنہ أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: لاتصیب عبدا نکبۃ فما فوقھا وما دونھا إلابذنب، وما یعفوأکثر.﴾ (رواہ الترمذی، مظہری)

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ کو جو کوئی ہلکی یا سخت مصیبت لاحق ہوتی ہے تو وہ اس کی گناہوں کی وجہ سے ہوتی ہے اور جن گناہوں کو اللہ معاف فرمادیتے ہیں وہ زیادہ ہیں۔''

قرآن پاک میں تعارض واختلاف ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۵، ۱۵، ۲۳

① ﴿لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾

(پارہ: ۵ رکوع: ۸ سورۂ نساء جلالین ص: ۸۲)

② ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾

(پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۳ سورۂ کہف جلالین ص: ۲۴۱)

③ ﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِیْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ۱۷ سورۂ زمر جلالین ص: ۳۸۷)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ میں ارشاد ہے کہ اگر یہ قرآن اللہ کے علاوہ کسی اور کا بنایا ہوا ہوتا تو اس میں اختلاف کثیر پایا جاتا، اس کے مضامین میں، الفاظ و معانی میں فصاحت و بلاغت میں بہت اختلاف و تناقض ہوتا، لیکن اس میں اختلاف کثیر نہیں ہے، پس معلوم ہوا کہ یہ غیر اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ منزل من اللہ ہے، اس آیت میں قرآن میں اختلاف کثیر کی نفی کی گئی ہے اور کثیر کی نفی سے قلیل کی نفی نہیں ہوتی بلکہ قلیل کا اثبات رہتا ہے، جس سے یہ لازم آتا ہے کہ قرآن میں اختلاف کثیر تو نہیں البتہ اختلاف قلیل ہے اور آیت نمبر ۲ و ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں کسی قسم کا بالکل کوئی اختلاف و تناقض نہیں ہے، نہ قلیل و کثیر، کیونکہ دونوں آیتوں میں عوج نکرہ تحت

النفی استعمال ہوا ہے جو عموم نفی کا فائدہ دیتا ہے کہ کسی بھی قسم کی بالکل کجی اور اختلاف و تعارض نہیں ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قرآن پاک ہر قسم کے عوج سے لفظاً ہو یا معنیً، قلیل ہو یا کثیر منزہ ومقدس ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں کثیرا کی قید احترازی نہیں ہے کہ کثیر کی نفی سے قلیل کا اثبات مقصود ہو بلکہ یہ قید مبالغہ اور ترقی کے لئے ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن غیر اللہ کا کلام ہوتا تو اس میں صرف اختلاف قلیل ہی نہیں بلکہ اختلاف کثیر ہوتا مگر اس میں تو نہ قلیل اختلاف ہے نہ کثیر، معلوم ہوا کہ منزل من اللہ کلام ہے، پس اس آیت سے بھی نفی مطلق اختلاف کی ہو رہی ہے لہٰذا یہ آیت دوسری اور تیسری آیت کے معارض نہیں ہوگی۔ (جمل وصاوی)

❷ کثرت کی قید احترازی نہیں بلکہ مضامین کی کثرت کی وجہ سے یہ قید لگادی گئی ہے ورنہ نفی مطلق اختلاف ہی کی مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن غیر اللہ کا کلام ہوتا تو اس کے مضامین میں کچھ نہ کچھ اختلاف ہوتا (اور چونکہ اس کے مضامین کثیر ہیں، ہر ہر مضمون میں ایک ایک اختلاف پائے جانے کی وجہ سے اختلاف بھی کثیر ہو جاتا) لیکن اس میں کچھ بھی اختلاف نہیں ہے، کسی مضمون میں بھی تعارض و تناقض نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ غیر اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ کا کلام ہے۔

(اجاب بہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب التھانوی رحمۃ اللہ علیہ فی بیان القرآن)

اس توجیہ سے واضح ہوگیا کہ مطلق اختلاف کی نفی ہے، پس اس آیت کا اخیر کی دونوں آیتوں سے کوئی تعارض نہیں ہے، تینوں آیات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں کسی قسم کا کوئی اختلاف وتعارض اور تناقض نہیں اور آیات قرآنیہ میں جو تعارض نظر

آتا ہے وہ ظاہرِ نظر میں ہے، ورنہ [illegible] تفکر اور نظرِ عمیق کے بعد کوئی تعارض نہیں ہے، آپ کے زیرِ مطالعہ ہمارا یہ رسالہ "آیاتِ متعارضہ اور ان کا حل" اسی مضمون پر تالیف کیا گیا ہے، اس رسالہ میں دفعِ تعارض کی جو توجیہات و تحقیقات پیش کی گئی ہیں ان کے سامنے آنے کے بعد بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ آیاتِ قرآنیہ تعارض و تناقض سے منزہ و مقدس ہیں۔

قابض روح حق تعالیٰ ہیں یا ملک الموت یا دیگر ملائکہ ہیں؟

پارہ نمبر: ۵، ۷، ۸، ۱۰، ۱۴، ۲۴، ۲۶

① ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾

(پارہ: ۵ رکوع: ۱۱ سورۂ نساء جلالین ص: ۸۵)

② ﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾

(پارہ: ۷ رکوع: ۱۴ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۱۷)

③ ﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ﴾ (پارہ: ۸ رکوع: ۱۱ سورۂ اعراف جلالین ص ۱۳۲)

④ ﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ (پارہ: ۱۰ رکوع: ۳ سورۂ انفال جلالین ص: ۱۵۲)

⑤ ﴿اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾

(پارہ: ۱۴ رکوع ۱۰ سورۂ نحل جلالین ص: ۲۱۸)

⑥ ﴿اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ﴾ (پارہ: ۱۴ رکوع: ۱۰ سورۂ نحل جلالین ۲۱۸)

⑦ ﴿فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۷ سورۂ محمد (القتال) جلالین ص: ۴۲۲) ✦

⑧ ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ﴾

(پارہ: ۱۴ رکوع: ۱۵ سورۂ نحل جلالین ص: ۲۲۲)

⑨ ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا﴾ (پارہ: ۲۴ رکوع: ۲ سورۂ زمر جلالین ص: ۳۸۸) ✦

⑩ ﴿قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ﴾ (پارہ:۲۱ رکوع:۱۴ سورۂ سجدہ جلالین ص:۳۴۹)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جب موت آتی ہے تو اس کی روح کئی فرشتے آکر قبض کرتے ہیں، کیونکہ ان آیات میں "ملائکۃ" اور "رسلنا" صیغۂ جمع کے ساتھ ہے اور آیت نمبر ۸ و ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ خود روح قبض کرتے ہیں اور آیت نمبر ۱۰ اس بات پر دال ہے کہ صرف ایک فرشتہ (ملک الموت) روح قبض کرتا ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

① جب کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو حق تعالیٰ ملک الموت (حضرت عزرائیل علیہ السلام) کو اس کی روح قبض کرنے کا حکم دیتے ہیں، ملک الموت کے ساتھ چند فرشتے معاونین کی حیثیت سے جاتے ہیں، ملائکہ معاونین انسان کے بدن کی رگوں سے روح کو کھینچتے ہیں، جب روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور نکلنے کے قریب ہو جاتی ہے تو پھر ملک الموت اس کو قبض کر کے بالکل باہر نکال دیتا ہے، پس حق تعالیٰ قبض روح کے آمر ہوئے، اور رگوں سے نکال کر حلقوم تک پہنچانے والے اور تعاون کرنے والے ملائکہ ہوئے، اور حلقوم سے باہر نکالنے والے ملک الموت ہوئے۔

پہلی سات آیات میں نسبت معاونین کی طرف کردی گئی ہے کیونکہ فعل کی نسبت معاون و شریک کی طرف بھی کردی جاتی ہے، جیسے کسی کو قتل کرنے والا شخص واحد ہو اور دوسرے لوگوں نے تعاون کیا ہو تو کہا جاتا ہے "قتلوا قتیلا" کہ اس مقتول کو سب نے قتل کیا ہے اور آیت نمبر ۸ و ۹ میں آمر یعنی حق تعالیٰ کی طرف نسبت

کردی گئی ہے، اس لئے کہ فعل کی نسبت آمر کی طرف بھی کردی جاتی ہے کہا جاتا ہے "بنی الأمیر القصر" بادشاہ نے محل بنایا، یعنی بنانے کا حکم دیا اور آیت نمبر ۱۰ میں قابض یعنی ملک الموت کی طرف ،نسبت کردی گئی، پس کوئی تعارض نہیں ہے۔

(روح المعانی وتفسیر خازن)

❷ ملک الموت تو ارواح کو قبض کرتا ہے، دیگر ملائکہ اس کا تعاون کرتے ہیں، ملک الموت کے حکم پر عمل کرتے ہیں، پھر حق تعالیٰ روح کو کھینچ کر بدن سے بالکل باہر نکال دیتے ہیں چونکہ قبض روح میں شرکت سب کی ہوتی ہے اس لئے ،بعض آیات میں حق تعالیٰ کی طرف بعض میں ملک الموت کی طرف ،بعض میں ملائکہ ،رُسل کی طرف نسبت کردی گئی۔ فلا تعارض۔ (روح البیان بحوالہ حاشیہ جلالین ص:۳۴۹)

❸ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، یعنی بعض لوگوں کی روحیں خود حق تعالیٰ قبض کرتے ہیں، بعض کی ملک الموت اور بعض کی دیگر ملائکہ قبض کرتے ہیں، چنانچہ شہداء بحر کے بارے میں روایت میں آیا ہے کہ ان کی ارواح ان کے اعزاز واکرام میں حق تعالیٰ خود ہی قبض فرماتے ہیں، ملک الموت کے حوالہ نہیں فرماتے:

﴿عن أبی أمامة رضی الله عنه قال: سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: إن الله وكل ملك الموت بقبض الأرواح إلا شهداء البحر، فإنه سبحانه یتولی قبض أرواحهم.﴾ (رواہ ابن ماجہ، روح المعانی)

ترجمہ: "حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو ارواح کے قبض کرنے پر مقرر کیا ہے، مگر پانی میں غرق ہوکر شہید ہوجانے والے لوگوں کی ارواح حق تعالیٰ خود قبض فرماتے ہیں۔"

مؤمن عاصی جہنم میں داخل ہوگا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۵، ۳۰

آیات

① ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾

(پارہ: ۵ رکوع: ۱۵ سورۂ نساء جلالین ص: ۸۷) ✦

② ﴿لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى﴾

(پارہ: ۳۰ رکوع: ۱ سورۂ لیل جلالین ص: ۵۰۱)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ میں ارشاد ہے کہ مشرک کی تو مغفرت نہیں ہوگی مشرک کے علاوہ مؤمن عاصی کے گناہوں پر حق تعالیٰ سزا بھی دے سکتے ہیں، معاف بھی کر سکتے ہیں اور آیت نمبر ۲ میں ارشاد ہے کہ جہنم میں صرف ایمان سے روگردانی کرنے والا اور تکذیب کرنے والا بد بخت کافر ہی داخل ہوگا اور کوئی نہیں کیونکہ نفی و استثناء کے ساتھ کلام کرنا حصر کے لئے مفید ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن عاصی جہنم میں داخل نہیں ہوگا، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

دوسری آیت میں دخول جہنم سے مراد دخول ابدی ہے کہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں، صرف کافر ہی داخل ہوگا، مؤمن عاصی کو اگر حق تعالیٰ عذاب دینا چاہیں گے تو کچھ مدت تک عذاب دینے کے بعد جہنم سے نکال کر جنت میں داخل فرمادیں گے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (جلالین)

تمام عزتیں اللہ کے لئے ہیں یا رسول اور مؤمنین کے لئے بھی ہیں؟

پارہ نمبر: ۵، ۱۱، ۲۲، ۲۸

① ﴿ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴾

(پارہ: ۵ رکوع: ۱۷ سورۂ نساء، جلالین ص: ۸۹)

② ﴿ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعاً هُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾

(پارہ: ۱۱ رکوع: ۱۲ سورۂ یونس جلالین ص: ۱۷۶)

③ ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُالْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۱۴ سورۂ فاطر جلالین ص: ۳۶۵)

④ ﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُوَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

(پارہ: ۲۸ رکوع: ۱۳ سورۂ منافقون جلالین ص: ۴۶۱)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ و ۲ و ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام عزتیں اللہ کے لئے ہیں اور آیت نمبر ۴ میں ہے کہ عزت اللہ اور اس کے رسول اور مؤمنین سب کے لئے ہے، پس ان میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی تین آیات میں عزت بالذات اور بلا واسطہ مراد ہے

اور آیت نمبر ۴ میں رسول اور مؤمنین کے لئے عزت بالواسطہ مراد ہے، فلا تعارض، حاصل یہ ہے کہ بلاواسطہ اور حقیقۃً تو تمام عزتیں دنیا و آخرت کی، حق تعالیٰ کے لئے ہیں، پھر تعلق مع اللہ اور قرب الی اللہ کے واسطے سے رسول کو عزت حاصل ہوئی، پھر رسول کی اتباع اور اطاعت کے واسطہ سے مؤمنین کو عزت حاصل ہوتی ہے۔

(روح المعانی)

پس جو شخص عزت کا طالب ہو وہ اللہ سے تعلق قائم کرے، اس کی اطاعت کرے، تمام عزتیں اسی کے ہاتھ میں ہیں، وہی تمام عزتوں کا مالک ہے، ان دنیا دار کفار و مشرکین کے پاس رہ کر ہرگز عزت حاصل نہیں ہوسکتی، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "ایبتغون عندھم العزۃ" کیا یہ لوگ کفار کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں "فان العزۃ للہ جمیعا" عزتیں تو تمام کی تمام اللہ کے ہاتھ میں ہے "من کان یرید العزۃ فللہ العزۃ جمیعا" جو شخص عزت کا طالب ہو تو تعلق مع اللہ قائم کرے اس کی اطاعت کرے، عزت نصیب ہوجائے گی۔ "وللّٰہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین" رسول کو جو عزت حاصل ہوئی ہے وہ تعلق مع اللہ اور قرب الی اللہ کے واسطہ سے ہوئی پھر اتباع رسول اور اطاعتِ رسول کے واسطہ سے مؤمنین کو عزت ملی پس غیروں کے یہاں عزت تلاش کرنا حماقت اور بے وقوفی ہے۔

وضو میں پاؤں کا غسل واجب ہے یا مسح؟

پارہ نمبر: ۶

① ﴿وَامْسَحُوا بِرُؤُسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾

(بقرأۃ النصب) (پارہ: ۶ رکوع: ۶ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۹۵) ✦

② ﴿وَامْسَحُوا بِرُؤُسِكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾

(بقرأۃ الجر) (پارہ: ۶ رکوع: ۶ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۹۵)

تشریح تعارض

قرآن پاک کی متعدد قراءتیں متعدد آیات کے درجہ میں ہوتی ہیں، پس جس طرح ایک آیت دوسری آیت کے بظاہر معارض نظر آتی ہے اسی طرح بسا اوقات قرآن کی دو مختلف قراءتوں میں بھی بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے، آیت مذکورہ میں لفظ "ارجلکم" میں دو قراءتیں ہیں، نافع، ابن عامر، کسائی، یعقوب، اور حفص کی قراءت میں "ارجلَکُمْ" بنصب اللام ہے اور ابن کثیر، ابوعمر، عاصم، حمزہ اور ابو بکر کی قرأت میں "ارجلِکم" بجراللام ہے، پہلی صورت میں ارجلکم کا عطف وجوھکم پر ہے اور مطلب یہ ہے کہ واغسلوا ارجلکم الی الکعبین کہ پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھوؤ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وضوء میں پاؤں کا حکم غسل ہے اور جر والی قرأت میں ارجلِکُمْ کا عطف رؤوسکم پر ہوگا یعنی وامسحوا برؤسکم و امسحوا بارجلکم اپنے سروں کا اور اپنے پاؤں کا مسح

کرو، اس قراءت سے معلوم ہوتا ہے کہ وضوء میں پاؤں پر مسح کیا جائے گا، پس دونوں قراءتوں میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ قراءت ثانیہ جر جوار پر محمول ہے، یعنی برؤسکم کے مجاور اور متصل ہونے کی وجہ سے ارجلکم کو مجرور پڑھ دیا گیا ہے ورنہ درحقیقت یہ منصوب ہے، رؤسکم کے تناسب کی رعایت کرتے ہوئے نصب ظاہر نہیں کیا گیا ہے اور جب درحقیقت یہ منصوب ہی ہے تو کوئی تعارض نہیں رہا، دونوں قراءتوں سے غسلِ رجلین ہی کا ثبوت ہو رہا ہے مگر یہ توجیہ بعید ہے اس لئے کہ جر جوار ضرورتِ شعری کی وجہ سے اختیار کیا جاتا ہے اور قرآن کریم ضرورت شعری سے منزہ ہے، نیز جر جوار صفت میں مستعمل ہے نہ کہ عطف میں اور ارجلکم معطوف ہے نہ کہ صفت۔ (جمل، صاوی، روح المعانی)

❷ اختلاف احوال پر محمول ہے، نصب والی قراءت حالت غیر خف پر محمول ہے اور جر والی قرأت حالت خف پر محمول ہے، یعنی اگر آدمی موزے پہنے ہوئے ہو تو پاؤں پر یعنی خفین پر مسح کرے ورنہ پاؤں کا غسل واجب ہے، ولا تعارض عند اختلاف الاحوال۔ (روح المعانی وغیرہ)

❸ قراءتِ ثانیہ قراءتِ اولیٰ سے منسوخ ہے، ابتدا میں مسح رجلین کا حکم تھا، پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا اور غسل رجلین کا حکم دے دیا گیا، ولا تعارض بعد النسخ۔
(جمل و روح المعانی)

اہل کتاب کے نزاعات کا فیصلہ کرنا واجب ہے یا نہ کرنے کا بھی اختیار ہے؟

پارہ نمبر: ٦

① ﴿فَإِنْ جَآءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ﴾

(پارہ: ٦ رکوع: ١٠ سورۂ مائدہ جلالین ص: ١٠٠) ✦

② ﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ﴾

(پارہ: ٦ رکوع: ١١ سورۂ مائدہ جلالین ص: ١٠١)

③ ﴿وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ﴾

(پارہ: ٦ رکوع: ١١ سورۂ مائدہ جلالین ص: ١٠١)

تشریح تعارض

آیت نمبر ا میں ارشاد ہے کہ اگر اہل کتاب آپ کے پاس اپنے نزاعات کا فیصلہ کرانے کے لئے آئیں تو آپ کو اختیار ہے خواہ ان کے درمیان فیصلہ فرمادیں یا ان سے اعراض کریں کہ وہ اپنے حکام ہی سے فیصلہ کرالیں اور اخیر کی دو آیتوں میں ارشاد ہے کہ آپ اللہ کے نازل شدہ قانون کے مطابق فیصلہ کریں، ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں، پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ فیصلہ کرنے اور نہ کرنے کا اختیار ہے اور اخیر کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فیصلہ کرنا واجب ہے، اعراض کرنے کا اختیار نہیں ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ اخیر کی دونوں آیتوں سے منسوخ ہے، ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا گیا تھا کہ فیصلہ کریں یا نہ کریں، بعد میں یہ حکم منسوخ فرما کر فیصلہ کرنا واجب کر دیا گیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اکثر سلف (عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ، عطا رحمۃ اللہ علیہ، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم) سے یہی مروی ہے، امام ابوجعفر نحاس رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی یہی نقل کیا ہے کہ اہل کتاب اور اہل ذمہ کے نزاعات کا اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہے، اعراض کرنا اور ان کو خود ان کے حکام کے حوالہ کر دینا جائز نہیں، یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول اصح ہے، ولاتعارض بعد النسخ۔ (بیان القرآن، روح المعانی، جلالین وحاشیتہ)

❷ آیت اولیٰ منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے اور اب بھی یہ حکم ہے کہ اہل کتاب و اہل ذمہ کا فیصلہ کرنے اور نہ کرنے کا حاکم کو اختیار ہے، امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ، امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ، ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی مذہب ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کے قائل ہیں، ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو صحیح کہا ہے، صاحب تفسیر مظہری نے حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہی نقل کیا ہے۔

رہی اخیر کی دونوں آیتیں تو وہ اس کے معارض نہیں ہیں اس لئے کہ فاحکم بینهم بما انزل الله کا مطلب یہ ہے کہ وان اخترت الحکم فاحکم بینهم بما انزل الله کہ آپ پر فیصلہ کرنا واجب تو نہیں ہے لیکن اگر فیصلہ کرنا چاہیں تو اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کریں، ان کی خواہشات کی پیروی نہ

کریں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے الفوز الکبیر میں اسی کو اختیار کیا ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ پہلی آیت میں آگے ارشاد ہے **وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط** ''کہ اگرچہ آپ کو اعراض کرنے کا بھی اختیار ہے لیکن'' اگر آپ فیصلہ کرنا چاہیں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں۔ پس اخیر کی آیتوں میں بھی فیصلہ کو واجب نہیں کیا گیا بلکہ قانون اسلامی کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (تفسیر مظہری، وحاشیہ جلالین، والفوز الکبیر)

۳ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، یعنی آیت اولی غیر ذمیوں کے بارے میں ہے کہ ان کے فیصلہ کرنے، نہ کرنے کا اختیار ہے اور اخیر کی دونوں آیتیں ذمیوں سے متعلق ہیں کہ ان کا فیصلہ کرنا واجب ہے، اہل ذمہ پر بیوع، مواریث اور تمام عقود میں اسلامی احکام جاری ہوتے ہیں علاوہ خمر وخنزیر کی بیع کے کہ وہ ان میں اپنی شریعت کے مطابق فیصلہ کر سکتے ہیں۔ (روح المعانی)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر واجب ہے یا صرف اپنی اصلاح کر لینا کافی ہے؟

پارہ نمبر: ۷، ۹

آیات

① ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ (پارہ: ۷ رکوع: ۴ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۱۰۸) ✦

② ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾

(پارہ: ۹ رکوع: ۱۷ سورۂ انفال جلالین ص: ۱۴۹)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! تم پر اپنی اصلاح کرنا واجب ہے جب تم راہ راست پر آ جاؤ گے تو دوسرے گمراہ لوگوں کی گمراہی اور غلط راہ روی سے تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن پر اپنی اصلاح واجب ہے، دوسروں کی اصلاح اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب نہیں، آدمی اگر خود راہ راست پر ہو تو گمراہوں کی گمراہی اور گناہ گاروں کی بے راہ روی سے اس کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ اس عذاب سے ڈرو جو خاص کر ظالموں اور گناہ گاروں ہی کو نہیں پہنچے گا بلکہ ان نیک لوگوں کو بھی وہ عذاب گھیر لے گا جو گناہ گاروں کو گناہ سے نہیں روکتے ان کو وعظ ونصیحت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اصلاح کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی واجب ہے، دوسروں کی اصلاح کرنا، ان پر روک ٹوک کرنا ضروری

ہے ورنہ جو عذاب گناہ گاروں پر نازل ہوگا اس کی زد میں وہ نیک لوگ بھی آ جائیں گے جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر نہیں کرتے، پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں اِذَا اهْتَدَيْتُمْ میں اہتداء سے مراد امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ سے اہتداء کی تفسیر یہی منقول ہے، اہتداء کی تکمیل ہی اس وقت ہوتی ہے جب آدمی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا وظیفہ ادا کر دے۔ اس تفسیر پر آیت اولیٰ سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ترک کی اجازت پر دلالت نہیں ہوتی کیونکہ مطلب آیت کا اس وقت یہ ہوگا کہ جب تم لوگ اپنی اصلاح کر لو اور دوسروں کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے رہو تو کسی کی گمراہی اور گناہ گاری سے تم کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ معلوم ہوا کہ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور دوسروں کی اصلاح بھی واجب ہے، پس یہ آیت دوسری آیت کے معارض نہیں ہے، اس کی تائید حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خطبہ سے ہوتی ہے۔

﴿عن قيس بن ابى حازم رحمة الله عليه قال: صعد ابوبكر رضى الله عنه منبررسول الله صلى الله عليه وسلم، فحمد الله واثنى عليه، ثم قال: ايها الناس، انكم لتتلون آية من كتاب الله سبحانه وتعدونها رخصة والله ما انزل الله تعالى فى كتابه اشد منها يا ايها الذين آمنواعليكم انفسكم. الآية والله، لتامرن بالمعروف،

ولتنہون عن المنکر، او لیعمنکم اللہ تعالیٰ منہ بعقاب.﴾ (اخرجہ ابن جریر، روح المعانی ۷/۴۵)

ترجمہ: ”حضرت قیس بن ابی حازم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا، اللہ کی حمد وثنا بیان کی، پھر ارشاد فرمایا اے لوگو! تم کتاب اللہ کی یہ آیت ”یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ“ تلاوت کرتے ہو اور اس کو ترک امر بالمعروف والنہی عن المنکر کی رخصت واجازت پر محمول کرتے ہو، خدا کی قسم! اللہ نے اپنی کتاب میں اس سے زیادہ سخت آیت نازل نہیں فرمائی، اللہ کی قسم! تم ضرور بالضرور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے رہو، ورنہ اللہ کی طرف سے آنے والا عذاب تم کو بھی عام ہو جائے گا۔“

ایک اور روایت میں ہے:

﴿عن قیس بن ابی حازم رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ عن ابی بکر رضی اللّٰہ عنہ انہ قال: یا ایہا الناس، انکم تقرؤن ہذہ الایۃ، ولاتضعونہا موضعہا، ولاتدرون ما ہی وانی سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: ان الناس اذا رأوا ظالمًا، فلم یاخذوا علی یدیہ اوشك ان یعمہم اللّٰہ بعقاب منہ.﴾ (اخرجہ الترمذی وابوداود، تفسیر خازن ۱/۴۹۹)

ترجمہ: ”حضرت قیس بن حازم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا اے لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کو اس کے صحیح محمل پر نہیں رکھتے اور اس کا مطلب نہیں جانتے حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ

علیہ وسلم فرماتے تھے کہ لوگ جب کسی ظالم گناہ گار کو دیکھیں اور اس کی اسی وقت گرفت نہ کریں تو اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب سب پر عام کردیں گے۔"

ابوبکر بن محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

﴿خطب ابوبکر الصدیق رضی اللّٰہ عنہ، فکان فی خطبتہ: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: یا ایہا الناس لا تتکلوا علی ہذہ الآیۃ یا ایہا الناس اٰمنوا علیکم انفسکم الخ ان الداعر لیکون فی الحی فلا یمنعونہ فیعمہم اللّٰہ تعالیٰ بعقاب.﴾ (اخرجہ ابن مردویہ، روح المعانی ۷/ ۴۵)

ترجمہ: "حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا، آپ کے خطبہ میں یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے لوگو! اس آیت پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جانا، قبیلہ میں ایک آدمی اگر شریر وخبیث ہو اور لوگ اس کو نہ روکیں تو اللہ اپنا عذاب سب پر عام کردیتے ہیں۔"

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوکر سامنے آگئی کہ دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں، دونوں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب اور اس کے ترک پر عذاب وضرر کا لاحق ہونا ثابت ہورہا ہے۔

❷ آیت اولیٰ سے اگرچہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا عدم وجوب اور ترک کی اجازت ورخصت معلوم ہوتی ہے مگر یہ اس زمانہ میں ہے جب کہ فسق وفجور کا اتنا غلبہ ہوجائے کہ کوئی شخص وعظ ونصیحت قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو، آدمی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتا ہے مگر غلبۂ فسق کی وجہ سے کوئی باز نہیں آتا اور کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا، ایسے حالات میں آدمی فقط اپنی اصلاح کرتا رہے اور راہ راست پر قائم رہے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر چھوڑ دے اس کو کوئی عذاب وضرر لاحق نہیں ہوگا۔ حضرت عبد

اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔

﴿عن الحسن ان ابن مسعود رضی اللّٰه عنه ساله رجل عن هذه الآية، فقال: ايها الناس انه ليس بزمانها، ولكنه قد اوشك ان ياتی زمان تأمرون بالمعروف فيُصنع بكم كذاوكذا، اوقال: فلايقبل منكم، فحينئذٍ عليكم انفسكم لايضركم من ضل اذا اهتديتم.﴾

(اخرجہ عبدالرزاق وابوالشیخ والطبرانی وغیرہم، روح المعانی ۴۶/۷)

ترجمہ: ''حضرت حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے اس آیت کے متعلق سوال کیا، تو فرمایا اے لوگو! یہ حکم اس آیت کے زمانۂ (نزول) میں نہیں ہے لیکن عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ تم لوگ امر بالمعروف (ونہی عن المنکر) کروگے تو اس کے جواب میں تمہارے ساتھ ایسا ویسا معاملہ کیا جائے گا (یعنی لوگ تمہارے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئیں گے) یا یوں فرمایا کہ تمہاری بات کوئی قبول نہیں کرے گا، اس وقت تم لوگوں پر اپنی اصلاح واجب ہے، تم راہ راست پر رہے تو تم کو کوئی ضرر لاحق نہیں ہوگا۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے کہا کہ اگر اس زمانہ میں آپ بیٹھے رہیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر نہ کریں تو کیا حرج ہے، اللہ نے تو رخصت دی ہے ''عليكم انفسكم لا يضركم من ضل الخ'' تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

﴿ليست لی ولاصحابی؛لان رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم قال: الافليبلغ الشاهد الغائب، فكنا نحن الشهود، وانتم الغيب، ولكم هذه الأية لاقوام يجيئون من بعدنا ان

قالوا لم يقبل منهم. ﴾ (اخرجہ ابن جریر، روح المعانی ۴۶/۷)

ترجمہ: ''یہ آیت میرے اور میرے اصحاب کے لئے نہیں ہے، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خبردار، اس وقت جو حاضر ہیں وہ غائبین کو پہنچادیں۔ ہم لوگ حاضر تھے اور تم لوگ غائب تھے لیکن یہ آیت ان لوگوں کے لئے ہے جو ہمارے بعد میں آئیں گے (اس وقت حالات ایسے ہوں گے کہ) اگر لوگ (کوئی بات کسی کو سمجھانے کی) کہیں گے تو ان کی بات قبول نہیں کی جائے گی۔''

پس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب و عدم وجوب اور ترک پر ضرر و عذاب کا لاحق ہونا اور نہ ہونا دو مختلف زمانوں میں ہے۔ **ولاتعارض بعد اختلاف الزمان۔**

❸ تیسرا جواب یہ ہے کہ ترک کی اجازت اس صورت میں ہے جب کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے کی وجہ سے فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو، ایسی حالت میں آدمی خود نیک عمل کرتا رہے، دوسروں پر روک ٹوک نہ کرے، فتنہ وفساد برپا کرنے سے بہتر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ترک ہے اور جب یہ اندیشہ نہ ہو تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر واجب ہے، پس وجوب و عدم وجوب دو مختلف حالتوں میں ہے۔ **ولا تعارض بعد اختلاف الاحوال۔** (روح المعانی)

وصیت کرنے میں گواہوں کا مسلمان ہونا ضروری ہے یا کافر بھی گواہ بن سکتا ہے؟

پارہ نمبر: ۷، ۲۸

آیات

① ﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ ﴾

(پارہ: ۷ رکوع: ۴ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۱۰۹)

② ﴿ وَأَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ (پارہ: ۲۸ رکوع: ۱۷ سورۂ طلاق جلالین ص: ۴۶۳)

تشریح تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان مرتے وقت کسی کو اپنا مال وغیرہ حوالہ کرے تو دو عادل شخصوں کو گواہ بنالینا مناسب اور بہتر ہے مگر ان گواہوں کا مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے، اگر مسلمان نہ ملیں جیسے سفر وغیرہ میں اتفاق ہوجاتا ہے تو غیر مسلموں کو بھی گواہ بنایا جاسکتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے "ذوا عدل منکم او آخران من غیرکم" فرمایا ہے کہ وہ دو عادل آدمی تم میں سے ہوں (یعنی مسلمانوں میں سے) یا تمہارے علاوہ (غیر مسلموں) میں سے ہوں۔ اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ گواہوں کا مسلمان ہونا ضروری ہے، پس دونوں میں بظاہر تعارض ہورہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ پہلی آیت دوسری آیت سے منسوخ ہے، ابتدا میں جب کہ مسلمان کی قلت تھی خصوصاً سفر کی حالت میں غیر مسلموں کو گواہ بنانے کی اجازت دیدی گئی تھی، پھر اس کو منسوخ کر دیا گیا اور گواہوں کا مسلمان ہونا ضروری قرار دیا گیا۔

(تفسیر ابوالسعود، الفوز الکبیر)

❷ پہلی آیت میں منکم اور من غیر کم سے مراد من اقاربکم اور من غیر اقاربکم ہے، حضرت حسن، حضرت عکرمہ، اور امام زہری رحمہم اللہ تعالیٰ سے یہی تفسیر منقول ہے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی الفوز الکبیر میں ایک توجیہ یہی ذکر فرمائی ہے، مطلب یہ ہے کہ گواہوں کا مسلمان ہونا تو ضروری ہے البتہ اپنے اقارب اور رشتہ داروں میں سے ہونا ضروری نہیں، اپنے اقارب نہ ملیں تو غیر اقارب کو گواہ بنالیا جائے، پس یہ آیت آیتِ ثانیہ کے معارض نہیں ہوئی۔

(روح المعانی، والفوز الکبیر)

حق تعالیٰ کفار کے مولیٰ ہیں یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۷، ۱۱، ۲۶

آیات

① ﴿ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ﴾ (پارہ: ۷ رکوع: ۱۴ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۱۷)

② ﴿ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾
(پارہ: ۱۱ رکوع: ۸ سورۂ یونس جلالین ص: ۱۷۳) ✦

③ ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ﴾
(پارہ: ۲۶ رکوع: ۵ سورۂ محمد (قتال) جلالین ص: ۴۲۰)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں "ردوا" کی ضمیر فاعل مطلق مخلوق کی طرف راجع ہے، جس میں مؤمنین و کفار سب داخل ہیں، ترجمہ یہ ہے کہ پھر ساری مخلوق کو لوٹایا جائے گا اللہ کی طرف جو ان کا مولائے حق ہے۔ اور دوسری آیت کفار کے متعلق ہے جیسا کہ آیت کے سیاق "وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ" سے معلوم ہوتا ہے، ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ مؤمنین و کفار سب کے مولیٰ اور مددگار ہیں، اور تیسری آیت میں ارشاد فرمایا کہ خداوند قدوس صرف مؤمنین کے مولیٰ و مددگار ہیں، کفار کا کوئی مولیٰ و مددگار نہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

پہلی دو آیتوں میں مولیٰ بمعنی مالک و خالق ہے اور تیسری آیت میں مولیٰ بمعنی ناصر و مددگار ہے، خداوند قدوس مالک و خالق تو مؤمنین و کفار سب کے ہیں مگر ناصر و مددگار صرف مؤمنین کے ہیں، کفار کے نہیں۔ (جمل)

تبلیغ رسالت پر اجرت کے مطالبہ سے منع کیا گیا ہے یا اجازت دی گئی ہے؟

پارہ نمبر: ۷، ۱۹، ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۲۷

① ﴿قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعَالَمِيْنَ﴾

(پارہ: ۷ رکوع: ۱۶ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۰)

② ﴿قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾

(پارہ: ۱۹ رکوع: ۳ سورۂ فرقان جلالین ص: ۳۰۷)

③ ﴿قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۱۲ سورۂ سبا جلالین ص: ۳۶۳)

④ ﴿قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ۱۴ سورۂ ص جلالین ص: ۳۸۵)

⑤ ﴿اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۴ سورۂ طور جلالین ص: ۴۳۶)

⑥ ﴿قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾

(پارہ: ۲۵ رکوع: ۴ سورۂ شوریٰ جلالین ص: ۴۰۳)

تشریح تعارض

پہلی چار آیتوں میں حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ لوگوں میں اعلان کر دیجئے کہ میں تبلیغ رسالت اور دعوت ایمان پر تم سے کسی قسم کی

اجرت اور معاوضہ کا سوال نہیں کرتا، اس کا اجر اور معاوضہ تو مجھے حق تعالیٰ عطا فرمائیں گے۔ اور آیت نمبر ۵ میں ارشاد ہے کہ کیا آپ ان سے اجرت کا سوال کرتے ہیں جس سے کہ ان لوگوں پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے؟ یہ استفہام انکاری ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے کسی قسم کی اجرت کا سوال نہیں کرتے ہیں، ان پانچوں آیات میں تبلیغ رسالت پر ہر قسم کے اجرت کے مطالبہ کی نفی کی گئی ہے کیونکہ **اجرًا نکرہ تحت النفي** داخل ہے جو مفید عموم ہوتا ہے، یعنی کسی بھی قسم کی اجرت کا مطالبہ نہیں ہے اور آیت نمبر ۶ میں ہے کہ آپ کہہ دیجئے میں تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا مگر **مودة في القربى** کا سوال کرتا ہوں کہ میری قرابت داری کا کچھ لحاظ رکھو۔ اس میں **الا المودة في القربى** کا **اجراً** سے استثناء کیا گیا ہے اور استثناء میں اصل اتصال ہے جس میں مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ میں داخل ہوتا ہے اور اس کی جنس سے ہوتا ہے، اس سے یہ لازم آتا ہے کہ **مودة في القربى** بھی اجرت اور معاوضہ میں داخل ہے اور اس کی جنس سے ہے، آیت کا مطلب یہ ہوا کہ میں تم سے کسی اجرت کا مطالبہ نہیں کرتا سوائے اس اجرت کے کہ تم میری قرابت داری کا لحاظ رکھو، پس اس آیت میں تبلیغ رسالت پر ایک قسم کی اجرت یعنی **مودة في القربى** کے مطالبہ اور سوال کا اثبات ہے، لہٰذا یہ آیت پہلی پانچ آیتوں کے بظاہر معارض ہوئی جن میں ہر قسم کی اجرت کے سوال کی بالکلیہ نفی کی گئی ہے، کوئی استثناء نہیں کیا گیا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

① **الا المودة في القربى**۔ استثناء منقطع ہے جس میں مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ میں داخل اور اس کی جنس سے نہیں ہوتا اور الا لٰکن کے معنیٰ میں ہوتا ہے، اس صورت میں مودۃ فی القربیٰ اجر اور معاوضہ میں داخل ہی نہیں ہے، "**قل لا اسئلكم عليه اجراً**" پر

کلام تام ہو چکا ہے کہ میں تم سے کسی قسم کی اجرت اور معاوضہ کا سوال نہیں کرتا۔ آگے "الا المودة في القربى" سے مستقل دوسرا کلام ہے؛ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم میری نبوت ورسالت کو تسلیم نہیں کرتے تو نہ سہی، لیکن میرا ایک انسانی اور خاندانی حق بھی تو ہے جس کا تم انکار نہیں کر سکتے کہ تمہارے اکثر قبائل میں میری رشتہ داری اور قرابتیں ہیں، قرابت کے حقوق صلہ رحمی وغیرہ کا تو کم از کم خیال رکھو، میرے ساتھ ایذا رسانی کا معاملہ نہ کرو، بات کا ماننا نہ ماننا تو خیر تمہارے اختیار میں ہے مگر یہ قرابت داری تو کم از کم عداوت ودشمنی سے مانع ہونی چاہئے۔ بہر حال خلاصہ یہ ہوا کہ مودۃ فی القربی اجر نہیں ہے، پس اس آیت میں بھی مطلق اجر کے سوال کی نفی مقصود ہے، لہٰذا یہ آیت پہلی پانچ آیتوں کے معارض نہیں ہے۔ (صاوی، معارف القرآن وغیرہ)

❷ استثناء متصل ہے اور مودة في القربٰى اجر میں داخل ہے مگر مودة في القربى کو مجازاً اجر میں داخل مانا گیا ہے، ورنہ درحقیقت یہ اجر ومعاوضہ نہیں ہے بلکہ قرابت داری کی وجہ سے محبت رکھنا تو اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے، میں تبلیغ وتعلیم کروں یا نہ کروں مودة في القربى کا فریضہ ہر حال میں تم پر عائد ہوتا ہے، تم اگر مودة في القربى کو معاوضہ سمجھتے ہو تو یہ تمہاری غلطی ہے، اس صورت میں یہ کلام تاكيد المدح بمايشبه الذم کے قبیل سے ہے، یعنی کسی کی مدح اور تعریف کو ایسی شئے کے ذریعہ مؤکد کرنا جو مذمت اور برائی کے مشابہ ہے۔ یعنی بظاہر اس کو مذمت اور عیب سے تعبیر کیا جا رہا ہے ورنہ حقیقۃً مقصود مذمت نہیں بلکہ مدح وتعریف کو مؤکد اور پختہ کرنا ہے، عربی اور عجمی ہر زبان میں اس کا استعمال موجود ہے، متنبی شاعر ایک قوم کی شجاعت وبہادری بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

لَاعَيْبَ فِيهِمْ غَيْرَ اَنَّ سُيُوْفَهُمْ
بِهِنَّ فُلُوْلٌ مِنْ قِرَاعِ الْكَتَائِبِ

ترجمہ: "کہ ان لوگوں میں کوئی عیب اور برائی نہیں ہے سوائے اس عیب

کے کہ دشمنوں کے لشکروں میں تلواریں زیادہ چلانے کی وجہ سے ان کی تلواروں میں دندانے پڑ گئے ہیں، تلواروں کی دھاریں خراب ہوگئی ہیں۔"

اور ظاہر ہے کہ کثرت حرب وضرب کی وجہ سے تلواروں کی دھاریں خراب ہوجانا درحقیقت بہادروں کے لئے کوئی عیب نہیں بلکہ ہنر اور کمال کی بات ہے مگر اس کو بظاہر عیب کہہ دیا گیا ہے، اس سے مدح وتعریف میں تاکید پیدا ہوگئی ہے۔

ہماری اردو زبان کے محاورہ میں بھی اس کا استعمال پایا جاتا ہے جیسے کسی شریر طالب علم کو استاد نے بار بار اس کی شرارت پر ٹوکا، اس کو وعظ ونصیحت کی، سمجھایا مگر وہ بجائے ماننے کے متنفر ہوکر مدرسہ سے بھاگ گیا، استاد صاحب سے معلوم کیا گیا کہ آخر آپ نے اس کو کیا کہہ دیا تھا جس سے وہ فرار ہوگیا؟ تو استاد صاحب نے جواب دیا کہ میں نے اس لڑکے کی شان میں اور کوئی غلطی وگستاخی نہیں کی سوائے اس غلطی کے کہ میں نے اس کی شرارتوں پر اس کو تنبیہ کردی تھی، اس کو سمجھا دیا تھا، اب تم اس کو غلطی وگستاخی سمجھو یا محبت وہمدردی۔ ظاہر ہے کہ طالب علم کو اس کی شرارتوں اور غلط حرکتوں پر روک ٹوک کرنا، اس کو سمجھانا یہ کوئی غلطی اور ظلم نہیں ہے بلکہ عین محبت وشفقت ہے مگر اس کو مجازاً غلطی سے تعبیر کردیا گیا، اردو شعر کا ایک مصرعہ ہے ؏

مجھ میں ایک عیب بڑا ہے کہ وفادار ہوں میں

اس میں شاعر نے وفاداری کو عیب سے تعبیر کیا ہے، ورنہ درحقیقت وفاداری عیب نہیں بلکہ خوبی کی بات ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اس صورت میں مودة في القربى حقیقۃً اجرت ومعاوضہ نہیں ہے، پس اس آیت میں بھی مطلق اجر کی نفی ہے، لہٰذا یہ آیت پہلی پانچ آیات کے معارض نہیں ہے۔ (تفسیر خازن، صاوی، معارف القرآن وغیرہ)

۳ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ اور حسین بن فضل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے، دراصل یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی تھی جب کہ مشرکین مکہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچاتے تھے تو حق تعالیٰ نے یہ آیت "قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْراً اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى" نازل فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت اور صلہ رحمی کا حکم دیا تھا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے اور حضرات انصار نے محبت ونصرت کا معاملہ کیا تو حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء سابقین کے ساتھ لاحق کرنا چاہا کہ جس طرح حضرات انبیاء سابقین علیہم السلام نے تبلیغ ورسالت پر کسی قسم کی اجرت کا مطالبہ نہیں کیا، نہ مال کا اور نہ مودۃ فی القربیٰ کا، اسی طرح آپ کو حکم دیا گیا اور آیت نازل فرمائی "قُلْ مَاسَأَلْتُكُمْ مِنْ اَجْرٍ فَهُوَلَكُمْ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ."

اس آیت نے الا المودة فی القربی والی آیت کو منسوخ کردیا، ولا تعارض بعد النسخ مگر یہ توجیہ غیر پسندیدہ ہے، اس لئے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اقارب کے ساتھ محبت والفت کا معاملہ کرنا اور ایذا رسانی سے باز آنے کا حکم ابتداء میں تھا، بعد میں منسوخ ہوگیا، حالانکہ یہ غلط ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے محبت رکھنا تو فرائض دین میں سے ہے، ایمان کا جزءِ لازم ہے اس لئے نسخ کی توجیہ کرنا درست نہیں ہے۔ (تفسیر خازن)

حق تعالیٰ کی رؤیت ہوگی یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۷، ۲۹، ۳۰

آیات

① ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾

(پارہ: ۷ رکوع: ۱۹ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۲)

② ﴿وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۷ سورۂ قیامۃ جلالین ص: ۴۸۲) ✦

③ ﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ﴾

(پارہ: ۳۰ رکوع: ۸ سورۂ تطفیف جلالین ص: ۴۹۳)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ نگاہیں اللہ کا ادراک نہیں کرتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی رؤیت نہیں ہوگی اور دوسری و تیسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رؤیت ہوگی، چنانچہ دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ بہت سے بارونق چہرے قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین کو قیامت کے روز اللہ کا دیدار نصیب ہوگا اور تیسری آیت میں ارشاد ہے کہ قیامت کے دن کفار اپنے رب کے دیدار سے محروم رہیں گے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین دیدار سے محروم نہیں ہوں گے، ان کو حق تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دیدار سے محرومی کفر کی وجہ سے ہوگی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کی وجہ سے دیدار نصیب ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر قیامت کے

روز مؤمنین کو رؤیت نصیب نہ ہوتی تو کفار کو محرومی کے ساتھ عار نہ دلائی جاتی، کفار کو دیدار سے محرومی کی عار دلانا اس بات کی دلیل ہے کہ مؤمنین کو دیدار نصیب ہوگا۔

(کمافی تفسیر الخازن)

بہر حال ان آیات میں بظاہر تعارض ہے کہ پہلی آیت سے رؤیت باری تعالیٰ کی نفی ہوتی ہے اور اخیر کی دونوں آیتوں سے اثبات ہوتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے چھ جواب ہیں:

① نفی دنیا میں ہے اور اثبات آخرت میں ہے، یعنی لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ فِي الدُّنْيَا، دنیا میں آنکھیں اللہ کا ادراک نہیں کرتی ہیں، یعنی دنیا میں حق تعالیٰ کی رؤیت نہیں ہوتی ہے، البتہ آخرت میں رؤیت ہوگی، اخیر کی دونوں آیتوں میں یَوْمَئِذٍ کی قید سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اثبات رؤیت آخرت سے متعلق ہے، یہ توجیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں "لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ فِي الدُّنْيَا وَهُوَيُرٰى فِي الْاٰخِرَةِ" اثبات ونفی کا محل مختلف ہونے کی وجہ سے کوئی تعارض نہیں رہا۔ (تفسیر خازن)

② آیت اولیٰ میں نفی ادراک کی ہے اور اخیر کی دو آیتوں میں اثبات نظر ورؤیت کا ہے، ادراک اور رؤیت میں فرق ہے، ادراک کہتے ہیں کہ کسی شئے کو اس طور پر دیکھنا کہ اس کی حدود و جوانب کا احاطہ ہوجائے اور معلوم ہوجائے کہ طول اتنا ہے، عرض و عمق کی مقدار اتنی ہے، اور یہ اس کی شکل وصورت ہے۔ اور رؤیت کہتے ہیں کسی شئے کا بغیر احاطہ کے معاینہ اور مشاہدہ کر لینے کو، حق تعالیٰ چونکہ حدود و جوانب، صورت وشکل اور جہات وغیرہ سے منزہ ومقدس ہے اس لئے حق تعالیٰ کا ادراک نہیں ہوگا، البتہ رؤیت ہوجائے گی کیونکہ رؤیت بغیر احاطہ حدود و جوانب کے ہوجاتی ہے۔

جمہور مفسرین رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک تفسیر یہی نقل کی ہے "قَالَ: لَاتُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ لَایُحِیْطُ بَصَرُ اَحَدٍ بِاللّٰہِ تَعَالٰی" پس جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں اور جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(تفسیر خازن، مدارک، روح المعانی)

❸ قیامت کے دن اللہ کا دیدار اللہ کی اجازت پر موقوف ہوگا، جب تک حق تعالیٰ ادراک کی اجازت نہیں دیں گے اس وقت تک نگاہیں ادراک نہیں کریں گی اور جب اجازت مل جائے گی تو ادراک ہوگا، پس پہلی آیت میں نفی ادراک قبل الاذن پر محمول ہے اور اخیر کی آیتوں میں اثبات ادراک بعد الاذن پر محمول ہے، فلا تعارض۔

(روح المعانی)

❹ حضرت ضرار بن عمرو الکوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آیت اولیٰ میں آنکھوں کے ذریعہ ادراک و رؤیت کی نفی کی گئی ہے کہ آنکھیں ان کا ادراک نہیں کریں گی، ہوسکتا ہے حق تعالیٰ قیامت کے دن حواس خمسہ کے علاوہ کوئی حاسہ سادسہ پیدا فرمادیں جس سے اللہ کا دیدار کیا جائے، پس نفی رؤیت بحاسۃ البصر کی ہے اور اثبات رؤیت بحاسۃ غیر البصر کا ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر، روح المعانی)

❺ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، آیت اولیٰ کفار سے متعلق ہے کہ کفار کی نگاہوں کو اللہ کی رؤیت نصیب نہیں ہوگی اور دوسری دونوں آیتیں مؤمنین کے حق میں ہیں کہ ان کی نگاہیں اللہ کا دیدار کریں گی، اس کی تائید تیسری آیت "کَلَّآ اِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ" سے ہوتی ہے کہ کفار اس دن اپنے رب کے دیدار سے محروم رہیں گے اور اختلاف اشخاص کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔

(ہذا التوجیہ مستفاد من حاشیۃ جلالین رقم ۱۱، ص: ۱۲۲ بقولہ ولا فی الاشخاص الخ)

❻ الابصار جمع کا صیغہ ہے جس پر الف لام داخل ہے اور صیغۂ جمع پر الف لام کا

دخول مفید استغراق و عموم ہوتا ہے، پس لاتدرکہ الابصار کا مطلب لاتدرکہ جمیع الابصار ہوگا کہ تمام آنکھیں اللہ کا ادراک نہیں کریں گی اور مجموعہ کا سلب بعض کے لئے ثبوت پر دلالت کرتا ہے جیسے کہا جاتا ہے "اِنَّ زَیْدًا مَا ضَرَبَهُ کُلُّ النَّاسِ" زید کو سب لوگوں نے نہیں مارا، اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ بعض نے مارا ہے، پس اسی طرح آیت شریفہ میں جب کہا گیا کہ سب آنکھیں اللہ کا ادراک نہیں کریں گی، اس سے یہ ثابت ہوا کہ بعض آنکھیں ادراک کریں گی، پس آیت اولیٰ میں مجموعہ کی نفی ہے اور دوسری دو آیتوں میں بعض کے لئے اثبات ہے، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر)

گناہ کی سزا اس کے مثل ملے گی یا زیادہ؟

پارہ نمبر: ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۹، ۲۴

① ﴿ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا ﴾

(پارہ: ۸ رکوع: ۷ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۹)

② ﴿ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا ﴾

(پارہ: ۱۱ رکوع: ۸ سورۂ یونس [illegible])

③ ﴿ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا ﴾

(پارہ: ۲۴ رکوع: ۱۰ سورۂ مؤمن۔ (غافر) جلالین ص: ۳۹۴)

④ ﴿ وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ ﴾

(پارہ: ۲۵ رکوع: ۵ سورۂ شوریٰ جلالین ص: ۴۰۴) ✦

⑤ ﴿ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴾ (پارہ: ۱۲ رکوع: ۲ سورۂ ہود جلالین ص: ۱۸۱)

⑥ ﴿ يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ (پارہ: ۱۹ رکوع: ۴ سورۂ فرقان جلالین ص: ۳۰۸)

آیت نمبر ۱ تا ۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ برائی کی سزا اسی کے مثل دی جائے گی اور آیت نمبر ۵ و ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کا عذاب بڑھا کر دیا جائے گا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ جرم اور سزا میں مماثلت کمیت کے اعتبار سے ہے اور تضاعف وزیادتی کیفیت کے اعتبار سے ہے اور جب دو متعارض چیزوں کی جہت بدل جائے تو تعارض نہیں رہتا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک گناہ کی سزا کمیت اور مقدار کے اعتبار سے برابر ملے گی، ایسا نہیں ہوگا کہ ایک گناہ کو دو گناہ لکھ کر دوگنی سزا دیدی جائے، البتہ کیفیت کے اعتبار سے وہ ایک ہی سزا بہت شدید ہوگی۔ (بیان القرآن)

❷ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، مماثلت مؤمن کے حق میں ہے اور تضاعف کافر کے لئے، مؤمن کو ایک جرم کی سزا اسی کے برابر ملے گی اور کافر کے گناہوں کی سزا کفر کی وجہ سے بڑھادی جائے گی۔ (روح المعانی وخازن)

یہ پہلی تین آیات اور اخیر کی دونوں آیتوں کے مابین تعارض کے جواب ہیں رہی چوتھی آیت "وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَ صْلَحَ الخ" سو یہ تو معارض ہی نہیں ہے اس لئے کہ یہ آخرت کی سزا سے متعلق نہیں بلکہ دنیا میں اگر کوئی کسی کے ساتھ برائی کرے تو اس کو اسی کے مثل برائی کر کے انتقام لینے کی اجازت دی گئی ہے جیسا کہ آیت کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے۔

گناہ گار قیامت کے روز صرف اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے گا یا دوسروں کا بھی؟

پارہ نمبر: ۸، ۱۴، ۱۵، ۲۰، ۲۲، ۲۳، ۲۷

آیات

① ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (پارہ: ۸ رکوع: ۷ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۲۹)

② ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (پارہ: ۱۵ رکوع: ۲ سورۂ اسراء جلالین ص: ۲۳۱)

③ ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (پارہ: ۲۲ رکوع: ۱۵ سورۂ فاطر جلالین ص: ۳۶۵)

④ ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (پارہ: ۲۳ رکوع: ۱۵ سورۂ زمر جلالین ص: ۳۸۶)

⑤ ﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۷ سورۂ نجم جلالین ص: ۴۳۹) ✦

⑥ ﴿لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (پارہ: ۱۴ رکوع: ۹ سورۂ نحل جلالین ص: ۲۱۷)

⑦ ﴿وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ﴾

(پارہ: ۲۰ رکوع: ۱۳ سورۂ عنکبوت جلالین ص: ۳۳۶)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ گار صرف اپنے گناہ کا بوجھ اٹھائے گا، دوسرے کے گناہوں کا نہیں، اور اخیر کی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ گار لوگ اپنے گناہوں کے ساتھ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ پہلی پانچ آیات اس شخص کے بارے میں ہیں جو خود گناہ کرتا ہے مگر دوسروں کو گناہوں پر نہیں ابھارتا، ایسے لوگ صرف اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں گے اور اخیر کی دو آیتیں ان لوگوں کے حق میں ہیں جو خود بھی گمراہ ہوں اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں، ایسے لوگ اپنی گمراہی کے بوجھ کے ساتھ ساتھ دوسروں کو گمراہ کرنے کا بوجھ بھی اٹھائیں گے۔

اضلال غیر چونکہ خود اسی کا فعل ہے اور گناہ ہے تو اس کا بوجھ بھی خود اس کو اٹھانا پڑے گا اور یہ اپنے ہی گناہ کا بوجھ ہوا، دوسرے کے گناہ کا نہیں، دوسرا آدمی جو اس کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوا وہ اپنی گمراہی کا بوجھ خود اٹھائے گا، پس پہلی پانچ آیتوں اور اخیر کی دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ (بیان القرآن، صاوی)

قیامت کے دن لوگوں سے سوال کیا جائے گا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۸، ۱۴، ۲۰، ۲۳، ۲۵، ۲۷

① ﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ﴾

(پارہ: ۸ رکوع: ۸ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۲۹)

② ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

(پارہ: ۱۴ رکوع: ۶ سورۂ حجر جلالین ص: ۲۱۵)

③ ﴿تَاللّٰهِ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ﴾ (پارہ: ۱۴ رکوع: ۱۳ سورۂ نحل جلالین ص: ۲۱۰)

④ ﴿وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (پارہ: ۱۴ رکوع: ۱۹ سورۂ نحل جلالین ص: ۲۲۵)

⑤ ﴿وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ﴾ (پارہ: ۲۳ رکوع: ۶ سورۂ صافات جلالین ص: ۳۷۴)

⑥ ﴿سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ﴾

(پارہ: ۲۵ رکوع: ۸ سورۂ زخرف جلالین ص: ۴۰۶) ✦

⑦ ﴿وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ﴾

(پارہ: ۲۰ رکوع: ۱۱ سورۂ قصص جلالین ص: ۳۳۴)

⑧ ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۲ سورۂ رحمٰن جلالین ص: ۴۴۴)

آیت نمبر ۱ تا ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں سے ان کے اعمال

وغیرہ کے متعلق سوال کیا جائے گا اور آیت نمبر ۷ و ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کسی انسان یا جن سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے چار جواب ہیں:

① سوال دو قسم کا ہوتا ہے:

(۱) سوالِ استعلام (یعنی کسی نامعلوم شئے کو معلوم کرنے کے لئے سوال کرنا)،

(۲) سوالِ توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکانے کے طور پر سوال کرنا) پہلی چھ آیتوں میں سوالِ توبیخ کا اثبات مراد ہے اور اخیر کی دو آیتوں میں سوال استعلام کی نفی ہے، یعنی معلوم کرنے کے لئے کسی سے کوئی سوال نہیں ہوگا اس لئے کہ حق تعالیٰ کو ساری مخلوق کے اعمال و افعال کا علم ہے، معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں البتہ زجر و توبیخ کے طور پر حق تعالیٰ مخلوق سے سوال کریں گے کہ تم نے فلاں گناہ کیوں کیا فلاں نیکی کیوں نہیں کی وغیرہ وغیرہ۔ (جمل وغیرہ)

البتہ پہلی آیت میں جو "ولنسئلن المرسلین" فرمایا گیا ہے کہ ہم رسولوں سے بھی سوال کریں گے، وہ سوال یہ ہوگا کہ جب تم نے اپنی قوم کو دعوت ایمان دی تو تمہاری قوم نے کیا جواب دیا؟ تمہارا کہنا مانا یا نہیں اور اس سوال سے مقصود رسولوں کو توبیخ کرنا نہیں ہوگا بلکہ ان کی امتوں کے کفار کو زجر و توبیخ کرنا مقصود ہوگا۔

(روح المعانی)

② اختلاف اوقات پر محمول ہے، قیامت کا دن بہت طویل ہوگا، ایک وقت ایسا ہوگا کہ کسی سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا، پھر دوسرے وقت میں سوالات شروع ہو جائیں گے، پس کوئی تعارض نہیں ہے۔ (جلالین شریف)

③ اختلاف مکان پر محمول ہے، یعنی میدان حشر میں ایک موقف میں تو کسی سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا، جب دوسرے موقف یعنی موقف حساب میں پہنچیں گے وہاں سوال کیا جائے گا، حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہی توجیہ فرمائی ہے۔ (روح المعانی)

④ اخیر کی دونوں آیتوں سے سوال عن الاعمال کی نفی مراد ہے اور جن آیات میں سوال کا ذکر ہے وہاں سوال عن الدواعی والموانع مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا بلکہ دواعی الی الاعمال السیئۃ اور موانع عن الاعمال الحسنۃ کے متعلق سوال ہوگا کہ کونسا داعیہ پیدا ہوا تھا جو تم نے فلاں گناہ کیا اور کونسا مانع پیش آگیا تھا جو تم نے فلاں عمل صالح نہیں کیا، پس کوئی تعارض نہیں کیونکہ جس سوال کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر)

کفار کی دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۸، ۱۳، ۲۴

① ﴿قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ قَالَ اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ﴾

(پارہ: ۸ رکوع: ۹ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۳۰) ✦

② ﴿وَمَادُعَآءُ الْکَافِرِیْنَ اِلَّافِیْ ضَلَالٍ﴾ (پارہ: ۱۳ رکوع: ۸ سورۂ رعد جلالین ص: ۲۰۲)

③ ﴿وَمَادُعَآءُ الْکَافِرِیْنَ اِلَّافِیْ ضَلَالٍ﴾

(پارہ: ۲۴ رکوع: ۱۰ سورۂ مؤمن (غافر) جلالین ص: ۳۹۴)

تشریح تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی دعا قبول ہوجاتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے رئیس الکفار ابلیس لعین کی دعا قبول فرمائی ہے، اس نے دعا مانگی "رَبِّ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ" اے رب مجھ کو قیامت کے دن تک مہلت دینا، یعنی قیامت تک زندہ رکھنا۔ حق تعالیٰ نے دعا قبول فرماتے ہوئے فرمایا "اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ" تجھ کو مہلت دیدی گئی ہے۔ تو جب ابلیس کی دعا قبول ہوگئی تو کفار کی دعا بدرجہ اولیٰ قبول ہوسکتی ہے، ابونصر دبوسی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر فقہاء اسی کے قائل ہیں مگر دوسری دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کی دعا قبول نہیں ہوتی اس کی دعا بے کار اور باطل ہے، "ضلال" سے مراد ضیاع و بطلان ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہورہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

① اخیر کی دو آیتوں میں دعا سے مراد بتوں سے دعا مانگنا ہے، کافر اگر اللہ سے دعا کرے تو قبول ہو جاتی ہے اور اگر بتوں سے دعا کرے تو ضائع اور باطل ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (روح المعانی)

② پہلی آیت میں امورِ دنیا سے متعلق دعا کرنا اور اخیر کی دو آیتوں میں امورِ آخرت سے متعلق دعا کرنا مراد ہے یعنی کافر اگر دنیا سے متعلق دعا کرے تو وہ قبول ہو جاتی ہے جیسا کہ ابلیس کی دعا حیاتِ دنیوی سے متعلق تھی اس لئے قبول ہوگئی اور اگر امورِ آخرت سے متعلق مثلاً مغفرت یا رفعِ عذاب وتخفیفِ عذاب کی دعا کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتی جیسا کہ آیت ثالثہ کے سباق "يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ" سے معلوم ہوتا ہے۔ (روح المعانی وغیرہ)

③ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ کہنا قبولیت دعا نہیں ہے بلکہ یہ تو ابلیس کی تقدیر اور قضا کا بیان ہے، یعنی ہم نے تیری تقدیر میں قیامت تک زندگی پہلے ہی سے لکھ دی ہے، اگر تو دعا نہ بھی کرتا تب بھی قیامت تک زندہ رہتا۔ انك من المنظرين جملہ اسمیہ لانا پھر اس کو ان کے ساتھ مقید کرنا اسی پر دال ہے، اگر یہ جواب قبولیت دعا کے طور پر دیا جاتا تو "قد انظرتك" جملہ فعلیہ کے ساتھ ہونا چاہئے تھا کہ میں نے تجھ کو مہلت دیدی ہے، تیری دعا قبول کر لی گئی ہے، بجائے اس کے "انك من المنظرين" ارشاد فرمایا، مطلب یہ ہے کہ تو تو منظرین میں سے ہے ہی۔ معلوم ہوا کہ قبولیت دعا نہیں ہے پس یہ آیت اخیر کی دونوں آیتوں کے معارض نہیں ہے۔

(روح المعانی، النبراس، وشرح عقائد)

سماوات وارض کی تخلیق چھ دن میں ہوئی یا آٹھ دن میں؟

پارہ نمبر: ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۹، ۲۱، ۲۴، ۲۶، ۲۷

آیات

① ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾

(پارہ: ۸ رکوع: ۱۴ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۳۴)

② ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾

(پارہ: ۱۱ رکوع: ۶ سورۂ یونس جلالین ص: ۱۷۰)

③ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾

(پارہ: ۱۲ رکوع: ۱ سورۂ ہود جلالین ص: ۱۸۰)

④ ﴿اَلَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾

(پارہ: ۱۹ رکوع: ۳ سورۂ فرقان جلالین ص: ۳۰۷)

⑤ ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (پارہ: ۲۱ رکوع: ۱۴ سورۂ سجدہ جلالین ص: ۳۴۹)

⑥ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ﴾ (پارہ: ۲۶ رکوع: ۱۷ سورۂ ق جلالین ص: ۴۳۱)

⑦ ﴿وَالَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۷ سورۂ حدید جلالین ص: ۴۴۹) ✦

⑧ ﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ ...... اِلٰى اَنْ قَالَ: وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ...... اِلٰى اَنْ قَالَ: فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾

(پارہ: ۲۴ رکوع: ۱۶ سورۂ حم سجدۃ (فصلت) جلالین ص: ۳۹۷)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۷ سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، زمینوں اور مابینہما کی تخلیق چھ دن میں فرمائی اور آیت نمبر ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ آٹھ دن میں پیدا کیا، چنانچہ آیت نمبر ۸ میں ارشاد ہے کہ دو دن میں زمین کو پیدا کیا اور چار دن میں پہاڑوں اور کھانے پینے کی چیزوں کو پیدا کیا، اس کے بعد دو دن میں سات آسمان بنائے، کل مجموعہ آٹھ دن ہو جاتا ہے، پس یہ آیت پہلی سات آیتوں کے بظاہر معارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت نمبر ۸ میں **فی اربعة ایام** میں تمام مضاف محذوف ہے ای **فی تتمة أربعة ایام** جیسا کہ علامہ زجاج نے اس کی تصریح کی ہے، یعنی زمین اور پہاڑوں وغیرہ کی پیدائش پورے چار دن میں ہوئی اس طور پر کہ دو دن میں زمین اور دو دن میں پہاڑ وغیرہ پیدا کیے، کل چار دن ہو گئے، اس کو حق تعالیٰ نے یوں فرما دیا کہ دو دن میں زمین اور چار دن میں جبال و اقوات کو پیدا کیا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ محاورات میں بولا جاتا ہے "**سرت من البصرة الی بغداد فی عشرة و الکوفة فی خمس عشرة**" کہ میں بصرہ سے دس دن میں بغداد پہنچا اور پندرہ دن میں کوفہ پہنچا، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ پندرہ دن دس دن کے علاوہ ہیں اور کوفہ پہنچنے تک پچیس دن ہو گئے۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ پندرہ دن پہلے دس دن ملا کر ہوئے ہیں کہ دس دن بغداد پہنچنے میں صرف ہوئے اور پانچ دن کوفہ پہنچنے میں، کل ملا کر پندرہ دن ہو گئے۔

(تفسیر مدارک)

یا جیسا کہ یوں کہا جاتا ہے کہ دو سالوں میں تو اس لڑکے کا دودھ چھڑایا اور چار

سال میں مکتب میں بٹھا دیا، ظاہر ہے کہ مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ان دو سالوں کے علاوہ چار سال مراد ہیں جس سے کل چھ سال ہو جائیں، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ دودھ چھڑانے کے دو سال بعد جب لڑکا چار سال کا ہو گیا تو مکتب میں بٹھا دیا۔ پس یہ چار سال پہلے دو سال کو ملا کر مراد ہوتے ہیں، اسی طرح آیت شریفہ میں اربعۃ ایام تخلیق ارض کے دو دنوں کو ملا کر مراد ہیں۔ (تفسیر بیان القرآن)

❷ علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے توجیہ یہ کی ہے کہ "اربعۃ ایام" جعل مذکور کا ظرف نہیں ہے بلکہ کائن محذوف سے متعلق ہو کر مبتدا مقدر کی خبر واقع ہے، عبارت اس طرح ہے "وكل ذلك من خلق الارض ومابعده كائن في اربعة ايام" اور یہ دراصل تفصیل کا خلاصہ ہے جیسے حساب کرنے کے بعد اخیر میں کل میزان لگا دی جاتی ہے، ایسا ہی یہاں پر ہے کہ دو دن میں زمین کو پیدا کیا اور دو دن میں جبال و اقوات کو ان سب ایام کی کل میزان اربعۃ ایام ہو گئی، لیکن سوال یہ ہے کہ جب چند اعداد کی میزان لگائی جاتی ہے تو ان سب اعداد کی تصریح کرنا ضروری ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے "سرت من البصرة الى واسط في يومين، ومن واسط الى الكوفة في يومين، فذلك اربعة ايام" میں بصرہ سے واسط تک دو دن میں پہنچا اور واسط سے کوفہ تک دو دن ہیں، پس یہ کل ملا کر چار دن ہو گئے اور آیت شریفہ میں صرف ارض کے متعلق یومین کی تصریح ہے، جبال و اقوات کے متعلق یومین نہیں فرمایا تو اخیر میں میزان لگانا کیسے درست ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میزان لگانے میں دونوں عددوں کا علم کافی ہوتا ہے، الفاظ میں تصریح ضروری نہیں ہے۔

(تفسیر روح المعانی)

بہر حال ان دونوں توجیہوں کے سامنے آنے کے بعد واضح ہو گیا کہ اس آیت نمبر ۸ میں بھی ستۃ ایام ہی مراد ہیں، پس یہ آیت آیات سابقہ کے معارض نہیں رہی۔

حضرت لوط علیہ الصلاۃ والسلام کی نصیحت پر ان کی قوم نے کیا جواب دیا؟

پارہ نمبر: ۸، ۱۹، ۲۰

آیات

① ﴿وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ﴾

(پارہ: ۸ رکوع: ۱۷ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۳۶)

② ﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا آلَ لُوْطٍ﴾

(پارہ: ۱۹ رکوع: ۱۹ سورۂ نمل جلالین ص: ۳۲۲) ✦

③ ﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ﴾

(پارہ: ۲۰ رکوع: ۱۵ سورۂ عنکبوت جلالین ص: ۳۳۷)

تشریح تعارض

پہلی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت کی اور لواطت سے منع کیا تو قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی آل کو بستی سے نکال دو، اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا جواب نہیں دیا تھا کیونکہ نفی و استثناء کے ساتھ کلام کرنا مفید حصر ہوتا ہے، یعنی جواب قوم منحصر ہے آل لوط کو بستی سے نکالنے میں اور آیت نمبر ۳ میں فرمایا کہ قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ اگر آپ سچے ہیں تو ہمارے اوپر اللہ کا عذاب نازل کرا دیجئے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا جواب نہیں تھا، پس ان دونوں حصروں میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ اختلاف زمان پر محمول ہے، حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو بار بار نصیحت و توبیخ فرمائی، پہلی مرتبہ جب نصیحت فرمائی تو قوم نے صرف یہ جواب دیا "ائتنا بعذاب اللّٰہ ان کنت من الصّٰدقین" جو کہ آیت نمبر۳ میں مذکور ہے، اس کے بعد جب دوبارہ نصیحت و توبیخ کی تو قوم نے صرف یہ جواب دیا، "اَخْرِجُوْهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ الخ" امام ابو حیان رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کی اتباع میں علامہ ابوالسعود رحمۃ اللہ علیہ نے یہی توجیہ فرمائی ہے، دلیل اس توجیہ کی یہ ہے کہ جب کسی کو وعظ و نصیحت اور زجر و توبیخ کی جاتی ہے تو پہلے نمبر پر تو وہ تکذیب و استہزاء کرتا ہے اور ان کا قول "ائتنا بعذاب اللّٰہ ان کنت من الصادقین" تکذیب و استہزاء ہی کے قبیل سے ہے، اس کے بعد جب دوبارہ وعظ و توبیخ کی جاتی ہے تو آدمی غصہ ہو کر اور تنگ آ کر انتقام و تعذیب پر آمادہ ہوتا ہے کہ اس ناصح کو بستی سے نکال دینا چاہئے، یا قتل کر دینا چاہئے اور قوم لوط علیہ الصلاۃ والسلام کا یہ قول "اخرجوھم من قریتکم" انتقام و تعذیب ہی کے قبیل سے ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

❷ اختلاف ازمان ہی پر محمول ہے مگر صورت یہ ہے کہ جس وقت حضرت لوط علیہ السلام قوم کو نصیحت کرتے تھے اس وقت تو وہ لوگ ان کو صرف یہ جواب دیتے تھے کہ "ائتنا بعذاب اللّٰہ ان کنت من الصادقین" اور جب آپس میں بیٹھ کر مشورہ کرتے تھے اور ایک دوسرے سے معلوم کرتے تھے کہ ان کا کیا کرنا چاہئے تو آپس میں ان کا جواب صرف یہ ہوتا تھا "اَخْرِجُوْهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ" پس پہلی دو آیتیں مشورہ کے وقت پر محمول ہیں اور تیسری آیت حضرت لوط علیہ السلام کے نصیحت کرنے کے وقت پر محمول ہے۔ (روح المعانی)

❸ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، یعنی ان دونوں جوابوں میں سے ایک جواب تو قوم کے امراء اور سرداروں کا ہوتا تھا اور دوسرا جواب عوام الناس دیا کرتے تھے، یا تو کہا جائے کہ امراء اور خواص تو "ائتنا بعذاب اللّٰہ" کہتے تھے اور عوام الناس "اخرجوهم من قريتكم" کہا کرتے تھے، یا اس کے برعکس۔ (روح المعانی)

قوم ثمود پر کون سا عذاب آیا؟

پارہ نمبر: ۸، ۱۲، ۱۴، ۲۴، ۲۷، ۲۹

① ﴿فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ﴾

(پارہ: ۸ رکوع: ۱۷ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۳۶) ✦

② ﴿وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ﴾

(پارہ: ۱۲ رکوع: ۶ سورۂ ہود جلالین ص: ۱۸۵)

③ ﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ﴾ (پارہ: ۱۴ رکوع: ۶ سورۂ حجر جلالین ص: ۲۱۴)

④ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۹ سورۂ قمر جلالین ۴۴۲)

⑤ ﴿فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۵ سورۂ حاقہ جلالین ص: ۴۷۱) ✦

⑥ ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾

(پارہ ۲۴ رکوع: ۱۶: سورۂ حم سجدہ جلالین ص: ۳۹۷)

⑦ ﴿فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾

(پارہ: ۲۴ رکوع: ۱۶: سورۂ حم سجدہ جلالین ص: ۳۹۸)

⑧ ﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱، سورۂ ذاریات جلالین ص: ۴۳۴)

ان آیات میں قوم ثمود پر آنے والے عذاب کو بیان فرمایا ہے مگر عذاب کی

نوعیت کیا تھی؟ اس بارے میں یہ آیات بظاہر متعارض ہیں، آیت نمبر ا سے معلوم ہوتا ہے کہ رجفۃ سے ہلاک کیا گیا، جس کے معنی زلزلہ شدیدہ کے آتے ہیں اور آیت نمبر ۲ و ۳ و ۴ و ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ صیحۃ اور طاغیۃ سے ہلاک کیا گیا، صیحہ اور طاغیہ کے معنی صوت شدید اور چیخ کے آتے ہیں۔ طاغیة طغي يطغو سے ماخوذ ہے بمعنی سر کشی کرنا، حد سے تجاوز کرنا۔ مراد اس سے ایسی آواز جو شدت میں تمام آوازوں سے تجاوز کر جانے والی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے طاغیۃ کی تفسیر صیحہ سے منقول ہے اور آیت نمبر ٦ و ۷ و ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ صاعقہ سے ہلاک کیا گیا، صاعقہ کے معنی آسمان سے گرنے والی بجلی کے آتے ہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ قوم ثمود پر جب عذاب آیا تو اولا حضرت جبریل علیہ الصلاۃ والسلام نے آسمان سے ایک چیخ ماری، اس چیخ کی وجہ سے زمین میں زلزلہ پیدا ہوا جس سے یہ لوگ ہلاک ہوگئے، پس ہلاکت کا سبب رجفہ اور رجفہ کا سبب صیحہ ہے، پس کہیں تو سبب قریب یعنی رجفہ کو ذکر کر دیا اور کسی جگہ سبب بعید یعنی صیحہ کو ذکر فرما دیا اور صاعقہ کے معنی لغت میں مطلق عذاب کے بھی آتے ہیں اس لئے بعض آیات میں اس کو صاعقہ سے تعبیر فرما دیا اور چونکہ یہ عذاب حد سے متجاوز تھا اس لئے آیت نمبر ۵ میں اس کو طاغیہ سے تعبیر کر دیا گیا، پس کوئی تعارض نہیں۔

(روح المعانی، وصاوی وغیرہ)

حضرت شعیب علیہ الصلاۃ والسلام کی قوم کون سے عذاب سے ہلاک ہوئی؟

پارہ نمبر: ۹، ۱۲، ۱۹، ۲۰

آیات

① ﴿فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ﴾

(پارہ: ۹ رکوع: ۱، سورۃ اعراف جلالین ص: ۱۳۷)

② ﴿فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ﴾ (پارہ: ۲۰ رکوع: ۱۶ سورۃ عنکبوت جلالین ص: ۳۳۸) ✦

③ ﴿وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ﴾

(پارہ: ۱۲ رکوع: ۸ سورۃ ہود جلالین ص: ۱۸۷) ✦

④ ﴿فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ (پارہ: ۱۹ رکوع: ۱۴ سورۃ شعراء جلالین ص: ۳۱۵)

تشریح تعارض

ان آیات میں حضرت شعیب علیہ الصلاۃ والسلام کی قوم پر آنے والے عذاب کا ذکر ہے مگر نوعیت عذاب میں یہ آیات بظاہر متعارض ہیں، آیت نمبر ۱ و ۲ میں رجفۃ (زلزلہ شدیدہ) کا ذکر ہے، آیت نمبر ۳ میں ہے کہ صیحہ (چیخ) سے ہلاک کیا گیا اور آیت نمبر ۴ میں ہے کہ یوم الظلہ کے عذاب نے ان کو پکڑ لیا، ظلہ کے معنی سائے کے آتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ سائے کے عذاب سے ہلاک کیا گیا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس مقام پر بھی وہی توجیہ جاری ہوگی جو اوپر قوم ثمود کے بارے میں ذکر کی گئی

کہ حضرت جبریل علیہ السلام کی چیخ سے زلزلہ پیدا ہوا جس سے یہ لوگ ہلاک ہو گئے، پہلی دو آیتوں میں سبب قریب اور آیت نمبر ۳ میں سبب بعید کی طرف نسبت کر دی گئی۔ رہی چوتھی آیت جس میں عذاب یوم الظلۃ کا ذکر ہے تو یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی دوسری قوم اصحاب ایکہ کے بارے میں ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت شعیب علیہ الصلاۃ والسلام کو اصحاب ایکہ اور اہل مدین دونوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا تھا، اہل مدین تو صیحہ اور رجفہ سے ہلاک ہوئے اور اصحاب ایکہ کو ظلہ کے عذاب سے ہلاک کیا، ظلہ کے معنی سائے کے ہیں، سایہ سے مراد بادل کا سایہ ہے جو آگ بن کر ان پر برس پڑا تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ سے روایت ہے کہ اصحاب ایکہ پر اللہ نے شدید گرمی نازل فرمائی جس سے ان کا دم گھٹنے لگا تو وہ گھروں میں داخل ہو گئے، گرمی گھروں کے اندر گھس گئی، وہ وہاں سے نکلے اور بھاگ کر جنگل میں چلے گئے تو اللہ نے ایک بادل بھیجا، جس نے ان پر سایہ کر لیا، ان کو ٹھنڈک اور لذت محسوس ہوئی تو ایک نے دوسرے کو پکارا کہ یہاں آجاؤ، یہاں راحت ہے، سب لوگ اس بادل کے سائے کے نیچے جمع ہو گئے تو اللہ نے اس بادل کو آگ بنا کر ان پر نازل کر دیا، وہ آگ ان سب کو کھا گئی۔

(اخرجہ عبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم والحاکم، روح المعانی، ومظہری، جمل وصاوی وغیرہ)

حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کا عصا بطور معجزہ باریک اور چھوٹا سانپ تھا یا بڑا اژدھا؟

پارہ نمبر: ۹، ۱۶، ۱۹، ۲۰

آیات

① ﴿ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (پارہ: ۹ رکوع: ۳ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۳۸)

② ﴿ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴾

(پارہ: ۱۹ رکوع: ۶ سورۂ شعراء جلالین ص: ۳۱۰) ✦

③ ﴿ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴾ (پارہ: ۱۶ رکوع: ۱۰ سورۂ طٰہٰ جلالین ص: ۲۶۱) ✦

④ ﴿ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا ﴾

(پارہ: ۱۹ رکوع: ۱۶ سورۂ نمل جلالین ص: ۳۱۷)

⑤ ﴿ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا ﴾

(پارہ: ۲۰ رکوع: ۷ سورۂ قصص جلالین ص: ۳۲۹)

تشریح تعارض

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا معجزہ کے طور پر جو سانپ بن جاتا تھا اس کو آیت نمبر ۱ و ۲ میں ثعبان سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی بڑے سانپ کے آتے ہیں، جس کو اژدھا کہا جاتا ہے اور آیت نمبر ۳ میں حیۃ فرمایا جس کے معنی مطلق سانپ خواہ بڑا ہو یا چھوٹا، اور آیت نمبر ۴ و ۵ میں جآن سے تعبیر فرمایا جس کے معنی پتلے اور چھوٹے سانپ کے آتے ہیں، پس ان میں سے تیسری آیت تو معارض نہیں ہے کیونکہ لفظ حیۃ تو ثعبان اور جآن دونوں کو شامل ہے، البتہ آیت نمبر ۱ و ۲ اور آیت نمبر ۴

میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ اختلاف احوال یا ازمان پر محمول ہے، یعنی ابتداء میں تو وہ چھوٹا سانپ بنا جو عصا کے بقدر موٹا تھا، پھر وہ پھولتا گیا اور بڑا ہوتا گیا یہاں تک کہ بہت بڑا اژدھا بن گیا، حالت ابتداء کے اعتبار سے جآن کہہ دیا گیا اور حالت انتہاء کے اعتبار سے ثعبان سے تعبیر کر دیا گیا۔ (بیضاوی، خازن، مدارک وغیرہ)

❷ اختلاف جہت پر محمول ہے، جثہ اور ہیئت کے اعتبار سے وہ بڑا اژدھا تھا اور سرعت مشی (تیز دوڑنے) کے اعتبار سے پتلے سانپ کی طرح تھا، پتلا سانپ بہ نسبت موٹے سانپ کے تیز دوڑتا ہے، پس وہ سانپ ثعبان تھا من جهة الجثة و الهيئة اور جآن تھا من جهة سرعة المشي، ولاتعارض بعد اختلاف الجهات۔ (خازن، مدارک، جلالین وغیرہ)

جادوگروں نے ایمان لاتے وقت ''آمنا برب موسیٰ وہارون'' کہا تھا یا ''برب ہارون وموسیٰ''؟

پارہ نمبر: ۹، ۱۶، ۱۹

آیات

① ﴿ قَالُوْا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ رَبِّ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ ﴾

(پارہ: ۹ رکوع: ۴ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۳۸)

② ﴿ قَالُوْا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ رَبِّ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ ﴾

(پارہ: ۱۹ رکوع: ۷ سورۂ شعراء جلالین ص: ۳۱۱) ✦

③ ﴿ قَالُوْا آمَنَّا بِرَبِّ هَارُوْنَ وَمُوْسٰى ﴾ (پارہ: ۱۶ رکوع: ۱۲ سورۂ طٰہٰ جلالین ص: ۲۶۴)

تشریح تعارض

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرنے والے جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کی حقانیت کو پہچان لیا تو ایک دم سجدہ میں گر گئے اور مشرف بایمان ہو گئے، انہوں نے ایمان کا اظہار کن الفاظ میں کیا، اس بارے میں پہلی دو آیتوں میں تو فرمایا کہ انہوں نے کہا ''آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ رَبِّ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ'' یعنی موسیٰ علیہ السلام کو ہارون علیہ السلام پر مقدم کیا اور تیسری آیت میں ہے کہ انہوں نے کہا ''آمَنَّا بِرَبِّ هَارُوْنَ وَمُوْسٰى'' یعنی ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام پر مقدم کر کے کہا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ ساحرین کا مقولہ تو "رَبِّ مُوْسٰی وَهَارُوْنَ" ہی ہے، انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مقدم کیا اس لئے کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام سے اشرف ہیں اور نبوت ورسالت میں اصل ہیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام ان کے تابع اور وزیر و معین تھے مگر سورۂ طٰہٰ میں حق تعالیٰ نے رعایت فاصلہ کی وجہ سے "رَبِّ هَارُوْنَ وَمُوْسٰی" فرما دیا، رعایت فاصلہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام اللہ کے چند جملوں کے آخری حروف میں توافق پیدا ہوجائے، چنانچہ اس آیت سے پہلی اور بعد کی آیات کے اخیر میں اعلی، اتی، ابقی، کے الفاظ آئے ہیں اس مناسبت سے رَبِّ هَارُوْنَ وَمُوْسٰی کہہ دیا گیا تاکہ ان سب آیات کے آخری کلمات میں توافق پیدا ہوجائے اگر رَبِّ مُوْسٰی وَهَارُوْنَ کہا جاتا تو توافق پیدا نہ ہوتا۔ (روح المعانی)

❷ ساحرین کا مقولہ رَبِّ هَارُوْنَ وَمُوْسٰی تھا، یعنی انہوں نے ہارون کو موسیٰ پر مقدم کرکے کہا تھا، یا تو اس وجہ سے کہ ہارون علیہ السلام عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے، یا اس وجہ سے کہ اگر رب موسیٰ و ہارون کہتے تو رب موسیٰ کا لفظ سنتے ہی اول وہلہ میں فرعون یہ سمجھتا کہ یہ جادوگر مجھ پر ایمان لا رہے ہیں اس لئے کہ فرعون موسیٰ علیہ السلام کا مجازی رب یعنی پرورش کرنے والا تھا، پس ہارون علیہ السلام کہنے سے پہلے پہلے فرعون یہ خیال کرتا کہ رب موسیٰ سے مراد میری ذات ہے اور یہ لوگ مجھ پر ایمان لا رہے ہیں، اگرچہ وَهَارُوْنَ کہنے کے بعد یہ وہم دور ہوجاتا ہے مگر اول امر میں ایک لمحہ کے لئے تو اس کو یہ وہم باطل ہو ہی جاتا، اس لئے جادوگروں نے اول وہلہ ہی سے اس کے توہم باطل کو ختم کرنے کے لئے ہارون علیہ السلام کو مقدم کیا اور رب ہارون وموسی کہا تاکہ اس لعین ومردود کو ایک لمحہ کے لئے بھی توہم باطل کا موقع نہ ملے۔

بہرحال ساحرین کا مقولہ تو رَبِّ هَارُوْنَ وَمُوْسٰی تھا، مگر حق تعالیٰ نے سورۂ اعراف اور سورۂ شعراء میں ان کے مقولہ کو نقل کرتے وقت موسیٰ کو ان کے اشرف اور

اصل ہونے کی وجہ سے یا رعایت فاصلہ کی وجہ سے مقدم کر کے رَبِّ هَارُوْنَ وَ مُوْسٰى فرما دیا کیونکہ اعراف اور شعراء میں اس آیت سے پہلی اور بعد کی آیات کا اختتام نون کے ساتھ ہے۔ (روح المعانی)

❸ علامہ ابوحیان رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دونوں مقولوں کے قائلین جدا جدا ہیں، جادوگروں کی ایک جماعت نے رب موسیٰ وہارون کہا تھا اور دوسری جماعت نے رب هارون وموسٰى کہا تھا اور جب دو متعارض مقولوں کے قائلین جدا جدا ہوں تو کوئی تعارض نہیں رہتا، لیکن سوال یہ ہے کہ جب قائلین جدا جدا ہیں تو قال بعضهم قال بعضهم کہنا چاہئے تھا، ہر مقولہ کی نسبت سب کی طرف کر کے دونوں جگہ قالوا کیسے کہہ دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں مقولوں کا مقصد ومفہوم چونکہ متحد تھا کہ موسیٰ وہارون دونوں کے رب پر ایمان لانا مقصود تھا نہ کہ تقدیم وتاخیر اس لئے ہر مقولہ کی نسبت سب کی طرف کر دی گئی۔ (روح المعانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر شیطانی وسوسہ کا اثر ہوتا تھا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۹، ۱۴

آیات

① ﴿ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾
(پارہ: ۹ رکوع: ۱۴ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۴۶ و ۱۴۷) ✦

② ﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِيْنَ ﴾
(پارہ: ۱۴ رکوع: ۳ سورۂ حجر جلالین ص: ۲۱۳)

③ ﴿ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴾
(پارہ: ۱۴ رکوع: ۱۹ سورۂ نحل جلالین ص: ۲۲۶)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیجئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں شیطان وسوسہ ڈال سکتا ہے اور آیت نمبر ۲ میں حق تعالیٰ نے شیطان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے مخلص [1] بندوں پر تیرا تسلط نہیں ہے، (تو ان کے قلوب میں وساوس نہیں ڈال سکتا، ان کو ضلالت و معاصی پر آمادہ نہیں کر سکتا۔) اسی طرح آیت نمبر ۳ میں ارشاد

(۱) اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ میں عباد کی اضافت یائے متکلم کی طرف اضافت عہدیہ ہے مراد عباد مخلصین ہیں، جن کا ذکر اس سے اوپر کی آیت اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ میں آیا ہے اس لئے ترجمہ ''مخلص بندوں'' کیا گیا ہے۔ (ماخوذ من حاشیہ بیان القرآن)

ہے کہ اہل ایمان اور اہل توکل پر شیطان کو تسلط حاصل نہیں ہے، ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے مخلص ومتوکل بندوں پر شیطان کا کوئی تسلط وتصرف نہیں چلتا جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اول درجہ میں داخل ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین مخلصین اور اہل توکل وساوس شیطانیہ سے محفوظ رہتے ہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں:

❶ آیت نمبر ا میں "وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ" علی سبیل الفرض والتقدیر کہا گیا ہے کہ اگر بالفرض آپ کو شیطانی وسوسہ آنے لگے تو استعاذہ کیجئے مگر اس کا کبھی وقوع نہیں ہوا، آپ کا قلب مبارک شیطانی وساوس سے بالکل محفوظ رہا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک جگہ ارشاد ہے: "لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ" اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اگر بفرض محال آپ نے شرک کر لیا تو آپ کے سارے اعمال بے کار ہو کر رہ جائیں گے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک کا صدور محال ہے، پس یہ آیت وقوع وسوسہ پر دلالت نہیں کرتی، لہٰذا یہ اخیر کی دونوں آیتوں کے معارض نہیں ہوگی۔

(تفسیر کبیر، روح المعانی، تفسیر خازن)

❷ نزغ شیطان سے مراد مجازاً غصہ وغضب کا پیش آ جانا ہے، شیطانی وسوسہ و تصرف مراد نہیں ہے کہ اگر آپ کو کبھی غصہ لاحق ہو جائے تو آپ اس کے مقتضی پر عمل نہ کیجئے، بلکہ استعاذہ کیجئے اس سے غصہ دور ہو جائے گا، غصہ لاحق ہو جانے کو مجازاً نزغ شیطان سے تعبیر کر دیا گیا، اس کی تائید اس آیت کے شان نزول سے ہوتی ہے جو تفسیر مظہری میں مذکور ہے، حضرت عبد الرحمٰن بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب "خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ الخ" نازل ہوئی جس میں آپ کو معاف کرنے کا

حکم دیا گیا تو آپ نے حق تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا "کَیْفَ یَارَبِّ وَالْغَضَبُ" کہ اے رب اگر غصہ آ جائے تو کیا کروں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی "وَاِمَّا یَنْزِغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ" کہ اگر غصہ آ جائے تو استعاذہ کیجئے، حق تعالیٰ غصہ دور فرما دیں گے، معلوم ہوا کہ آیت میں نزغ شیطان سے مراد غضب ہے، پس یہ آیت اخیر کی دونوں آیتوں کے معارض نہیں ہے۔ (روح المعانی، مدارک، تفسیر مظہری)

❸ آیت نمبر ۲ و ۳ میں جو شیطان کے تسلط کی نفی کی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کو یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام اور اولیاء مخلصین و متوکلین سے کوئی گناہ کرادے، ہاں گناہ کی رائے دے سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے ان حضرات کو اس کی رائے اور وسوسہ کو قبول کرنے سے محفوظ و معصوم کر دیا ہے، پس آیت نمبر ۱ میں وسوسۂ شیطان سے مراد گناہ کی رائے دینا ہے نہ کہ گناہ کرانا، لہٰذا اثبات گناہ کی رائے دینے کا ہوا اور نفی تسلط علی اصدار الذنب کی ہے۔ **فلا تعارض۔**

البتہ اس صورت میں شیطان سے مراد وہ شیطان قرین نہیں ہے جو ہر شخص کے ساتھ رہ کر اس کو بری باتوں کا حکم کرتا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شیطان قرین آپ کو گناہ کی رائے بھی نہیں دیتا ہے بلکہ نیکی اور خیر کا حکم کرتا ہے جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں تصریح ہے:

﴿عن ابن مسعود رضی اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: "مامنکم من احد الا وقد وکل به قرینه من الجن، وقرینه من الملائکة." قالوا: وایاك یارسول اللّٰه؟ قال: "وایای، الا ان اللّٰه اعاننی علیه، فاسلم فلا یامرنی الا بخیر."﴾

(رواہ مسلم، خازن ۴/۱۷۱)

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں ہر شخص کے ساتھ ایک ساتھی

شیاطین میں سے اور ایک ساتھی ملائکہ میں سے مقرر کیا گیا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کے ساتھ بھی (شیطان) رہتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میرے ساتھ بھی، مگر اللہ نے اس پر میری مدد فرمائی ہے، پس میرا ساتھی شیطان[1] مسلمان ہوگیا ہے، وہ مجھ کو خیر کی بات ہی کا حکم کرتا ہے، (گناہ کا حکم نہیں کرتا)''

لہٰذا آیت شریفہ میں شیطان سے مراد یہ شیطان قرین نہیں ہوسکتا، بلکہ شیطان معروف مراد ہے اور شیطان معروف کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس احیاناً آجانا کوئی محال نہیں ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک بار شیطان ایک آگ کا شعلہ لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے کے لئے آیا تھا۔ پس شیطان آپ کے پاس آکر آپ کو کسی گناہ کی رائے بھی دے سکتا ہے مگر حق تعالیٰ اس کی رائے قبول کرنے سے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں، شیطان کو یہ قدرت اور تسلط نہیں ہے کہ آپ سے گناہ کرادے۔ (بیان القرآن وتفسیر خازن)

❹ آیت اولیٰ میں اگرچہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مراد آپ کا غیر ہے، مطلب یہ ہے "وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ اَيُّهَا الْاِنْسَانُ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ" اور عوام الناس پر خصوصاً گناہ گاروں پر شیطانی وساوس کا جاری ہونا اور شیطان کا ان پر تسلط ہونا محال نہیں بلکہ واقع ہے جیسا کہ آیت نمبر ۲ میں ارشاد ہے "اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِيْنَ" اور دوسری جگہ ارشاد ہے "اِنَّمَا سُلْطَانُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ" شیطان سے دوستی رکھنے والوں اور گمراہوں پر شیطان کا تسلط چلتا ہے۔ (خازن وغیرہ)

(۱) یہ ترجمہ اس وقت ہوگا جب کہ حدیث میں فاسلم کو میم کے فتح کے ساتھ صیغہ ماضی پڑھا جائے تو قاضی عیاضؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے اس کی تائید حدیث کے آخری الفاظ فلایا مرنی الا بخیر سے ہوتی ہے کیونکہ خیر اور نیکی کا حکم قرین مسلم ہی کرسکتا ہے نہ کہ شیطان کافر، اور دوسرا احتمال میم کے ضمہ کے ساتھ صیغہ مضارع ہونے کا ہے اور علامہ خطابیؒ نے اسی کو صحیح ومختار کہا ہے، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ میں اس شر وفتنہ سے سلامت ومحفوظ رہتا ہوں۔ (تفسیر خازن)

۵ آیت اولیٰ میں شیطانی وسوسہ کے مؤثر ہونے سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خلاف اولیٰ وخلاف افضل امر کا صادر ہو جانا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وسوسۂ شیطان کبھی کبھی صرف اتنی حد تک مؤثر ہو سکتا ہے کہ ترک اولیٰ وافضل کا صدور ہو جائے، اس کے متعلق فرمایا کہ اگر کبھی ایسا ہو جائے تو استعاذہ کر لیا کیجئے، پس آیت نمبر ۱ میں اثبات خلاف اولیٰ وافضل کے صدور سے متعلق وسوسہ کا ہے اور آیت نمبر ۲ و ۳ میں نفی صدور ذنب وخطاء سے متعلق تسلط کی ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

(تفسیر کبیر)

مؤمنین کے قلوب اللہ کے ذکر سے خوف زدہ ہوتے ہیں یا مطمئن؟

پارہ نمبر: ۹، ۱۳

① ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾

(پارہ: ۹ رکوع: ۱۵ سورۂ انفال جلالین ص: ۱۴۷) ✦

② ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ (پارہ: ۱۳ رکوع: ۱۰ سورۂ رعد جلالین ص: ۲۰۳)

تشریح تعارض

آیت نمبر ا سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ذکر سے مؤمنین کے قلوب پر خوف طاری ہوجاتا ہے، وجلت، وجل سے ماخوذ ہے بمعنی خوف، اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور خوف و اطمینان دو متعارض چیزیں ہیں، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ آیت نمبر ا میں ذکر عقاب اور آیت نمبر ۲ میں ذکر رحمت مراد ہے، یعنی مؤمن بندوں کا حال یہ ہے کہ اللہ کے عقاب کا ذکر سن کر ان کے قلوب پر خوف طاری ہوجاتا ہے اور اللہ کی رحمت کے ذکر سے ان کے قلوب مطمئن ہوجاتے ہیں جیسا کہ دوسری

جگہ ارشاد ہے: اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ''اللہ نے بڑا عمدہ کلام نازل کیا ہے جو باہم ملتی جلتی کتاب ہے، بار بار دہرائی گئی ہے (یعنی وعدو وعید اور عذاب و رحمت کے مضامین کو بار بار ذکر کیا گیا ہے) اس (کے اندر بیان کیے ہوئے وعید کے مضامین کے ذکر) سے ان لوگوں کی کھالیں کانپ جاتی ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر (جب وعدو رحمت کا ذکر آتا ہے) ان کی کھالیں اور قلوب اللہ کے ذکر (رحمت) سے نرم (اور مطمئن) ہو جاتے ہیں۔'' صاحب جلالین نے اس آیت کی یہی تفسیر فرمائی ہے، بہر حال خوف و اطمینان کا طاری ہونا دو مختلف اعتبارات سے ہوا، اس لئے کوئی تعارض نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر، روح المعانی، جلالین)

❷ آیت نمبر ۲ میں اطمینان سے مراد قلب کی ٹھنڈک اور توحید و معرفت کے نور سے شرح صدر ہو جانا ہے اور جب یہ شئے انسان کو حاصل ہوتی ہے تو حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت کا خوف اس کے قلب پر ہر وقت طاری رہتا ہے، پس یہ اطمینان خوف کے منافی نہیں ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر خازن و روح المعانی)

❸ اطمینان بذکر اللہ سے مراد اللہ کی قسم کھانے سے اطمینان قلب حاصل ہو جانا ہے، چنانچہ جب آدمی اللہ کی قسم کھا کر کوئی بات بیان کرتا ہے تو مؤمن کے قلب کو اطمینان ہو جاتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر منقول ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اطمینان اللہ کی عظمت و جلالت اور اللہ کے عقاب و وعید کے خوف کے منافی نہیں ہے، پس کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر قرطبی و خازن)

غزوۂ بدر میں کفار پر کنکریاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھینکی یا اللہ نے؟

پارہ نمبر: ۹

(ا) ﴿ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ﴾

(پارہ: ۹ رکوع: ۱۶ سورۂ انفال جلالین ص: ۱۴۹)

تشریح تعارض

جب غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹی اور کنکریوں کی ایک مٹھی بھر کر کفار کے اوپر پھینکی تھی تو وہ تمام کفار کی آنکھوں میں جا گری تھی، اس کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کیا وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ ''کہ جب آپ نے مٹی پھینکی تو آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی'' اس آیت کے جزء اول ومارمیت اور جزء ثانی اذ رمیت میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے کہ جزء اول میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رمی کی نفی کی گئی ہے اور جزء ثانی میں رمی کا اثبات ہے اور نفی و اثبات میں تعارض و تناقض ہوتا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے چار جواب ہیں:

(۱) نفی حقیقت کے اعتبار سے ہے اور اثبات صورت اور ظاہر کے اعتبار سے ہے، نفی و اثبات کی جہت بدل جانے سے تعارض نہیں رہتا۔ مطلب یہ ہے کہ وَمَا رَمَيْتَ

حَقِيْقَةً اِذْ رَمَيْتَ صُوْرَةً وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى فِي الْحَقِيْقَةِ یعنی ظاہر میں تو وہ کنکریاں آپ نے پھینکی مگر حقیقت میں آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکیں" اسی لئے تو اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک مٹھی بھر خاک اور کنکریاں پورے لشکر کی آنکھوں میں بھر گئیں، لشکر کا کوئی فرد بھی ایسا باقی نہ رہا جس کی آنکھوں میں یہ دھول اور کنکریاں نہ پہنچی ہوں اور سب پر ایک رعب طاری ہوگیا، ان میں بھگدڑ مچ گئی، مٹھی بھر کنکریوں میں یہ اثر پیدا کردینا درحقیقت حق تعالیٰ ہی کی شان ہے کسی بشر کے بس کی بات نہیں ہے، اگر حقیقۃً آپ پھینکتے تو چونکہ آپ بشر ہیں اس لئے اس کا اثر اتنا ہی ظاہر ہوتا جتنا کہ ایک بشر کے پھینکنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ (روح المعانی ومدارک)

❷ نفی خلق کے اعتبار سے ہے اور اثبات کسب کے اعتبار سے ہے، بندہ اپنے فعل کا صرف کاسب ہوتا ہے خالق حق تعالیٰ ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہوگا "وما رمیت خلقا اذ رمیت کسبا ولکن اللہ خلق الرمی" پھینکنے کا کسب آپ نے کیا مگر خلق آپ نے نہیں کیا بلکہ حق تعالیٰ نے کیا۔ (تفسیر کبیر)

❸ وَمَارَمَيْتَ سے مراد وَمَا بَلَّغْتَ الرَّمْىَ ہے، اثبات رمی کا ہے اور نفی ابلاغ رمی کی ہے، معنی یہ ہیں کہ جب آپ نے مٹی پھینکی تو اس کو کفار تک آپ نے نہیں پہنچایا بلکہ اللہ نے پہنچایا، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں، جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں ہے فلا تعارض یہ جواب جواب اول کے قریب ہے، تعبیر مختلف ہے۔

(تفسیر خازن)

❹ وَمَارَمَيْتَ سے مراد وَمَا رَمَيْتَ بِالرُّعْبِ اور اذ رمیت سے مراد رمیت بالحصباء ہے یعنی وَمَا رَمَيْتَ بِالرُّعْبِ اِذْ رَمَيْتَ بِالْحَصْبَاءِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى بِالرُّعْبِ "کہ کنکریاں تو ان کے اوپر آپ نے ڈالیں مگر رعب ان کے اوپر آپ نے نہیں ڈالا بلکہ رعب تو حق تعالیٰ نے ڈالا۔" نفی و اثبات کا تعلق دو مختلف چیزوں سے ہونے کی وجہ سے کوئی تعارض نہیں رہا۔ (خازن وروح المعانی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کفار پر عذاب آسکتا ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۹

آیات

① ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ (پارہ: ۹ رکوع: ۱۸ سورۂ انفال جلالین ص: ۱۵۰) ✦

② ﴿ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾
(پارہ: ۹ رکوع: ۱۸ سورۂ انفال جلالین ص: ۱۵۰)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود ہیں آپ کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ ان مشرکین کو عذاب نہیں دیں گے، نیز جب تک یہ لوگ استغفار کرتے رہیں گے اللہ ان کو عذاب نہیں دیں گے اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ ان کو عذاب کیوں نہ دیں (کیا وجہ ہے کہ ان کو عذاب نہ دیا جائے) حالانکہ یہ لوگ مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں، ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے کہ پہلے حق تعالیٰ نے عذاب کی نفی فرمائی کہ آپ کے ان میں ہوتے ہوئے اور ان کے استغفار کرنے کی حالت میں ان کو عذاب نہیں دیں گے پھر فرمایا کہ ان کو عذاب دیا جائے گا اور ان کے استغفار کی کوئی پروا نہیں کی جائے گی۔

دفع تعارض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں:

❶ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت نمبر۱ منسوخ اور آیت نمبر۲ اس کے لئے ناسخ ہے، مشرکین مکہ طواف کرتے وقت تلبیہ میں غُفْرَانَكَ غفرانك کہا کرتے تھے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود ہیں اور یہ لوگ استغفار کرتے رہیں گے ان پر عذاب نازل نہیں ہوگا، پھر حق تعالیٰ نے اس کو منسوخ فرما دیا اور یہ آیت نازل فرمائی "وَمَا لَهُمْ اَنْ لَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ الخ" کیا وجہ ہے کہ ان کو عذاب نہ دیا جائے الخ، یعنی ان کو عذاب دیا جائے گا، چنانچہ حق تعالیٰ نے اہل مکہ پر قحط سالی اور بھوک کا عذاب نازل فرمایا۔ (ابن کثیر)

مگر یہ جواب قابل اشکال ہے اس لئے کہ اخبار میں نسخ جاری نہیں ہوتا الا یہ کہ وہ خبر کسی حکم شرعی پر مشتمل ہو اور بظاہر یہ خبر کسی حکم شرعی کو متضمن نہیں ہے۔

(تفسیر روح المعانی)

❷ عذاب کی نفی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے مکہ میں ہونے کی حالت میں اور عذاب کا اثبات آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے مکہ سے نکل جانے اور ہجرت کر جانے کے بعد پر محمول ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تک آپ ان میں موجود رہیں گے اس وقت تک ان پر عذاب نہیں آئے گا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو کچھ مؤمنین ابھی مکہ میں باقی تھے جو استغفار کرتے تھے تو حق تعالیٰ نے فرمایا "وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ" کہ جب تک یہ استغفار کرنے والے مؤمنین ان میں موجود رہیں گے اس وقت تک ان پر عذاب نہیں آئے گا، جب رفتہ رفتہ تمام مؤمنین ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تو حق تعالیٰ نے مکہ فتح کرنے کا حکم دیدیا، چنانچہ مسلمانوں نے مکہ فتح

کیا اور کفار مغلوب ہوئے، یہی وہ عذاب ہے جس کا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا، یہ توجیہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ اور ایک جماعت سے منقول ہے بعض کہتے ہیں کہ عذاب سے مراد غزوۂ بدر کا عذاب ہے جس میں مشرکین مکہ قتل ہوئے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے امم سابقہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ فرمایا کہ اولاً نبی کو اور مؤمنین کو بستی سے ہجرت کرنے کا حکم دیا اس کے بعد اہل بستی پر عذاب نازل فرمایا۔ (تفسیر خازن)

خلاصۂ جواب یہ ہوا کہ نفی عذاب حالت وجود النبی والمؤمنین فی مکۃ پر اور اثبات عذاب بعد خروجھم منھا پر محمول ہے۔ ولاتعارض عنداختلاف الاحوال والازمان۔

❸ پہلی آیت میں عذاب استیصال کی نفی ہے، یعنی بالکلیہ جڑ سے اکھاڑ دینا اور نیست نابود کر دینا جیسا کہ پہلی امتوں پر عذاب آتا تھا اور آیت ثانیہ میں اثبات عذاب بالسیف کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے کفار پر اس طرح کا عام عذاب تو نہیں آئے گا جیسا کہ امم سابقہ پر آیا، البتہ جہاد کے ذریعہ عذاب بالسیف ہم ان پر نازل کرتے رہیں گے۔ (خازن)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بیان القرآن میں اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے۔

❹ نفی عذاب دنیا کی ہے اور اثبات عذاب آخرت کا ہے، یعنی آیت کا مطلب اس طرح ہوگا: ”وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ فِي الْاٰخِرَةِ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ“ دنیا میں تو ان پر عذاب نہیں آئے گا لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں کہ آخرت میں بھی ان کو عذاب نہ دیا جائے، آخرت

میں عذاب ضرور ہوگا، یہ توجیہ جُبائی سے منقول ہے۔ (خازن روح المعانی)

۵ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ آیت اولیٰ اپنے ماقبل کے ساتھ متصل ہے اور یہ کفار کا مقولہ ہے جیسا کہ اس سے پہلی آیت "اللهم ان كان هذا هو الحق الخ" ان کا مقولہ ہے، مطلب یہ ہے کہ نضر بن حارث اور دیگر کفار و مشرکین یوں کہا کرتے تھے اے اللہ! اگر یہ قرآن حق ہے اور تیری طرف سے نازل شدہ ہے اور ہم اس کا انکار کرتے ہیں تو اے اللہ تو ہم پر آسمان سے پتھر برسادے یا اور کوئی دردناک عذاب بھیج دے۔ نیز یوں بھی کہا کرتے تھے "ان الله لا يعذ بنا ونحن نستغفر ولايعذب امة ونبيها معها" ہمارے استغفار کرنے کی حالت میں اللہ ہم کو عذاب نہیں دیں گے اور کسی امت کو ان کے ساتھ ان کے نبی کے ہوتے ہوئے عذاب نہیں دیا جاتا۔ حق تعالیٰ نے اولاً تو ان کی جہالت کو بیان کیا کہ یہ لوگ اس طرح کا گمان رکھتے ہیں، پھر آگے ان پر تردید فرمائی "ومالهم الايعذبهم الله" کہ بھلا اللہ تعالیٰ ان کو عذاب کیوں نہیں دیں گے جب کہ یہ مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں، یعنی ان کا عدم عذاب کا یہ گمان باطل ہے ان کو عذاب ضرور دیا جائے گا، پس آیت اولیٰ کفار کا مقولہ ہے اور آیت ثانیہ اس کی تردید میں حق تعالیٰ کا مقولہ ہے۔[1] (تفسیر خازن)

مگر صاحب روح المعانی کہتے ہیں کہ یہ توجیہ درست نہیں کیونکہ اس صورت میں: "وماكان الله ليعذبنا وماكان الله مُعذِّبَنَا ونحن نستغفر" صیغہ تکلم کے ساتھ ہونا چاہئے تھا جیسا کہ اس سے پہلے مقولہ میں اَمْطِرْعَلَيْنَا اور ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ صیغہ تکلم کے ساتھ ہے۔

(۱) اور جب دو متعارض مقولوں کے قائلین جدا جدا ہوں تو تعارض نہیں رہتا۔

کفار کے اعمال حسنہ نافع ہیں یا ضائع و بے کار؟

پارہ نمبر: ۹، ۱۳، ۱۶، ۱۹، ۲۴، ۲۶

① ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾

(پارہ: ۹ رکوع: ۱۸ سورۂ انفال جلالین ص: ۱۵۰) ✦

② ﴿وَمَادُعَآءُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّافِيْ ضَلَالٍ﴾ (پارہ: ۱۳ رکوع: ۸ سورۂ رعد جلالین ص: ۲۰۲)

③ ﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾

(پارہ: ۱۶ رکوع: ۳ سورۂ کہف جلالین ص: ۲۵۳)

④ ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَاعَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾

(پارہ: ۱۹ رکوع: ۱ سورۂ فرقان جلالین ص: ۳۰۴)

⑤ ﴿وَمَادُعَآءُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلَالٍ﴾

(پارہ: ۲۴ رکوع: ۱۰ سورۂ مؤمن (غافر) جلالین ص: ۳۹۴)

⑥ ﴿اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۵ سورۂ محمد (القتال) جلالین ص: ۴۱۹)

⑦ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۵ سورۂ محمد (قتال) جلالین ص: ۴۲۰)

⑧ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْ

بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ ﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۸ سورۂ محمد (قتال) جلالین ص: ۴۲۲)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ میں کفار کے متعلق ارشاد ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہیں دے گا دراں حالیکہ وہ استغفار کرتے ہوں، کفار مکہ طواف کرتے وقت تلبیہ پڑھتے ہوئے غفرانك غفرانك کہا کرتے تھے، حق تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا کہ لوگ استغفار کرتے ہیں اس حالت میں اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے استغفار سے جو کہ ان کا ایک عمل ہے ان کو نفع پہنچتا ہے کہ حق تعالیٰ ان کے اس عمل کی وجہ سے ان پر عذاب نازل نہیں فرماتے اور اس کے بعد کی مذکورہ سات آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے اعمال بے کار اور باطل ہیں، کوئی نفع ان پر مرتب نہیں ہوتا، چنانچہ آیت نمبر ۲ و ۵ میں ہے "وَمَادُعَآءُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلَالٍ" کافر جو دعا مانگتا ہے وہ ضائع اور بے کار ہے، اس پر کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا، اگر وہ مغفرت کی دعا بھی کرے تو غیر نافع وضائع ہے۔ اور آیت نمبر ۳ میں ہے کہ کفار اعمال کے اعتبار سے خسارہ اور نقصان میں ہیں کہ وہ دنیاوی زندگی میں اگر کوئی نیک عمل کرتے ہیں وہ ضائع اور بے کار ہے اور وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھے اعمال کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال حسنہ کو باطل کر دیتے ہیں اور آیت نمبر ۴ میں ہے کہ حق تعالیٰ کفار کے اعمال حسنہ کو هباء منثورا "بکھرے ہوئے غبار" کی طرح بے کار اور غیر نافع بنا دیتے ہیں اور آیت نمبر ۶ و ۷ و ۸ میں اضل اعمالهم اور احبط اعمالهم وغیرہ کہہ کر ان کے عمل کا بطلان اور ضائع ہونا بیان کیا گیا ہے، غرض کہ اخیر کی سات آیات سے کفار کے اعمالِ خیر کا غیر نافع ہونا معلوم ہوتا ہے، پس آیت نمبر ۱، اور ان ساتوں آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

نافع ہونا دنیا کے اعتبار سے ہے اور غیر نافع اور ضائع ہونا آخرت کے اعتبار سے ہے، مطلب یہ ہے کہ کافر اگر کوئی نیک عمل کرتا ہے جیسا کہ استغفار کرنا یا کسی فقیر و مسکین کو صدقہ وخیرات دے دینا، صلہ رحمی کرنا وغیرہ تو اس عمل کا بدلہ اس کو دنیا میں مل جاتا ہے کہ حق تعالیٰ دنیاوی عذاب و مصیبت ہٹا لیتے ہیں یا مال واولاد میں وسعت و فراخی عطا فرما دیتے ہیں، صحت و عافیت سے نواز دیتے ہیں مگر آخرت میں ان اعمال پر کوئی نفع مرتب نہیں ہوتا اور یہ اعمال اخروی عذاب سے نجات کا باعث نہیں ہوں گے، پس نفع اور عدم نفع کا محل مختلف ہو جانے سے کوئی تعارض نہیں رہا۔

(جلالین شریف وصاوی)

کفار سے صلح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۰، ۲۶

آیات

① ﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ (پارہ: ۱۰ رکوع: ۴ سورۂ توبۃ جلالین ص: ۱۵۴) ✦

② ﴿فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ الخ﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۸ سورۂ محمد (القتال) جلالین ص: ۴۲۲)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ میں ارشاد ہے کہ اگر کفار صلح کرنے کے لئے مائل ہوں تو آپ بھی صلح کی طرف مائل ہوجایئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار سے صلح کرنا جائز ہے اور آیت نمبر ۲ میں صلح کرنے سے منع کیا گیا ہے کہ تم لوگ ہمت مت ہارو اور کفار کو صلح کی طرف مت بلاؤ، تم ہی غالب رہو گے۔ پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

① حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مجاہد، قتادہ رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ صلح والی آیت منسوخ ہے، ابتداء میں صلح کی اجازت تھی، پھر آیت جہاد وقتال نازل فرما کر صلح سے منع کردیا گیا، ولا تعارض بعد النسخ۔ (روح المعانی)

② اختلاف اشخاص پر محمول ہے، اہل کتاب سے تو صلح کرنے کی اجازت ہے البتہ مشرکین عرب سے صلح کرنا جائز نہیں ان کے لئے یا تو اسلام کو قبول کرنا ہے یا قتال،

پس آیت نمبر ا، اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہے جیسا کہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور امام سدی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ یہ آیت بنو قریظہ کے بارے میں نازل ہوئی جو یہود کا ایک قبیلہ ہے اور آیت نمبر ۲ مشرکین عرب کے بارے میں ہے۔ فلا تعارض۔ (روح المعانی)

❸ محض ضعف اور کم ہمتی کی وجہ سے صلح کرنا جائز نہیں۔ آیت نمبر ۲ میں اسی قسم کی صلح سے منع کیا گیا ہے جیسا کہ ولا تہنوا سے معلوم ہوتا ہے، البتہ کسی مصلحت کی وجہ سے اگر صلح کر لی جائے تو درست ہے خواہ وہ مصلحت ضعف قوت جسمانی ہو یا قلت عدد یا قلت سامان وغیرہ ہو لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے سست اور کم ہمت و بزدل بنا اور ان سے صلح کرنا جائز نہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلحت کے پیش نظر مقام حدیبیہ میں کفار سے صلح کی تھی، آیت اولیٰ میں اسی صلح کی اجازت ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (بیان القرآن وغیرہ)

کفار کی کتنی تعداد سے مقابلہ کرنا ضروری ہے؟

پارہ نمبر: ۱۰

آیات

① ﴿اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ﴾

(پارہ: ۱۰ رکوع: ۵ سورۂ انفال جلالین ص: ۱۵۳) ✦

② ﴿فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (پارہ: ۱۰ رکوع: ۵ سورۂ انفال جلالین ص: ۱۵۴)

تشریح تعارض

آیت نمبر ا میں ارشاد ہے کہ اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں تو دوسو کفار پر غالب آجائیں گے اور اگر سو ہوں تو ایک ہزار پر غالب آجائیں گے۔ یہ اگرچہ خبر ہے لیکن امر کے معنی میں ہے کہ اگر کفار کی تعداد تم سے دس گنا زائد ہو، تم بیس ہوں وہ دوسو ہوں، تم سو ہوں وہ ایک ہزار، تو تم کو ان کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنا اور ان سے لڑنا ضروری ہے، بھاگنا اور پیچھے ہٹنا حرام ہے اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوگنی تعداد سے مقابلہ کرنا تو ضروری ہے اس سے زائد سے ضروری نہیں کہ اگر مسلمان سو ہوں اور کفار دوسو، مسلمان ایک ہزار ہوں کفار دو ہزار تو مقابلہ اور جہاد کرنا ضروری ہے، اس سے زائد سے نہیں، پس بظاہر دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔

دفع تعارض

آیت اولیٰ آیت ثانیہ سے منسوخ ہے، بخاری شریف کی روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ جب پہلی آیت ان یکن منکم عشرون الخ نازل ہوئی اور مسلمانوں کو کافروں کی دس گنی تعداد سے مقابلہ کرنے پر ثابت قدم رہنے کا حکم دیا تو مسلمانوں کو یہ بھاری معلوم ہوا کہ دس گنی تعداد سے مقابلہ کرنا تو دشوار معلوم ہوتا ہے تو حق تعالیٰ نے تخفیف فرمادی اور یہ حکم منسوخ کر کے دوسری آیت نازل فرمادی "اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفاً فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ الخ" اب اللہ نے تم سے بوجھ ہلکا کردیا اور جان لیا کہ تم میں ابھی کچھ کمزوری ہے، دس گنی تعداد سے مقابلہ کرنا تمہارے لئے دشوار ہے تو اب تم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ کفار کی تعداد اگر تم سے دوگنی ہو تو ان سے مقابلہ پر ثابت قدم رہنا ضروری ہے اور بھاگنا حرام ہے۔ **ولا تعارض بعد النسخ۔** (تفسیر خازن)

قتال تمام مشرکین سے ضروری ہے یا صرف مشرکین اقارب سے؟

پارہ نمبر: ۱۰، ۱۱

آیات

① ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً﴾ (پارہ: ۱۰ رکوع: ۱۱ سورۂ توبہ جلالین ص: ۱۵۸) ✦

② ﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً﴾ (پارہ: ۱۱ رکوع: ۵ سورۂ توبہ جلالین ص: ۱۶۹)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں حکم ہے کہ تمام مشرکین سے قتال کرو، یعنی خواہ اقارب ہوں یا غیر اقارب اور دوسری آیت میں فرمایا کہ کفار میں سے جو تمہارے رشتہ دار ہیں ان سے قتال کرو اور ان پر سختی کا استعمال کرو، پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

آیت نمبر ۲ میں غیر اقارب کے ساتھ قتال کرنے سے روکا نہیں گیا، بلکہ اس میں جہاد کے آداب کی تعلیم دی گئی ہے کہ جہاد کا طریقہ اور ادب یہ ہے کہ اولاً رشتہ داروں سے جہاد کرو پھر غیر اقارب سے کیونکہ تمام مشرکین سے دفعۃً واحدۃً قتال کرنا تو ناممکن ہے، رفتہ رفتہ یکے بعد دیگرے ہی کیا جا سکتا ہے، پس اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قریبی رشتہ داروں سے جہاد کرو، پھر دور کے اقارب سے پھر تمام اجانب مشرکین سے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً اپنی قوم سے جہاد کیا، پھر باقی اہل

عرب کی طرف منتقل ہوئے، اس کے بعد اہل کتاب سے جہاد کیا، پھر اہل روم اور اہل شام کی طرف رخ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین جہاد کے لئے عراق کی طرف نکلے پھر تمام بلاد و امصار کی طرف نکل پڑے، اس تقریر کے بعد معلوم ہوگیا کہ اس آیت سے بھی یکے بعد دیگرے تمام ہی مشرکین سے جہاد کرنے کا حکم ثابت ہوتا ہے لہٰذا اس آیت کا آیت اولیٰ فَاقْتُلُو الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً سے کوئی تعارض نہیں۔ (صاوی)

جہاد مستطیع ومعذور ہر شخص پر فرض ہے یا صرف مستطیع پر؟

پارہ نمبر: ۱۰، ۲۶

آیات

① ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافاً وَّثِقَالاً وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (پارہ: ۱۰ رکوع: ۱۲ سورۂ توبہ جلالین ص: ۱۵۹) ✦

② ﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ﴾ (پارہ: ۱۰ رکوع: ۱۸ سورۂ توبہ جلالین ص: ۱۶۴)

③ ﴿لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ﴾ (پارہ: ۲۶ رکوع: ۱۰ سورۂ فتح جلالین ص: ۴۲۴)

تشریح تعارض

آیت نمبر ا میں ارشاد باری ہے کہ تم ہلکے ہو یا بھاری، ہر حال میں جہاد کے لئے نکل جاؤ اور جان و مال کے ساتھ اللہ کے راستہ میں جہاد کرو۔ یعنی تمہاری حالت خواہ ایسی ہو کہ جہاد کرنا تمہارے لئے آسان وخفیف ہو اور خواہ ایسی ہو کہ جس میں جہاد کرنا دشوار وثقیل ہو ہر حال میں تمہیں جہاد کرنا ضروری ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی غنی ہو یا فقیر، بیمار ہو یا تندرست، معذور ہو یا غیر معذور، مجرد ہو یا اہل وعیال والا ہر حال میں جہاد فرض ہے اور دوسری وتیسری آیت میں ارشاد ہے کہ کمزور، مریض، فقیر، نابینا اور لنگڑے معذور پر جہاد میں نکلنا فرض نہیں ہے، اگر یہ لوگ جہاد میں نہ جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

① آیت نمبر ا، اخیر کی دونوں آیتوں سے منسوخ ہے، ابتداء میں ہر حال میں جہاد کے لئے نکلنا ضروری تھا، کسی قسم کا کوئی عذر مسموع نہیں ہوتا تھا، پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا چنانچہ روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نابینا تھے، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میرے لئے بھی جہاد میں نکلنا ضروری ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آیت **لیس علی الاعمی حرج** الخ نازل فرمائی اور معذورین حضرات کے لئے تخفیف فرما دی کہ اگر یہ لوگ جہاد میں نہ جائیں تو کوئی گناہ نہیں ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علامہ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی منقول ہے، **ولا تعارض بعد النسخ**۔ (روح المعانی، تفسیر خازن وغیرہ)

② آیت نمبر ا میں امر وجوبی نہیں ہے بلکہ ندب و استحباب پر محمول ہے، ابتداء ہی سے ہر حال میں جہاد کے لئے نکلنا واجب نہیں تھا بلکہ مستحب تھا اور ترک مندوب پر کوئی گناہ نہیں لہٰذا آیت نمبر ۲ و ۳ میں جو حرج کی نفی کی گئی ہے وہ اس کے معارض نہیں ہے، ایسی صورت میں نسخ ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ (تفسیر خازن وغیرہ)

③ **اِنْفِرُوْا خِفَافاً وَّثِقَالاً**، کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معذورین وغیر معذورین سب کو نکلنا ضروری ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جہاد پر قدرت رکھتے ہیں ان کو ہر حال میں نکلنا ضروری ہے خواہ ان کے پاس آلات جہاد ہتھیار، سواری، خدام وغیرہ زیادہ ہوں یا تھوڑے، آلات جہاد کی قلت کوئی عذر نہیں ہے، پس اعمی، مریض اور فقیر وغیرہم اس حکم میں داخل ہی نہیں لہٰذا یہ آیت نہ تو دوسری دو آیتوں کے معارض ہو گی اور نہ منسوخ ماننے کی ضرورت پڑے گی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے الفوز الکبیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ (الفوز الکبیر)

جہاد میں سب کو نکلنا ضروری ہے یا ایک جماعت کو؟

پارہ نمبر: ۱۱

آیات

① ﴿ مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَّتَخَلَّفُوا عَنْ رَّسُولِ اللّٰهِ ﴾ (پارہ: ۱۱ رکوع: ۴ سورۂ توبہ جلالین: ۱۶۸) ✦

② ﴿ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْٓا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴾ (پارہ: ۱۱ رکوع: ۴ سورۂ توبہ جلالین ص: ۱۶۸)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ مدینہ اور آس پاس کے دیہات والوں کے لئے جائز نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جہاد میں تشریف لے جائیں تو یہ لوگ پیچھے ہٹ جائیں بلکہ سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں نکلنا ضروری ہے۔ اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ تمام مسلمانوں کو جہاد میں نہ جانا چاہئے بلکہ ایک جماعت جہاد میں نکل جائے اور ایک جماعت وطن میں موجود رہنی چاہئے جو دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتی رہے اور جب مجاہدین حضرات واپس آئیں تو ان کو دین کی باتیں سنا کر اللہ کی نافرمانی سے ڈرائیں تا کہ وہ برے کاموں سے بچیں۔ پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلی آیت دوسری آیت سے منسوخ ہے، جب مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی تو حق تعالیٰ نے سب کے لئے نکلنا ضروری فرمادیا تھا، جب مسلمانوں کی کثرت ہوگئی تو یہ حکم منسوخ کردیا اور دوسری آیت **وما کان المؤمنون لینفروا کآفۃ الخ** نازل فرمادی، جس میں یہ فرمادیا کہ سب کو نہیں جانا چاہئے، ایک جماعت جہاد میں چلی جائے دوسری وطن میں رہ جائے۔ **ولا تعارض بعد النسخ**۔ (تفسیر خازن، وتفسیر مظہری)

❷ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آیت اولیٰ اس حالت پر محمول ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس جہاد میں تشریف لے جائیں جس کو غزوہ کہتے ہیں اس وقت آپ کے ساتھ تمام مسلمانوں کو نکلنا ضروری ہے کسی کے لئے پیچھے رہنا جائز نہیں، کیونکہ جب صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں تشریف لے گئے ہیں تو وطن میں باقی رہنے والے لوگ کس سے تعلیم حاصل کریں گے، اس لئے سب کو آپ کے ساتھ نکل جانا چاہئے اور دوسری آیت اس حالت پر محمول ہے جب کہ آپ خود تو تشریف نہ لے جائیں البتہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کو جہاد کے لئے روانہ کردیں جس کو سَرِیَّۃ (۱) کہتے ہیں۔

اس وقت سب کو نہیں جانا چاہئے، ایک جماعت کو وطن میں موجود رہنا چاہئے تاکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی تعلیم حاصل کرتے رہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ پہلی آیت غزوات سے متعلق ہے اور آیت ثانیہ سرایا سے متعلق ہے۔ **فلا تعارض بینہما**۔ (جلالین شریف وصاوی)

---

(۱) سو سے لے کر پانچ سو تک کی جماعت کو سَرِیَّۃ کہا جاتا ہے پھر اس سے زائد آٹھ سو تک کی جماعت کو مَنْسَر اور اس سے زائد چار ہزار تک کو جَیْش اور اس سے زائد کو جَحْفَل کہتے ہیں، کل سرایا کی تعداد جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لے گئے ۴۷ ہے، اور غزوات کی تعداد جن میں آپ تشریف لے گئے ۲۷ ہے، جن میں سے فقط آٹھ میں قتال فرمایا۔ (صاوی)

انسان بوقت مصیبت دعائیں کرتا ہے یا مایوس و ناامید ہوجاتا ہے؟

پارہ نمبر: ۱۱، ۱۵، ۲۱، ۲۳، ۲۴، ۲۵

① ﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا﴾

(پارہ: ۱۱ رکوع: ۷ سورۂ یونس جلالین ص: ۱۷۱)

② ﴿وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ﴾

(پارہ: ۲۱ رکوع: ۷ سورۂ روم جلالین ص: ۳۴۳)

③ ﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ۱۵ سورۂ زمر جلالین ص: ۳۸۶)

④ ﴿فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا﴾

(پارہ: ۲۴ رکوع: ۲ سورۂ زمر جلالین ص: ۳۸۹)

⑤ ﴿وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ﴾ (پارہ: ۲۵ رکوع: ۱ سورۂ حم سجدہ (فصلت) جلالین ص: ۴۰۱) ✦

⑥ ﴿وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا﴾ (پارہ: ۱۵ رکوع: ۹ سورۂ بنی اسرائیل (اسراء) جلالین ص: ۲۳۷)

⑦ ﴿لَا يَسْاَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ﴾

(پارہ: ۲۵ رکوع: ۱ سورۂ حم سجدہ (فصلت) جلالین ص: ۴۰۰)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ا تا ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جب پریشانی لاحق ہوتی ہے تو وہ لیٹ کر، بیٹھ کر، کھڑے ہو کر غرض ہر حال میں اللہ سے خوب لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے اور آیت نمبر ۶ و ۷ میں فرمایا گیا ہے کہ پریشانی میں انسان ناامید اور مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے (یئوس کے معنی مایوس اور قنوط، کے معنی ناامید) اور دعا چونکہ امید و آس کی حالت میں کی جاتی ہے اس لئے دعا کرنے اور ناامیدی و مایوسی میں تعارض و تنافی ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے پانچ جواب ہیں:

❶ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، پہلی پانچ آیات مؤمن کے حق میں ہیں اور اخیر کی دونوں آیتیں کافر کے بارے میں ہیں کہ مؤمن تو پریشانی کے وقت اللہ سے خوب دعائیں کرتا ہے اور کافر مایوس و نااُمید ہو کر بیٹھ جاتا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے "انه لاییأس من روح الله الا القوم الکافرون" کہ اللہ کی رحمت سے کفار ہی ناامید ہوتے ہیں، اور اختلاف اشخاص کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (مدارک)

❷ اختلاف احوال و ازمان پر محمول ہے کہ جب پریشانی لاحق ہوتی ہے تو ابتداء تو انسان خوب دعائیں کرتا ہے اور جب قبولیت کے آثار نمایاں نہیں ہوتے تو مایوس اور ناامید ہو کر دعا چھوڑ دیتا ہے۔ (بیان القرآن)

❸ دعا اور قنوط و یأس کا متعلق مختلف ہے، دعا کا تعلق زبان سے ہے اور ناامیدی و مایوسی کا تعلق قلب سے ہے اور دونوں آیتیں کافر ہی کے متعلق ہیں، مطلب یہ ہے کہ کافر زبان سے تو خوب دعائیں کرتا ہے مگر قلب اس کا مایوس و ناامید رہتا ہے، پس کوئی

تعارض نہیں۔ (مدارک و بیان القرآن)

❹ اختلاف مکان پر محمول ہے، یعنی سمندر میں تو دعائیں کرتا ہے اور خشکی میں مایوس و ناامید ہو جاتا ہے، کفار جب کشتیوں پر سوار ہوتے تھے اور کوئی طوفان آ جاتا تھا تو اللہ سے دعائیں کرتے تھے جیسا کہ ارشاد ہے "فاذا رکبوا فی الفلك دعوا اللّٰه مخلصین له الدین۔" (تفسیر مدارک)

❺ اختلاف مدعو پر محمول ہے، کافر مصیبت کے وقت اللہ سے دعا کرتا ہے اور اپنے بتوں سے مایوس و ناامید ہو جاتا ہے۔ (تفسیر مدارک)

اولادِ آدم علیہ السلام کو کس چیز سے پیدا کیا گیا؟

پارہ نمبر: ۱۲، ۱۴، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۱، ۲۳، ۲۷، ۲۹، ۳۰

① ﴿هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا﴾

(پارہ: ۱۲ رکوع: ۶ سورۂ ہود جلالین ص: ۱۸۴)

② ﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ﴾

(پارہ: ۱۶ رکوع: ۱۲ سورۂ طٰہٰ جلالین ص: ۲۶۳)

③ ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ﴾ (پارہ: ۱۷ رکوع: ۸ سورۂ حج جلالین ص: ۲۷۹)

④ ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنتُم بَشَرٌ تَنتَشِرُونَ﴾

(پارہ: ۲۱ رکوع: ۶ سورۂ روم جلالین ص: ۳۴۲)

⑤ ﴿إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ﴾ (پارہ: ۲۳ رکوع: ۵ سورۂ صافات جلالین ص: ۳۷۳)

⑥ ﴿وَأَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۶ سورۂ نجم جلالین ص: ۴۳۹) ✦

⑦ ﴿خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ﴾

(پارہ: ۱۴ رکوع: ۷ سورۂ نحل جلالین ص: ۲۱۶)

⑧ ﴿ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ﴾ (پارہ: ۱۸ رکوع: ۱ سورۂ مؤمنون جلالین ص: ۲۸۷)

⑨ ﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ﴾

(پارہ: ۲۱ رکوع: ۱۴ سورۂ سجدہ جلالین ص: ۳۴۹)

⑩ ﴿أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ۴ سورۂ یٰس جلالین ص: ۳۷۲)

(۱۱) ﴿وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۷ سورۂ نجم جلالین ص: ۴۳۹)

(۱۲) ﴿اَفَرَاَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۵ سورۂ واقعہ جلالین ص: ۴۴۷)

(۱۳) ﴿اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۸ سورۂ قیامہ جلالین ص: ۴۸۲)

(۱۴) ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۹ سورۂ دہر (انسان) جلالین ص: ۴۸۳)

(۱۵) ﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۲۱ سورۂ مرسلات جلالین ص: ۴۸۵)

(۱۶) ﴿مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۵ سورۂ عبس جلالین ص: ۴۹۰)

(۱۷) ﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۱۱ سورۂ طارق جلالین ص ۴۹۶) ✦

(۱۸) ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۲۱ سورۂ علق جلالین ص: ۵۰۳)

تشریح تعارض

ان تمام آیات میں اولادِ آدم کی تخلیق کا بیان ہے کیونکہ ان آیات میں سے بعض میں تو جمع کا صیغہ ہے، بعض میں نسل کی تصریح ہے اور جن آیات میں صرف انسان کا ذکر ہے ان میں انسان سے جنس انسان یعنی اولادِ آدم مراد ہے جیسا کہ آیات کے سیاق وسباق اور مفسرین حضرات کی تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے، اس طرح یہ تمام آیات اولادِ آدم کی تخلیق کو بیان کر رہی ہیں مگر اولادِ آدم کو کس چیز سے پیدا کیا گیا اس بارے میں یہ آیات متعارض ہیں، آیت نمبر ۱ تا ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ اولادِ آدم کو مٹی سے بنایا اور آیت نمبر ۷ تا ۱۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ نطفۂ منی سے پیدا کیا اور اخیر کی آیت نمبر ۱۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ علقة (دمِ جامد) سے پیدا کیا گیا، اس طرح یہ آیات

بظاہر متعارض ہیں۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ آیت نمبر ۱ تا ۶ میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مراد ہے کہ ان کو حق تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا، ضمیر جمع سے قبل ایک مضاف محذوف ہے یعنی هُوَ اَنْشَأَ اَبَاكُمْ مِنَ الْاَرْضِ، مِنْهَا خَلَقْنَا اَبَاكُمْ، اِنَّا خَلَقْنَا اَبَاهُمْ، هُوَاَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَأَ اَبَاكُمْ وغیرہ۔ ان کے بعد آیت نمبر ۷ تا ۱۷ میں اولاد آدم کی تخلیق مراد ہے کہ ان کو حق تعالیٰ نے نطفۂ منی سے بنایا اور سب سے آخری آیت نمبر ۱۸ میں علق کا ذکر ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کو ابتداء ہی دم جامد سے پیدا کر دیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ پہلے نطفہ بنایا پھر اس نطفہ کو علقہ بنا دیا۔

پس اس آیت میں حالت ثانیہ کا بیان ہے، انسان کی تخلیق مختلف اطوار و احوال کے ساتھ ہوئی ہے، اولاً نطفہ بنایا، پھر علقہ پھر اس کو مضغہ بنا دیا، پھر اس کو ہڈیوں میں تبدیل کر دیا، پھر اس پر گوشت چڑھا دیا، اس کے بعد اس میں روح ڈال کر زندہ کر دیا جیسا کہ سورۂ مؤمنون کی آیت مصرح ہے "ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً ثُمَّ اَنْشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ." بہر حال پہلی چھ آیات میں تخلیق آدم اور اخیر کی تمام آیات میں اولاد آدم کی تخلیق کا بیان ہے اور اختلاف اشخاص کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا ہے۔ (روح المعانی وغیرہ)

❷ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ تمام آیات اولاد آدم کی تخلیق ہی سے متعلق ہیں، حق تعالیٰ نے اولاد آدم کو نطفہ منی سے پیدا کیا ہے مگر پہلی چھ آیات میں جو یہ فرمایا کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ان میں انسان کے مادۂ بعیدہ کو بیان کیا گیا ہے کیونکہ نطفۂ منی

غذاؤں سے بنتا ہے اور غذائیں مٹی سے پیدا ہوتی ہیں، پس گویا انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے، پس ان آیات میں انسان کے مادۂ بعیدہ کا بیان ہے اور اخیر کی آیات میں مادۂ قریبہ کو بیان کیا گیا ہے۔ (روح المعانی وغیرہ)

۳ مجموع الامرین مراد ہے، ہر انسان کی تخلیق مٹی اور نطفۂ منی دونوں کے مجموعہ سے ہوتی ہے، جب رحم مادر میں نطفہ قرار پاتا ہے تو ایک فرشتہ اس مقام سے جہاں اس شخص کو دفن ہونا ہے مٹی اٹھا کر لاتا ہے اور نطفہ پر چھڑک دیتا ہے، پھر مٹی اور نطفہ دونوں کے مجموعہ سے بچہ کی تخلیق ہوتی ہے۔ بعض آیات میں ان میں سے ایک جزء یعنی مٹی کا ذکر کردیا اور بعض میں دوسرے جزء یعنی نطفہ کو بیان کردیا۔ پس ان میں کوئی تعارض نہیں اور آخری آیت خلق الانسان من علق کی توجیہ جواب اول میں بیان ہوچکی ہے، مجموع الامرین کی جو یہ توجیہ کی گئی ہے اس کی تائید حضرت عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔

﴿عن عطاء الخراسانی قال: ان الملك ينطلق فياخذ من تراب المكان الذی يدفن فيه الشخص، فيذره على النطفة، فيخلق من التراب والنطفة.﴾ (اخرجہ عبد بن حمید وابن المنذر، روح المعانی ۱۶/ ۲۰۸)

ترجمہ: ”حضرت عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ فرشتہ جاتا ہے اور اس مقام سے جہاں اس شخص کو دفن ہونا ہے مٹی لیتا ہے پس اس کو نطفہ پر بکھیر دیتا ہے پس مٹی اور نطفہ سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے۔“[1]

---

(۱) مفسرین رحمہم اللہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق جس مٹی سے ہوئی وہ کعبہ کی مٹی تھی مگر طوفانِ نوح میں وہ مٹی اس مقام پر منتقل ہوگئی تھی جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک ہے“۔ (حاشیہ روح المعانی)

جنت میں داخلہ اعمال کے سبب سے ہوگا یا محض فضلِ الٰہی سے؟

پارہ نمبر: ۱۴، ۱۷، ۲۱، ۲۵، ۲۶، ۳۰

آیات

① ﴿يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾
(پارہ:۱۴ رکوع:۱۰ سورۂ نحل جلالین ص:۲۱۸)

② ﴿اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى نُزُلًا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (پارہ:۲۱ رکوع:۱۵ سورۂ سجدۃ جلالین ص۳۵۰)

③ ﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾
(پارہ:۲۵ رکوع:۱۳ سورۂ زخرف جلالین ص:۴۰۹)

④ ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾
(پارہ:۲۶ رکوع:۲ سورۂ احقاف جلالین ص:۴۱۷) ✦

⑤ ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ﴾
(پارہ:۱۷ رکوع:۱۴ سورۂ حج جلالین ص:۲۸۴)

⑥ ﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ﴾
(پارہ:۲۱ رکوع:۸ سورۂ روم جلالین ص:۳۴۴)

⑦ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (پارہ:۳۰ رکوع:۱۰ سورۂ بروج جلالین ص:۴۹۵)

تشریحِ تعارض

پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ اعمال کی وجہ سے ہوگا

کیونکہ بما کنتم تعلمون اور بما کانوا یعملون میں بائے سببیہ لائی گئی ہے جس کا مابعد ماقبل کے لئے سبب ہوتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے اعمال سبب ہیں دخول جنت کا اور اخیر کی تین آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ محض اللہ کے فضل و کرم سے ہوگا اعمال کی وجہ سے نہیں، اس لئے کہ آیت نمبر ۵ و ۷ میں فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ اور لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ میں فاء سببیہ نہیں ہے، اگر یوں کہا جاتا فَفِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ اور فَلَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ الخ تو فاءِ سببیہ سے اس بات پر دلالت ہوتی کہ اعمال سبب ہیں دخول جنت کا، کیونکہ فاء سببیہ کا ماقبل مابعد کے لئے سبب ہوتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں آیت نمبر ۵ سے اگلی آیت والذین کفرواو کذبوا بایاتنا فأولئك لهم عذاب مهين میں فاولٰئك پر فائے سببیہ لا کر اس طرف اشارہ ہے کہ کفر و تکذیب سبب ہے عذاب مہین کا، پس في جنت النعيم اور لهم جنت تجري میں فائے سببیہ کا ترک اس بات پر دال ہے کہ دخول جنت اعمال کے سبب سے نہیں بلکہ محض حق تعالیٰ کے فضل سے ہوگا، صاحب جلالین نے في جنت النعيم کے بعد فضلا من الله کا اضافہ کر کے اسی طرف اشارہ کیا ہے اور آیت نمبر ۶ میں تو من فضله مصرح ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ والوں کو حق تعالیٰ اپنے فضل سے بدلہ عطاء فرمائیں گے، حدیث صحیح سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

﴿عن ابی هريرة رضی الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم: "لن يُدخِل احداعملُه الجنة." قيل: ولا انت يارسول الله؟ قال: "ولا انا الا ان يتغمدني الله تعالىٰ منه بفضل ورحمة."﴾ (رواه البخاری ومسلم)

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی شخص کا عمل اس کو جنت میں داخل نہیں کرے گا (بلکہ جنت میں ہر شخص محض اللہ کے فضل سے جائے گا۔)

پوچھا گیا یا رسول اللہ! آپ بھی نہیں؟ ارشاد فرمایا میں بھی نہیں مگر یہ حق تعالیٰ اپنے فضل و رحمت میں مجھ کو چھپالیں۔"

خلاصہ یہ ہوا کہ پہلی چار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین جنت میں اپنے ایمان و اعمال کے سبب سے داخل ہوں گے اور اخیر کی تین آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ محض اللہ کے کے فضل و کرم سے ہوگا، اعمال کے سبب سے نہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے چار جواب ہیں:

❶ اگرچہ جنت میں داخلہ اعمال کی وجہ سے ہوگا مگر اعمال کی توفیق حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہوتی ہے، پس سبب حقیقی دخول جنت کا حق تعالیٰ کا فضل ہے اور سبب عادی و ظاہری اعمال ہیں، پہلی چار آیات میں سبب ظاہری و عادی مراد ہے اور اخیر کی تین آیات میں اور حدیث میں سبب حقیقی کا بیان ہے۔ **فلا تعارض بینھا۔** (روح المعانی وتفسیر خازن)

❷ پہلی چار آیات میں باء سببیہ نہیں ہے بلکہ مقابلہ کے لئے ہے یعنی **ادخلوا الجنة فی مقابلة اعمالکم** اعمال کے مقابلہ اور بدلہ میں حق تعالیٰ اپنے فضل سے جنت عطا فرمادیں گے جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے "اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" اللہ نے مؤمنین سے ان کے جان و مال کو خرید لیا ہے اس چیز کے بدلہ میں کہ ان کو جنت ملے گی، یعنی تم لوگ اپنا جان و مال حق تعالیٰ کے حوالہ کردو اس کی اطاعت میں لگادو، اس کے مقابلہ اور بدلہ میں اپنا فضل یہ فرمائیں گے کہ تم کو جنت عطا فرمادیں گے۔ تعارض کا جو شبہ پیدا ہوا تھا وہ بائے سببیہ کی وجہ سے ہوا تھا اور جب باء سببیہ نہیں رہی تو تعارض بھی نہ رہا۔ (روح المعانی وحاشیہ جلالین)

❸ باء ملابست کے لئے ہے کہ اپنے ایمان واعمال کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ اس صورت میں بھی باء سببیہ نہ ہونے کی وجہ سے تعارض مرتفع ہو گیا۔ (حاشیہ جلالین)

❹ دخول جنت تو حق تعالیٰ کے فضل سے ہوگا اور ترقی درجات اعمال کے سبب سے ہوگی، پس پہلی چار آیات رفع درجات سے متعلق ہیں یعنی اُدْخُلُوْا دَرَجَاتِ الْجَنَّةِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اور اخیر کی تینوں آیات نفس دخول جنت پر محمول ہیں۔ فلا تعارض۔ (حاشیہ جلالین)

کفار کے لئے ایمان لانے سے کیا چیز مانع ہے؟

پارہ نمبر: ۱۵

آیات

① ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ (پارہ:۱۵ ارکوع:۱۱ سورۂ بنی اسرائیل (الاسراء) جلالین ص:۲۳۸) ✦

② ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (پارہ:۲۰ سورۂ کہف جلالین ص:۲۴۷ و ۲۴۸)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ لوگوں کے پاس جب ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے سے صرف اس چیز نے روک رکھا ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ یعنی ان کا اعتقاد یہ ہو گیا ہے کہ رسول بشر نہیں ہو سکتا، رسول تو کوئی فرشتہ ہونا چاہئے صرف یہ اعتقاد باطل ان کے ایمان لانے سے مانع بن رہا ہے، اگر یہ اعتقاد نہ ہوتا تو وہ ایمان لے آتے۔ اس آیت میں نفی واستثناء کے ذریعہ مانع عن الایمان کو منحصر کر دیا گیا ہے اعتقاد مذکور میں، اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ ان کو ایمان واستغفار سے صرف اس چیز نے روک رکھا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو پہلی امتوں کی طرح ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیا ہے، اگر حق تعالیٰ یہ ارادہ نہ فرماتے تو یہ لوگ ایمان لے آتے۔ "ان تاتیھم" سے پہلے "ارادۃ اللّٰہ" محذوف ہے "ای ومامنع الناس ان یؤمنوا الا ارادۃ اللّٰہ ان تاتیھم سنۃ الاولین" اس

آیت میں مانع عن الایمان کو منحصر کیا گیا ہے حق تعالیٰ کے ارادۂ مذکور میں، پس ان دونوں آیتوں میں تعارض ہو رہا ہے اس لئے کہ کسی شئے کو کسی شئے میں منحصر کرنا ماعدا کی نفی کو مستلزم ہوتا ہے، پس جب آیت اولیٰ میں یہ کہا گیا کہ مانع عن الایمان صرف ان کا اعتقادِ مذکور ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے علاوہ اور کوئی مانع نہیں ہے حتی کہ حق تعالیٰ کا ارادۂ مذکورہ بھی مانع نہیں ہے اور دوسری آیت میں یہ فرمایا کہ مانع عن الایمان صرف حق تعالیٰ کا ارادۂ مذکورہ ہے اور کوئی مانع نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا اعتقاد مذکور مانع نہیں، پس دونوں مانع میں سے ہر ایک کی نفی بھی ہو رہی ہے اور اثبات بھی۔ وهذا هو التعارض فافهم۔

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ آیت اولیٰ میں مانع عادی و ظاہری مراد ہے اور آیت ثانیہ میں مانع حقیقی مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے سے ظاہری اور عادی مانع تو صرف ان کا یہ اعتقاد ہے کہ بشر رسول نہیں ہوسکتا اور حقیقی مانع صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو پہلی امتوں کی طرح ہلاک کرنے کا ارادہ اور فیصلہ کرلیا ہے، فاذا اختلف المانعان اندفع التعارض۔ (روح المعانی والاتقان)

کفار کو قیامت کے روز اعمیٰ، ابکم، اصم بنا کر اٹھایا جائے گا یا بصیر و ناطق و سامع؟

پارہ نمبر: ۱۵، ۱۶، ۱۸، ۲۵، ۲۶

① ﴿وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْياً وَّبُكْماً وَّصُمًّا﴾

(پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۱ سورۂ بنی اسرائیل (الاسراء) جلالین ص: ۲۳۸)

② ﴿وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْراً﴾ (پارہ: ۱۶ رکوع: ۱۶ سورۂ طٰہٰ جلالین ص: ۲۶۸، ۲۶۹) ✦

③ ﴿وَرَاَى الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا﴾

(پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۹ سورۂ کہف جلالین ص: ۲۴۷)

④ ﴿اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظاً وَّزَفِيْراً﴾

(پارہ: ۱۸ رکوع: ۱۷ سورۂ فرقان جلالین ص: ۳۰۳)

⑤ ﴿اِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَاناً ضَيِّقاً مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا﴾

(پارہ: ۱۸ رکوع: ۱۷ سورۂ فرقان جلالین ص: ۳۰۳)

⑥ ﴿وَتَرٰهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خَاشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ﴾ (پارہ: ۲۵ رکوع: ۶ سورۂ شوریٰ جلالین ص: ۴۰۴)

⑦ ﴿لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ﴾ (پارہ: ۲۶ رکوع: ۱۶ سورۂ ق جلالین ص: ۴۳۰)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ قیامت کے دن کفار کو ان کے چہروں کے بل اندھا، گونگا، بہرا بنا کر میدان محشر میں اکٹھا کریں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار قیامت کے روز میدان محشر میں اندھے، گونگے، بہرے ہوں گے، اسی طرح آیت نمبر ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کو نابینا بنا کر اٹھایا جائے گا، وہ کہے گا اے رب، میں تو بصیر تھا، تو نے مجھے اعمیٰ کیوں بنا دیا؟ اور آیت نمبر ۳ میں ہے کہ مجرمین جہنم کو دیکھیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار قیامت کے دن اندھے نہیں ہوں گے بلکہ بینا اور بصیر ہوں گے، آیت نمبر ۴ میں ہے کہ جب جہنم ان کو دور سے دیکھے گی تو یہ لوگ جہنم کے غصہ اور جوش و خروش کی آواز سنیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار بہرے نہیں ہوں گے بلکہ سماعت والے ہوں گے اور آیت نمبر ۵ میں ہے کہ جب ان کے ہاتھوں کو گردنوں پر باندھ کر جہنم کی تنگ کوٹھڑی میں ڈالا جائے گا تو یہ لوگ ہلاکت کو پکاریں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ گونگے نہیں ہوں گے اور چھٹی آیت میں ہے کہ آپ کفار کو دیکھیں گے جب ان کو جہنم کے سامنے لایا جائے گا تو ذلت کے مارے ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی اور یہ جہنم کی طرف نگاہ چراتے ہوئے دیکھیں گے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفار قیامت میں اندھے نہیں ہوں گے بلکہ بینا ہوں گے، اسی طرح آیت نمبر ۷ میں ہے کہ کافر سے قیامت کے روز کہا جائے گا کہ تو دنیا میں غفلت میں پڑا ہوا تھا، آج ہم نے تیری غفلت کا پردہ تجھ سے دور کر دیا، پس تیری نگاہ آج بڑی تیز ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفار اندھے نہیں بلکہ بینا ہوں گے، پس اخیر کی پانچ آیات پہلی دو آیتوں کے بظاہر معارض ہو رہی ہیں۔

دفع تعارض

اولاً عمیٰ اور بصارت کے تعارض کے جوابات دیئے جاتے ہیں، اس کے سات

جوابات ہیں:

❶ اختلاف زمان پر محمول ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ کافر کو اولاً بصیر اٹھایا جائے گا، پھر اعمٰی بنا دیا جائے گا، مطلب یہ ہے کہ قبروں سے اٹھتے وقت تو کفار بینا ہوں گے مگر جب محشر کی طرف جائیں گے تو اندھے ہو جائیں گے، اس پر کافر کہے گا اے خدا! میں تو قبر سے اٹھتے وقت بینا تھا، تو نے مجھے اندھا کیوں کر دیا؟ (روح المعانی)

❷ ایک احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اختلاف زمان پر محمول ہے مگر صورت برعکس ہے کہ اولاً تو کفار اندھے ہوں گے، پھر ان کو بینا کر دیا جائے گا جس سے وہ جہنم اور اہوال قیامت کا مشاہدہ کریں گے اور "رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْ اَعْمٰی وَقَدْ کُنْتُ بَصِیْرًا" کا مطلب وقد کنت بصیراً فی الد نیا ہے، یعنی جس وقت قبروں سے اندھے اٹھیں گے تو کہیں گے ہم تو دنیا میں بینا تھے، ہمیں اندھا کیوں بنا دیا؟

❸ اختلاف زمان و مکان پر محمول ہے، یعنی میدان محشر میں اندھے ہوں گے اور جب جہنم میں داخل ہوں گے تو بینا ہو جائیں گے، اپنی حالت اور اپنے محلِ عذاب کو دیکھیں گے۔ (بیضاوی)

❹ حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ انہ لا یری شیئا الا النار جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آیت میں عمٰی سے عمٰی اضافی مراد ہے، یعنی جہنم کے علاوہ باقی تمام چیزوں کو دیکھنے سے اندھے ہوں گے مگر یہ حالت ان کی یوم قیامت کے بعض اوقات میں رہے گی، اس کے بعد وہ مطلق بینا بنا دیئے جائیں گے کہ ہر چیز کو دیکھیں گے، ورنہ تو وہ اعمال ناموں کو کیسے پڑھ پائیں گے؟ حق تعالیٰ قیامت کے دن کافر سے فرمائیں گے "اِقْرَاْ کِتَابَکَ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا" اور قرأتِ کتاب کا حکم دینا اسی وقت درست ہوسکتا ہے جب کہ اس کو بینا بنا دیا جائے، معلوم ہوا کہ کافر بعد میں بینا ہو جائے گا۔ (روح المعانی، وتفسیر کبیر)

۵ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ اعمٰی سے مراد اعمی عن الحجة ہے یعنی وہ حجت اور دلیل کے اعتبار سے اندھے ہوں گے، ان کے پاس ایسی کوئی حجت ودلیل نہ ہوگی جس کو پیش کر کے وہ نجات پاسکیں، وہ کہیں گے "یا خدا! ہم تو دنیا میں بڑی حجتیں اور دلیلیں پیش کیا کرتے تھے، آپ نے ہمیں حجتوں سے اندھا کیوں کردیا؟ ہمیں کوئی حجت نظر ہی نہیں آرہی ہے۔" یہ توجیہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، مقاتل رحمۃ اللہ علیہ، ضحاک رحمۃ اللہ علیہ، اور ابوصالح رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ (روح المعانی)

۶ اعمٰی القلب والبصیرة مراد ہے، یعنی وہ آنکھوں سے اندھے نہیں ہوں گے بلکہ قلب اور بصیرت کے اندھے ہوں گے، ابراہیم بن عرفہ اسی کو اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جہاں بھی مقام مذمت میں عمٰی کا ذکر کیا ہے اس سے مراد عمی القلب ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ" مگر ابن عطیہ نے اس توجیہ کو یہ کہہ کر رد کردیا ہے کہ بصیرت تو کافر کی دنیا میں بھی مفقود ہوتی ہے، لہٰذا اس کا رب سے "لِمَ حَشَرْتَنِيْ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا" کہنا صحیح نہیں ہوگا، معلوم ہوا کہ اعمٰی البصیرة مراد نہیں ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ جنہوں نے اعمی القلب والبصیرة مراد لیا ہے ان کے نزدیک بصیرت سے مراد بصیرت ایمانی نہیں ہے بلکہ حجت و دلیل ہی مراد ہے۔ مطلب یہ ہوگا "وقد كنت عالما بحجتي بصيراً بها احاج بها عن نفسي في الدنيا" کہ میں تو دنیا میں اپنی حجت کا دانا و بینا تھا، اپنی طرف سے حجتیں اور دلیلیں پیش کیا کرتا تھا، پس کوئی اشکال نہیں کیونکہ کفار کی جو بصیرت دنیا میں مفقود ہوتی ہے وہ بصیرت ایمانی ہے۔ (روح المعانی)

۷ اعمٰی سے مراد متحیر ہے کہ کافر قیامت کے دن حیران و پریشان ہوگا، عذاب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہ آسکے گی جیسا کہ اندھا آدمی کسی موذی جانور کو دفع

کرنے اوراس سے بچنے کی تدبیر کرنے میں حیران و پریشان ہو جاتا ہے کہ معلوم نہیں یہ جانور کہاں اور کدھر ہے؟ کس طرح اس کو ماروں اور کس طرف کو اس سے بچوں؟ ایسے ہی کافر قیامت کے روز حیلوں اور تدبیروں سے اندھا ہوگا، وہ کہے گا خدایا، دنیا میں مصیبتوں سے بچنے کے لئے قسم قسم کی تدبیریں کر لیا کرتا تھا، آج مجھے تدبیروں سے اندھا کیوں کر دیا کہ کوئی تدبیر عذابِ جہنم سے بچنے کی نظر نہیں آ رہی ہے۔

(تفسیر روح المعانی)

یہ سات جوابات تو اعمیٰ اور بصیر کے درمیان تعارض کے ہوئے، اس کے بعد ابکم و ناطق اور اصم و سامع کے درمیان تعارض کے جوابات سنئے، اس کے تین جواب ہیں:

① اختلاف زمان پر محمول ہے، یعنی اولاً یہ لوگ معدوم الحواس، گونگے اور بہرے ہوں گے، پھر ان کے نطق و سماعت کو لوٹا دیا جائے گا جس سے یہ لوگ بولیں گے اور سنیں گے، ہلاکت کو پکاریں گے اور جہنم کا جوش خروش وغیرہ سنیں گے۔ ولا تعارض بعد اختلاف الزمان۔ (صاوی، روح المعانی)

② حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ بہرے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ کوئی ایسی بات نہیں سن پائیں گے جس سے ان کے کانوں کو لذت و سرور محسوس ہو اور گونگے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حجت اور دلیل کے اعتبار سے گونگے ہوں گے، کوئی ایسی حجت و دلیل بیان نہیں کر پائیں گے جو عند اللہ مقبول ہو، مطلق ہر چیز سے اصم و ابکم ہونا مراد نہیں ہے، پس آیت اولیٰ سماع و نطق والی آیات کے معارض نہیں ہے۔ (روح المعانی)

③ حضرت مقاتل بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اولاً تو یہ لوگ سامع اور بصیر ہوں گے مگر جب ان کو چہروں کے بل جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور یہ لوگ عذاب جہنم سے پریشان ہو کر جہنم سے نکلنے کی درخواست کریں گے "رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ" تو حق تعالیٰ ایک مدت طویلہ کے بعد جواب دیں

گے "اِخْسَأُوْا فِیْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ" ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں پڑے رہو اور مجھ سے کوئی بات چیت مت کرو، اس جواب کے بعد وہ لوگ اندھے، بہرے، گونگے ہوجائیں گے، نہ کسی کو دیکھ پائیں گے، نہ کوئی بات سن پائیں گے، نہ بول پائیں گے۔

فاندفع التعارض لاختلاف الزمان۔ (روح المعانی وتفسیر قرطبی)

اصحاب کہف نے نیند سے بیدار ہو کر کیا کہا تھا؟

پارہ نمبر: ۱۵

آیات

① ﴿ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ﴾ (پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۵ سورۂ کہف جلالین ص: ۲۴۲) ✦

② ﴿ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ﴾ (پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۵ سورۂ کہف جلالین ص: ۲۴۲)

تشریح تعارض

اصحاب کہف غار میں تین سو برس تک گہری نیند سونے کے بعد جب بیدار ہوئے تو ان کے سردار مکسلمینا نے اپنے ساتھیوں سے معلوم کیا "كَمْ لَبِثْتُمْ" تم کتنی دیر تک سوتے رہے؟ اس کے جواب میں ساتھیوں نے جو کہا اس بارے میں حق تعالیٰ شانہ نے اصحاب کہف کے دو مقولے ذکر کیے:

① "لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ" کہ ہم لوگ ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم نیند کی حالت میں رہے۔

② "رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ" کہ تمہارا رب تمہاری مدت لبث کو زیادہ جانتا ہے۔ ان دونوں مقولوں میں تعارض ہے کیونکہ مقولہ اولیٰ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے مدت لبث فی حالۃ النوم کی تصریح کر دی اور مقولہ ثانیہ میں یہ ہے کہ انہوں نے مدت لبث کو حق سبحانہ کے علم پر محول کر دیا، گویا یہ کہا کہ ہمیں معلوم نہیں خدا ہی زیادہ جانتا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں اور تجزیہ کے بعد تین جواب ہو جاتے ہیں:

❶ دونوں مقولوں کے قائل جدا جدا ہیں، یعنی "قَالَ بَعْضُهُمْ لَبِثْنَا يَوْماً اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ وَقَالَ بَعْضُهُمْ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَالَبِثْتُمْ"، بعض نے تو کہا ہم ایک دن یا بعض دن سوئے، دوسرے بعض ساتھی بولے کہ اپنی طرف سے تعیین وتصریح کیوں کرتے ہو، حق تعالیٰ تمہاری مدت لبث کو زیادہ جانتے ہیں اور جب دو متعارض مقولوں کے قائل جدا جدا ہوں تو کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (روح المعانی وتفسیر ابوالسعود)

❷ دونوں مقولوں کے قائل تو متحد ہیں، مگر زمانہ دونوں کا مختلف ہے، پھر اختلاف زمانہ کی دو صورتیں ہیں: اولاً تو انہوں نے بیدار ہوتے ہی بلا تامل وغور وفکر یہ کہہ دیا "لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ" پھر کچھ تامل اور غور وفکر کے بعد کہا "رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ" دراصل وہ لوگ طلوعِ شمس کے وقت سوئے تھے اور تین سو برس کے بعد غروبِ شمس کے وقت بیدار ہوئے تھے، انہوں نے گمان کیا کہ یہ آج ہی کے دن کا غروب ہے اور غار کے اندر ہونے کی وجہ سے اور نیند کا اثر زائل نہ ہونے کی وجہ سے غروب شمس کا اچھی طرح ادراک نہ کر سکے اس لئے انہوں نے شک کے ساتھ کہا "لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ" یعنی اگر غروب شمس ہو چکا ہے تو یوماً اگر نہیں ہوا ہے تو بعض یوم، پھر کچھ دیر بعد جب تامل اور غور فکر کیا تو احساس ہوا کہ ہماری نیند طویل ہوئی ہے اور یہ متعین نہیں کر سکے کہ کتنی طویل ہوئی ہے، اس لئے احتیاطاً اور ادباً علم باری تعالیٰ پر محول کرتے ہوئے کہہ دیا "رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ." دوسری صورت یہ ہے کہ اولاً تو نیند کا اثر اور سستی زائل نہ ہونے کی وجہ سے "لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ" کہہ دیا، پھر اپنے ناخن اور بالوں کو بڑھا ہوا دیکھ کر اندازہ لگایا کہ مدت نوم طویل ہوئی ہے (جیسا کہ بعض حضرات سے منقول ہے کہ ان کے ناخن اور بال بڑھ گئے تھے) اور مقدار طول نوم متعین نہ ہونے کی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ کے علم پر محول کیا اور کہا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مقولہ اولیٰ قبل التامل پر اور مقولہ ثانیہ بعد التامل پر محمول ہے، یا مقولہ اولیٰ قبل النظر الی طول الاظفار والشعور پر اور مقولہ ثانیہ بعد

المنظر الیہ پر محمول ہے اور جب دو متعارض مقولوں کا زمانہ مختلف ہو تو تعارض نہیں رہتا۔ (روح المعانی وجمل)

مگر ان دو جوابوں میں سے جواب اول چند وجوہ سے راجح ہے:

① ایک تو اس وجہ سے کہ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ کو جملہ مستانفہ لایا گیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں کے قائل جدا جدا ہیں، اگر دونوں کے قائل متحد ہوتے تو جملہ ثانیہ کو جملہ اولیٰ پر ثم کے ذریعہ عطف کر کے ثُمَّ قَالُوْا الخ کہنا چاہئے تھا کہ پہلے تو انہوں نے یہ کہا پھر یہ کہا۔

② دوسرے اس وجہ سے کہ اگر جملہ ثانیہ بھی جملہ اولیٰ کے قائلین کا مقولہ ہوتا تو صیغہ تکلم کے ساتھ "رَبُّنَا اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْنَا" ہونا چاہئے تھا، رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ صیغہ خطاب کے ساتھ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ان میں سے بعض کا مقولہ ہے جو دوسرے بعض ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

③ تیسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ اس صورت میں اصحاب کہف کی دو جماعتیں ہو جائیں گی، ایک مدت لبث کو قلیل سمجھ کر لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ کہنے والی دوسری مدت لبث کو طویل سمجھ کر رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ کہنے والی، پس یہ آیت، آیت سابقہ "ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا" کے موافق ہو جائے گی جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے اصحاب کہف کو بیدار کیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ ان کی دو جماعتوں میں سے کس جماعت نے مدت لبث کو زیادہ یاد رکھا ہے، اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ جس جماعت نے "لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ" کہا وہ مدت لبث کو ضبط نہیں کر سکی جنہوں نے مدت کو طویل سمجھ کر "رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ" کہا انہوں نے مدت لبث کو زیادہ یاد رکھا ہے اور جواب ثانی میں (یعنی جب کہ دونوں مقولوں کا قائل متحد ہو) اصحاب کہف کی یہ دو جماعتیں نہیں ہوتیں جس کی بناء پر یہ آیت، آیت سابقہ مذکورہ کے موافق نہیں رہتی، پس جواب اول راجح ہے۔ (تفسیر ابوالسعود)

اہل جنت کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے یا چاندی کے یا موتیوں کے؟

پارہ نمبر: ۱۵، ۱۷، ۲۲، ۲۹

① ﴿يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ﴾

(پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۶ سورۂ کہف جلالین ص: ۲۴۴) ✦

② ﴿يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا﴾

(پارہ: ۱۷ رکوع: ۱۰ سورۂ حج جلالین ص: ۲۸۰)

③ ﴿يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۱۶ سورۂ فاطر جلالین ص: ۳۶۶) ✦

④ ﴿وَحُلُّوْا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۹ سورۂ دہر جلالین ص: ۴۸۴)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور آیت نمبر ۲ و ۳ میں ہے کہ سونے اور موتیوں کے کنگن اور آیت نمبر ۴ میں ہے کہ چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے، ان چاروں آیتوں میں تعارض ظاہر ہے۔

دفع تعارض

اولاً بطور تمہید یہ سنئے کہ آیت ثانیہ میں لفظ لُؤْلُؤًا میں دو قراٰت ہیں، ایک نصب

کے ساتھ، دوسری جر کے ساتھ، اگر نصب پڑھا جائے تو اس کا عطف اساور کے محل پر ہوگا "اساور" من حرف جار کا مدخول ہونے کی وجہ سے لفظاً مجرور ہے، اگرچہ غیر منصرف ہونے کی وجہ سے نصب آگیا ہے مگر لفظاً اس کو مجرور ہی کہا جائے گا اور یحلون کا مفعول ہونے کی وجہ سے محلاً منصوب ہے، اساور کے محل پر عطف کرتے ہوئے لُؤْلُؤًا بھی منصوب ہوگا اور تقدیر عبارت اس طرح ہوگی "یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّیُحَلَّوْنَ لُؤْلُؤًا" اور ترجمہ یہ ہوگا کہ ان کو جنت میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور موتی پہنائے جائیں گے۔ پھر موتی پہنائے جانے میں دو احتمال ہیں یا تو موتیوں کے کنگن یا موتیوں کے ہار، اور اگر لُؤْلُؤٍ مجرور پڑھا جائے تو ذھب پر عطف ہوگا اور ترجمہ یہ ہوگا کہ ان کو سونے اور موتیوں کے بنے ہوئے کنگن پہنائے جائیں گے، یعنی سونے کے کنگن موتیوں سے جڑے ہوئے ہوں گے جیسا کہ صاحب جلالین نے بان یرصع اللؤلؤ بالذھب کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔

اس تمہید کے بعد تعارض کی تشریح کی جاتی ہے، جس کی تقریر اس طرح ہے کہ اگر یہ مراد لیا جائے کہ موتیوں کے کنگن نہیں ہوں گے بلکہ موتیوں کے ہار یا موتی سونے پر جڑے ہوئے ہوں گے تو تعارض صرف اساور من فضة اور اساور من ذھب میں رہ جاتا ہے اور اگر موتیوں کے مستقل کنگن مراد لئے جائیں تو تعارض تینوں میں ہوجاتا ہے، اساور من ذھب، اساور من فضة، اساور من لُؤْلُؤٍ، صورت اولیٰ یعنی ذہب اور فضہ میں تعارض کے وقت اس کے سات جواب ہیں:

① اختلاف اشخاص پر محمول ہے، یعنی سونے کے کنگن تو اہل جنت کے لئے اور چاندی کے کنگن ان کے خدام کے لئے ہوں گے۔

② اختلاف اشخاص ہی پر محمول ہے مگر اس کی صورت یہ ہے کہ چاندی کے کنگن بچوں کے لئے اور سونے کے کنگن عورتوں کے لئے۔

③ اختلاف زمان پر محمول ہے، کبھی سونے کے کنگن، کبھی چاندی کے۔

④ تفاوت اعمال پر مدار ہے، جس کا جیسا عمل ہوگا ویسے ہی کنگن پہنائے جائیں گے بعض کو سونے کے، بعض کو چاندی کے۔

⑤ تفاوت رغبت پر مدار ہوگا، یعنی اہل جنت کی رغبت اور خواہش کے مطابق معاملہ ہوگا، جو سونے کے پہننا چاہے گا اس کو سونے کے، جو چاندی کے پسند کرے گا اس کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے "وَلَكُمْ فِيهَا مَاتَشْتَهِيْ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَاتَدَّعُونَ."

⑥ جمعیت مراد ہے، ہر جنتی کو دو دو کنگن ملیں گے، ایک چاندی کا، ایک سونے کا، جو موتیوں سے جڑا ہوگا۔

⑦ جمعیت ہی مراد ہے مگر اس کی صورت یہ ہے کہ ہر جنتی کو تین تین کنگن ملیں گے، ایک چاندی کا، ایک خالص سونے کا، ایک موتی سے جڑا ہوا سونے کا۔

(روح المعانی وجمل)

صورت ثانیہ یعنی ذہب، فضۃ اور لُؤلُؤتینوں میں تعارض ہونے کی صورت میں پانچ جواب ہیں:

① جمعیت مراد ہے، ہر جنتی کو تین تین کنگن ملیں گے، ایک سونے کا، دوسرا چاندی کا، تیسرا موتیوں کا بنا ہوا۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے "ان اهل الجنة يحلون اسورة من ذهب ولولؤ و فضة هي اخف عليهم من كل شيء اِنَّما هي نور." (اخرجہ عبدالحمید وابن منذر)

تذکرۃ القرطبی میں ہے: يسور المؤمن في الجنة بثلثة اسورة؛ سوار من ذهب، وسوار من فضة وسوار من لؤلؤ۔

② جمعیت ہی مراد ہے، مگر صورت وہ ہے جو سعید بن المسیب سے منقول ہے کہ ہر ایک کو چھ چھ کنگن پہنائے جائیں گے، دو سونے کے، دو چاندی کے، دو موتیوں کے (غالباً تین داہنے ہاتھ میں پہنیں گے اور تین بائیں ہاتھ میں)۔

③ اختلاف زمان پر محمول ہے، تارۃ من الذھب وتارۃ من الفضۃ وتارۃ من اللؤلؤ کما مر۔

④ تفاوت اعمال پر مدار ہوگا کما مر۔

⑤ تفاوت رغبت پر مدار ہوگا کما مر۔ (روح المعانی وجمل)

بنی اسرائیل کے دو بھائیوں میں سے کافر بھائی کو دو باغ دیئے گئے تھے یا ایک؟

پارہ نمبر: ۱۵

آیات

① ﴿ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ ﴾

(پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۷ سورۃ کہف جلالین ص: ۲۴۵) ✦

② ﴿ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ﴾ (پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۷ سورۃ کہف جلالین ص: ۲۴۵)

تشریح تعارض

حق تعالیٰ شانہ نے قوم بنی اسرائیل میں سے دو بھائیوں کا ایک قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا "جَعَلْنَا لِاَحَدِ هِمَا جَنَّتَيْنِ" کہ ہم نے ان میں سے ایک کو انگوروں کے دو باغ عطا فرمائے تھے۔ اس کے بعد ان باغوں کے اوصاف ذکر کیے، پھر جب قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے بھائی کو اپنے باغوں کی رونق و زینت دکھلانے کے لئے لے گیا تو اس کے لئے حق تعالیٰ نے وَدَخَلَ جَنَّتَهُ صیغۂ مفرد ذکر کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک باغ تھا اور آیت اولیٰ میں صیغۂ تثنیہ کے ساتھ جنتین فرمایا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو باغ تھے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے چھ جواب ہیں:

❶ جس طرح الف لام استغراقی ہوتا ہے اسی طرح اضافت بھی استغراقی ہوتی ہے

یہاں جنت کی اضافت ''ہ'' ضمیر کی طرف استغراقی ہے، مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام باغوں (دونوں باغوں) میں داخل ہوا، اس کے تمام باغ دو ہی باغ تھے۔

(روح المعانی، وجمل)

❷ دونوں باغ متصل تھے اتصال کی وجہ سے ان دونوں کو ایک شمار کر کے جنتہ کہہ دیا گیا۔ (تفسیر ابوالسعود)

❸ دونوں باغوں میں دخول چونکہ ایک وقت میں نہیں ہوسکتا، بلکہ یکے بعد دیگرے ہی ہوسکتا ہے اس لئے صیغۂ مفرد استعمال کیا، مطلب یہ ہے کہ پہلے ایک باغ دکھلایا پھر دوسرا، یعنی دخل جنتہ بعد جنۃ ایک کے ذکر پر اکتفا کرلیا گیا مراد دونوں ہیں۔

(تفسیر ابوالسعود)

❹ باغوں کی تعداد بیان کرنا مقصود ہی نہیں ہے اس لئے صیغۂ تثنیہ کا استعمال ضروری نہیں سمجھا گیا؛ صیغۂ مفرد کے ساتھ جنتہ کہہ دیا۔ (تفسیر ابوالسعود)

❺ جنت سے مراد باغ نہیں ہے، بلکہ جنتِ دنیویہ مراد ہے، کافر[1] کو جو مال و متاع دنیا میں ملتا ہے پس وہی اس کی جنت ہوتی ہے، آخرت کی جنت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے تو جنتہ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا کہ اس کے پاس جو دو باغ اور دیگر اموال واسباب تھے بس یہی اس کی جنت تھی، وہ اپنے مؤمن بھائی کو اپنی جنت دکھلانے لے گیا۔ (تفسیر کبیر)

❻ اس کو حق تعالیٰ نے ایک ہی باغ عطا فرمایا تھا، پس آیت نمبر۲ میں تو کوئی اشکال نہیں، البتہ آیت نمبر۱ میں جنتین اس لئے فرمایا کہ اس باغ کے درمیان ایک نہر جاری تھی، نہر کے دونوں طرف باغ تھا اس لئے اس کو دو باغوں سے تعبیر کردیا گیا جیسا کہ

(۱) جس بھائی کو دو باغ دیے گئے تھے وہ کافر تھا جس کا نام فرطوس یا قطفیر بتایا گیا ہے اور دوسرا بھائی مؤمن تھا جس کا نام بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہودا اور بقول حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ یملیخا تھا جس نے اپنا سارا اثاثہ اللہ کے راستہ میں خرچ کردیا تھا اور دنیاوی اعتبار سے فقیر ومحتاج ہوگیا تھا۔
(روح المعانی)

ابن ابی حاتم نے امام سدی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے مگر یہ توجیہ ضعیف ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے وَفَجَّرْنَا خِلَالَهُمَا نَهَراً، جنتین کے ذکر کے بعد فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو مستقل باغ تھے، ان دونوں کے درمیان نہر جاری تھی، اگر باغ ایک ہوتا اور درمیان میں نہر جاری ہوجانے کی وجہ سے دو باغ ہوگئے تھے تو اس صورت میں یوں کہا جاتا "جعلنالاحدهما جنةوفجرنا خلالهانهراً، فصارتا جنتين."

(روح المعانی)

قیامت کے روز پہاڑوں کا کیا حال ہوگا؟

پارہ نمبر: ۱۵، ۱۶، ۲۰، ۲۷، ۲۹، ۳۰

آیات

① ﴿وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً﴾

(پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۸ سورۂ کہف جلالین ص: ۲۴۶)

② ﴿وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ﴾

(پارہ: ۲۰ رکوع: ۳ سورۂ نمل جلالین ص: ۳۲۵)

③ ﴿وَتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۳ سورۂ طور جلالین ص ۴۳۵)

④ ﴿وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۱ سورۂ نبا جلالین ص: ۴۸۷)

⑤ ﴿وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۶ سورۂ تکویر جلالین ص: ۴۹۱) ✦

⑥ ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا﴾

(پارہ: ۱۶ رکوع: ۱۵ سورۂ طٰہٰ جلالین ص: ۲۶۷)

⑦ ﴿وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۲۱ سورۂ مرسلات جلالین ص: ۴۸۵) ✦

⑧ ﴿وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۴ سورۂ واقعہ جلالین ص: ۴۴۶) ✦

⑨ ﴿وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۵ سورۂ حاقہ جلالین ص: ۴۷۱ و ۴۷۲) ✦

⑩ ﴿وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۷ سورۂ معارج جلالین ص: ۴۷۳)

⑪ ﴿وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ﴾

(پارہ: ۳۰ رکوع: ۲۶ سورۂ قارعہ جلالین ص: ۵۰۵) ✦

⑫ ﴿ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴾ (پارہ:۲۹ رکوع:۱۳ سورۂ مزمل جلالین ص:۴۷۸)

تشریح تعارض

قیامت کے روز پہاڑوں کا کیا حال ہوگا اس بارے میں یہ آیات متعارض ہیں، یہ آیات آٹھ قسم کے مضامین پر مشتمل ہیں:

① مرور (چلنا)، ② تسییر (چلانا)، ③ نسف (اڑانا)، ④ بس (ریزہ ریزہ کرنا یا ہانکنا)، ⑤ دك (ٹکڑے ٹکڑے کردینا)، ⑥ هباء منبثاً (بکھرا ہوا غبار)، ⑦ عہن (روئی)، ⑧ کثیباً مهیلا (بہنے والے ریت کا ٹیلہ)

آیت نمبر ا تا ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کو چلایا جائے گا، جن میں سے آیت نمبر ۲ میں یہ ہے کہ بادلوں کی طرح چلتے ہوئے ہوں گے۔ اس کے بعد آیت نمبر ۶ و ۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ اڑا دیا جائے گا۔ اس کے بعد آیت نمبر ۸ میں وبست الجبال کہا گیا ہے، بُسَّتْ کی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ و مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فُتَّتْ (ریزہ ریزہ کردیا جائے گا) کے ساتھ کی ہے اور بعض نے سیقت کے ساتھ کی ہے بمعنیٰ ہانکنا، چلانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کردیا جائے گا یا ہانکا جائے گا۔ "بست" کی دوسری تفسیر کی صورت میں یہ پہلی پانچ آیات کے مضمون کے موافق ہوجائے گی۔

نیز اس آیت میں اس کے ساتھ ساتھ هبآء منبثًا کہا گیا ہے، جس کے معنی بکھرے ہوئے غبار کے آتے ہیں، پھر آیت نمبر ۹ میں ہے کہ ٹکڑے ٹکڑے کردیئے جائے گا، یہ بست کی تفسیر اولیٰ فتت کے موافق ہے، اس کے بعد آیت نمبر ۱۰ و ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ دھنی ہوئی روئی کے گالے کی طرح ہوجائیں گے، اس کے بعد آیت نمبر ۱۲ میں ہے کہ بہنے والے ریت کے ٹیلہ کی طرح ہوجائیں گے، پس اس طرح ان آیت میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

قیامت کے دن پہاڑوں پر یکے بعد دیگرے یہ سب احوال مذکورہ طاری ہوں گے جن کو ان آیات میں متفرق طور پر ذکر کر دیا گیا ہے، اولاً تو پہاڑوں کو زمین سے اکھاڑ کر فضا میں لے جایا جائے گا، وہاں پر ہوائیں فان کو اڑاتی پھریں گی، یہ بادلوں کے طرح چلتے ہوئے اور اڑتے ہوئے ہوں گے اور روئی کے گالوں کی طرح دکھائی دیں گے، جس طرح اڑتے ہوئے بادل روئی کے گالوں کی طرح معلوم ہوا کرتے ہیں، پھر ان کو زمین پر گرا کر ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا، ایسا محسوس ہوگا جیسے مجتمع ریت کا ٹیلہ بہنے لگا ہو، اس کے بعد ان کو ہباءً منثوراً (بکھرے ہوئے غبار) کی طرح بنا دیا جائے گا، پس ان آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے، حضرت حسن اور دیگر محققین حضرات سے اسی طرح منقول ہے۔ (روح المعانی)

قیامت کے دن کفار کے اعمال تولے جائیں گے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۶، ۱۸

آیات

① ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا﴾ (پارہ: ۱۶ رکوع: ۳ سورۂ کہف جلالین ص: ۲۵۳) ✦

② ﴿وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ﴾ (پارہ: ۱۸ رکوع: ۶ سورۂ مؤمنون جلالین ص: ۲۹۳)

تشریح تعارض

آیت نمبر ا میں فرمایا کہ ہم کفار کے لئے وزن قائم نہیں کریں گے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کفار کے اعمال کو تولا نہیں جائے گا اور آیت نمبر ۲ میں ارشاد ہے کہ جن کے ترازو کے پلے ہلکے ہوں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے کو خسارہ میں ڈال دیا، یہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے اعمال تولے جائیں گے، آیت اولیٰ میں اعمال کفار کے وزن کا اثبات اور آیت ثانیہ میں وزن کی نفی ہے، پس بظاہر دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ آیت اولی میں مطلق وزن کی نفی مراد نہیں ہے بلکہ وزن نافع کی نفی مقصود ہے،

یعنی ”فلا نقیم لهم یوم القیامة وزناً نافعاً“ مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال کا وزن تو کیا جائے گا مگر اس وزن سے ان کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا کیونکہ کفار نے ثواب کی خاطر جو اعمال حسنہ دنیا میں کیے وہ قبولیت کی شرط یعنی ایمان نہ ہونے کی وجہ سے بے کار ہوجائیں گے کہ دیکھنے میں تو وہ اعمال بڑے بڑے نظر آئیں گے مگر اندر سے کھوکھلے اور خالی ہوں گے، جب ترازو کے پلہ میں ان کو رکھا جائے گا تو ان کی وجہ سے پلہ بھاری نہیں ہوگا بلکہ ہلکا ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ اعمال کے وزن سے صاحب اعمال کو نفع اسی وقت ہوگا جب کہ اعمال حسنہ کا پلہ بھاری ہو جیسا کہ ارشاد ہے ”فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ“ اور جب ان لوگوں کا پلہ ہلکا رہے گا تو ان کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا بلکہ یہ لوگ خسارہ اور نقصان میں رہیں گے، اسی کو آیت ثانیہ میں فرمایا ”وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خَالِدُوْنَ“ خلاصہ یہ ہوا کہ نفی وزن نافع کی ہے اور اثبات وزن غیر نافع کا ہے، جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (جلالین وغیرہ)

❷ آیت اولیٰ میں وزن قائم نہ کرنے سے تولنے کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ کفار کی توہین اور تحقیر شان مراد ہے، یعنی آیت شریفہ میں وزن اعمال یا عدم وزن اعمال کو بیان کرنا مقصود ہی نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ قیامت کے دن ہمارے نزدیک کفار کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، ان کی کوئی قدر و منزلت اور کوئی حیثیت ہماری نظروں میں نہیں ہوگی کیونکہ قدر و منزلت تو اس دن اعمال حسنہ والے شخص کی ہوگی اور جب ان کفار کے اعمال حسنہ ضائع اور بے کار ہو چکے ہوں گے تو یہ لوگ گویا اعمال حسنہ سے بالکل کورے اور خالی ہوجائیں گے، جس کی وجہ سے ان کی کوئی قدر و منزلت اور کوئی وقعت نہیں ہوگی، یہ لوگ نہایت ذلیل و حقیر ہوں گے، پس آیت اولیٰ میں وزن سے مراد اس کے حقیقی معنی تولنا مراد نہیں ہے بلکہ وزن کے مجازی معنی یعنی اعتبار کرنا اور قدر و

منزلت مراد ہے، یعنی "فَلَا نَجْعَلُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِعْتِبَارًا" وزن کو اعتبار کے معنی میں لینا کثیر الاستعمال ہے جیسے کہا جاتا ہے فلاں نے وزن دار بات کہی ہے، یعنی اس کی بات قابل قدر اور قابل اعتبار ہے اور فلاں کی بات کا کوئی وزن نہیں، یعنی اس کی بات معتبر نہیں ہے، اس کی کوئی حیثیت ہماری نظروں میں نہیں ہے، پس جب آیت اولیٰ میں وزن کی نفی مقصود ہی نہیں ہے تو آیت ثانیہ سے اس کا کوئی تعارض نہیں رہا۔ (روح المعانی)

❸ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، یعنی بعض کفار کے اعمال تولے جائیں گے اور بعض کے نہیں، جس طرح مؤمنین دو قسم کے ہوں گے، بعض تو وہ جو بلا حساب و کتاب و بلا وزن اعمال جنت میں چلے جائیں گے اور بعض حساب و کتاب اور وزن اعمال کے بعد جنت میں داخل ہوں گے، ایسے ہی کفار کی دو قسمیں ہوں گی، بعض وہ کفار جو بلا حساب و کتاب و بلا وزن اعمال جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے اور بعض کو حساب و کتاب اور وزن اعمال کے بعد جہنم میں بھیجا جائے گا، پس وزن کی نفی بعض کفار کے لئے اور وزن کا اثبات دوسرے بعض کفار کے لئے ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی توجیہ کو پسند کیا ہے۔ (قرطبی ومظہری)

مؤمنین صالحین جہنم میں داخل ہوں گے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۶، ۱۷

آیات

① ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾

(پارہ: ۱۶ ارکوع: ۸ سورۂ مریم جلالین ص: ۲۵۸) ✦

② ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ﴾

(پارہ: ۱۷ ارکوع: ۷ سورۂ انبیاء جلالین ص: ۲۷۷)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ تم میں سے ہر ایک کو جہنم میں ضرور داخل ہونا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص جہنم میں ضرور جائے گا، مؤمن ہو یا کافر، متقی وصالح ہو یا فاسق وفاجر، نبی یا ولی ہو یا غیر نبی وغیر ولی، سب جہنم میں ضرور داخل ہوں گے اور آیت ثانیہ میں ہے کہ ہم نے جن کے لئے بھلائی اور حسن عاقبت کا فیصلہ کردیا ہے، وہ جہنم سے دور رہیں گے، پس بظاہر دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے چار جواب ہیں:

① آیت اولیٰ میں ورود سے مراد حضور ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے الورود الحضور۔ عبد بن حمید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت عبید بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر نقل کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص کو جہنم کے قریب، مقام حساب وکتاب میں حاضر ہونا ہے، ورود بول کر قرب حضور مراد لیا جاتا

ہے جیسے "وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ" میں ورود سے مراد قرب وحضور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین کے کنویں کے قریب حاضر ہوئے، کنویں کے اندر داخل ہونا مراد نہیں ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب قافلہ شہر کے قریب آ جائے، ابھی شہر میں داخل نہ ہو تو کہہ دیا جاتا ہے "وردت القافلة البلدة"، اور "أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نفس جہنم سے مسافت کے اعتبار سے بعید ہوں گے کیونکہ بعد مسافت تو قرب کے منافی ہے۔ پس تعارض جوں کا توں باقی رہے گا بلکہ مُبْعَدُونَ عَنْ عَذَابِهَا مراد ہے، اصحاب حسنیٰ اگرچہ مسافت کے اعتبار سے تو جہنم کے قریب ہوں گے مگر اس کے عذاب سے دور رہیں گے، قریب ہوتے ہوئے بھی ان کو جہنم کی حرارت وغیرہ کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوگا اور اگر بعد مسافت ہی مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہے کہ اولاً جہنم کے قرب لایا جائے گا، پھر دور کر دیا جائے گا، پس کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر کبیر وروح المعانی ومدارک)

❷ ورود سے مراد دخول ہی ہے، قدماء مفسرین اور جمہور اہل سنت والجماعت اسی کے قائل ہیں، ورود بمعنی دخول دیگر آیات میں بھی مستعمل ہے جیسے "اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُونَ" ای داخلون، اسی طرح فرعون اور اس کی قوم کے متعلق ارشاد ہے "يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ" ای فادخلهم النار اور آیت ثانیہ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ کے معنی مُبْعَدُونَ عَنْ عَذَابِهَا ہیں، حق تعالیٰ ہر شخص کو جہنم میں داخل کریں گے مگر اس کے باوجود جہنم کی آگ مؤمنین وصالحین پر اثر نہ کرے گی، حق تعالیٰ نے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کو برداً وسلاماً بنا دیا تھا ایسے ہی مؤمنین صالحین کے حق میں جہنم کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی، حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے:

عن ابی سمية قال: اختلفنا في الورود، فقال بعضنا: لا يدخلها

مؤمن وقال آخر: يدخلونها جميعا ثم ينجي الله الذين اتقوا، فلقيت جابر بن عبدالله. فذكرت له فقال: واهوى باصبعيه الى اذنيه صمتا ان لم اكن سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: لايبق برولافاجرالا دخلها فتكون على المؤمن برداً وسلاماً كما كانتعلیٰ ابراهيم عليه الصلاة والسلام حتى ان للنار ضجيجاً من بردهم ثم ينجي الله الذين اتقوا.﴾

(اخرجہ احمد والحکیم الترمذی وابن المنذر روالحاکم وصححہ، روح المعانی)

ترجمہ: ''حضرت ابو سمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ہم لوگوں میں ورود کے بارے میں اختلاف ہوا، بعض نے تو کہا کہ مؤمن جہنم میں داخل نہیں ہوگا، دوسرے نے کہا جہنم میں سب لوگ داخل ہوں گے، پھر حق تعالیٰ متقین کو نجات عطا فرما دیں گے، پس میں نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کی تو ان سے اس بات کا ذکر کیا، انہوں نے اپنی دو انگلیاں کانوں کی طرف بڑھا کر فرمایا کہ، یہ دونوں کان بہرے ہو جائیں اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ کوئی نیک و فاجر جہنم میں داخل ہوئے بغیر باقی نہیں رہے گا مؤمن پر آگ ٹھنڈی وسلامتی والی ہوجائے گی، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوگئی تھی یہاں تک کہ لوگوں کے ٹھنڈا ہو جانے کی وجہ سے آگ شور مچانے لگے گی، پھر حق تعالیٰ اہل تقویٰ کو اس میں سے نکال دیں گے۔''

بہر حال خلاصہ یہ ہوا کہ ہر شخص جہنم میں داخل ہوگا، مگر مؤمنین صالحین اصحاب حسنیٰ اس کے عذاب سے دور اور محفوظ رہیں گے۔ فلا تعارض بين الآيتين۔

(روح المعانی)

❸ ورود سے مراد مرور ہے، حضرت حسن اور حضرت قتادہ نے یہی تفسیر کی ہے، اور یہ گزرنا اس پل صراط پر ہوگا جو جہنم کی پشت پر بچھایا جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مؤمن جہنم کے اوپر پل صراط پر سے گزر جائے گا، اور اس کو پتہ بھی نہ چلے گا جیسا کہ ایک روایت میں ہے:

﴿عن خالدبن معدان قال: اذادخل اهل الجنة، قالوا: ربنا الم تعدنا ان نردالنار؟ قال: بلى، ولكنكم مررتم عليها وهى خامدة.﴾ (اخرجہ ابن ابی شیبہ وعبد بن حمید والحکیم وغیرہم، روح المعانی ۱۶/۱۲۲)

ترجمہ: ''حضرت خالد بن معدان سے روایت ہے کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہوجائیں گے، تو عرض کریں گے اے خدا! کیا آپ نے ہم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہم جہنم پر وارد ہوں گے، حق تعالیٰ فرمائیں گے ہاں، وعدہ کیا تھا مگر تم لوگ تو اس پر سے گزر بھی گئے اس حال میں کہ اس کی آگ بجھی ہوئی تھی۔''

اس تفسیر پر بھی دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔

(تفسیر روح المعانی ومدارک)

❹ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ورود علی النار سے مراد دنیا میں بخار کا لاحق ہونا ہے، جہنم میں داخل ہونا یا اس پر سے گزرنا مراد نہیں ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص کو دنیا میں بخار لاحق ہوتا ہے، انہوں نے غالباً یہ تفسیر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک روایت کے پیش نظر کی ہے۔

﴿عن عائشةرضى الله تعالىٰ عنها قالت: ان النبى صلى الله عليه وسلم قال: الحمى من فيح جهنم فابردو هابالماء.﴾

(رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے، فرمایا کہ نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بخار جہنم کی حرارت سے ہوتا ہے، اس کو پانی سے ٹھنڈا کیا کرو۔"

مگر اس روایت سے مقصد پر استدلال غیر ظاہر ہے اس لئے کہ روایت میں ورود علی النار سے کوئی تعرض نہیں ہے۔ (تفسیر خازن وروح المعانی)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان کی لکنت بالکل زائل ہوگئی تھی یا کچھ باقی تھی؟

پارہ نمبر: ۱۶، ۲۰، ۲۵

آیات

① ﴿قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يَامُوْسىٰ﴾ (پارہ:۱۶ رکوع:۱۱ سورۂ طٰہٰ جلالین ص: ۲۶۲) ✦

② ﴿وَاَخِيْ هَارُوْنُ هُوَاَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ الخ﴾
(پارہ: ۲۰ رکوع: ۷ سورۂ قصص جلالین ص: ۳۳۰)

③ ﴿وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ﴾ (پارہ: ۲۵ رکوع: ۱۱ سورۂ الزخرف جلالین ص: ۴۰۸)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے موسیٰ آپ کی درخواست پوری کردی گئی حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام نے اللہ سے دعا کی تھی:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْلِيْ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ وَاجْعَل لِّيْ وَزِيْراً مِّنْ اَهْلِيْ هَارُوْنَ اَخِيْ.﴾

ترجمہ: ”اے پروردگار میرا سینہ کھول دے میری زبان کی گرہ (لکنت) دور کردے تا کہ لوگ میری بات سمجھیں اور میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر و معین بنا دے۔“

حق تعالیٰ نے دعا قبول کرتے ہوئے فرمایا ”قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يَا مُوْسىٰ“ اے موسیٰ جو دعائیں آپ نے ہم سے مانگی ہیں ہم نے قبول کر لی ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو شرح صدر سے بھی نواز دیا، آپ کی زبان کی لکنت بھی دور کردی گئی اور آپ کے

بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو آپ کا وزیر و معین بنا دیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان کی لکنت بالکل دور ہوگئی تھی، صاف بولنے لگے تھے اور آیت نمبر ۲ و ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ لکنت بالکلیہ زائل نہیں ہوئی تھی کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو خود سے افصح اللسان فرمایا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی زبان میں مجھ سے زیادہ روانی ہے، میں زیادہ صاف اور تیز بول نہیں پاتا، معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں کچھ لکنت باقی تھی اور آیت نمبر ۳ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس دعوت دینے کے لئے پہنچے تو اس نے کہا "وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ" کہ یہ تو اپنی بات اچھی طرح ظاہر نہیں کر پاتے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لکنت باقی تھی، پس ان دونوں آیتوں کا پہلی آیت سے بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں جو تجزیہ کے بعد تین ہو جاتے ہیں:

❶ لکنت تو بالکلیہ زائل ہوگئی تھی جیسا کہ آیت نمبر ا سے معلوم ہوتا ہے، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر حضرات اسی کے قائل ہیں، البتہ آیت نمبر ۲ میں جو حضرت ہارون علیہ السلام کا افصح لسانًا ہونا مذکور ہے اس کے دو جواب ہیں:

پہلا جواب حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت حضرت ہارون علیہ السلام کو وزیر و معین بنانے کی درخواست کر رہے تھے اس وقت تو لکنت موجود تھی، اس لئے حضرت ہارون علیہ السلام کو افصح منی لسانا فرمایا: بعد میں حق تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور لکنت کو بالکلیہ زائل فرما دیا۔ پس اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں بعد میں بھی لکنت باقی رہی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قبولیت دعا کے بعد افصح

اللسان فرمایا تو حضرت ہارون علیہ السلام کے افصح لسانا ہونے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فصاحتِ لسانی کی نفی نہیں ہوتی، حضرت موسیٰ علیہ السلام فصیح اللسان تھے اور فصیح اللسان اس شخص کو کہتے ہیں جس کی زبان میں لکنت نہ ہو جیسا کہ ابن ہلال نے کتاب الصناعتین میں تصریح کی ہے "الفصاحة تمام آلة البيان" کہ فصاحت آلۂ بیان یعنی زبان کے مکمل ہونے کو کہتے ہیں، جس کی زبان میں نقص ہو اس کو فصیح نہیں کہا جاتا، اسی وجہ سے اَلْثَغْ (ہکلے شخص) اور تَمْتَام (جلدی جلدی بولنے والے شخص) کو فصیح نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ لوگ حروف کی ادائیگی پر اچھی طرح قادر نہیں ہوتے۔ بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام فصیح تھے، زبان میں لکنت بالکل نہیں تھی البتہ حضرت ہارون علیہ السلام افصح تھے اور تیسری آیت "وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ" کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حجت و دلیل مکمل پیش نہیں کر پاتے، فرعون لعین نے یہ بات تمویہاً کہی تھی تاکہ لوگوں کا میلان حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف نہ ہو پائے ورنہ تو وہ جانتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوی الحجۃ والدلیل ہیں، پس اس آیت سے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا صاحبِ لکنت ہونا ثابت نہیں ہوتا لہٰذا ان آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ (روح المعانی و مدارک)

❷ لکنت بالکلیہ زائل نہیں ہوئی تھی جیسا کہ اخیر کی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے، امام جبائی رحمۃ اللہ علیہ اسی کے قائل ہیں اور پہلی آیت کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوری لکنت کے زوال کی دعا نہیں کی تھی بلکہ دعا کا مقصد یہ تھا کہ اے رب! میری زبان کی اتنی لکنت دور کردے جس سے لوگ میری بات سمجھنے لگیں، اسی لئے عقدة نکرہ اور من لسانی میں من تبعیضیہ کا استعمال کیا کہ میری زبان کی تھوڑی سی لکنت دور کردے، اسی دعا کو حق تعالیٰ نے قبول فرمالیا اور کچھ لکنت دور فرمادی تھی جس سے لوگ بات سمجھ جاتے تھے، اگر بالکلیہ زوال کی دعا ہوتی تو وَاحْلُلْ عُقْدَةَ لِسَانِيْ اضافت کے ساتھ کہا جاتا، پس یہ آیت اخیر کی دونوں آیتوں کے

معارض نہیں ہے۔

مگر اکثر حضرات چونکہ بالکلیہ زوال کے قائل ہیں اس لئے انہوں نے عقدة کے نکرہ اور من کے استعمال کا جواب یہ دیا ہے کہ عقدة کو نکرہ تو اس لئے استعمال کیا کہ لکنت فی نفسہا قلیل تھی، زیادہ نہیں تھی اور من فی کے معنی میں ہے یعنی وَاحْلُلْ عُقْدَةً فِيْ لِسَانِيْ ''میری زبان میں جو یہ تھوڑی سی لکنت ہے اس کو دور کردے'' حق تعالیٰ نے دور فرمادی۔ (روح المعانی)

یہ بظاہر تو دو جواب ہوئے مگر پہلا جواب چونکہ دو جوابوں پر مشتمل ہے اس لئے تجزیہ کے بعد تین جواب ہوجاتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ الصلاۃ والسلام کے لئے مسخر شدہ ہوا تیز تھی یا ہلکی؟

پارۂ نمبر: ۱۷، ۲۳

① ﴿ وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ ﴾

(پارہ: ۱۷ رکوع: ۶ سورۂ انبیاء جلالین ص: ۲۷۵) ✦

② ﴿ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ۱۲ سورۂ ص جلالین ص: ۳۸۳)

تشریحِ تعارض

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے حق تعالیٰ نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، اس ہوا کو آیت اولیٰ میں عاصفة بمعنی تیز چلنی والی کہا گیا ہے اور دوسری آیت میں رخاءً نرم اور ہلکی بتایا گیا ہے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ شدت و رخوت کی جہت مختلف ہے، یہ ہوا مسافت طے کرنے کے اعتبار سے تو عاصفہ یعنی تیز رفتار تھی مگر فی نفسہ خفیف و نرم تھی کہ اس سے راکبین کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی، ورنہ تو تیز آندھی مسافر کے لئے وبال اور مصیبت بن جاتی ہے کہ اس کے کپڑے بھی اڑنے لگتے ہیں، اس کا ساز و سامان بھی منتشر و متفرق ہو جاتا ہے بلکہ

خود اس کے اڑ جانے اور ہلاک ہو جانے کا خطرہ ہو جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہوا ایسی نہیں تھی، تیز رفتار ہونے کے باوجود نہایت اطمینان و استقلال کے ساتھ راکبین کو لے کر چلتی تھی اور تیز رفتاری کا یہ حال تھا کہ زمان قلیل میں مسافت بعیدہ طے کر لیتی تھی، صبح سے زوال تک ایک ماہ کی مسافت اور زوال سے مغرب تک ایک ماہ کی مسافت کا سفر ہو جاتا تھا، اسی کو حق تعالیٰ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے "ولسلیمان الریح غدوھا شھر ورواحھا شھر." حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام صبح صبح دمشق سے روانہ ہوتے اور اصطخر میں جا کر قیلولہ کرتے، دمشق اور اصطخر کے درمیان ایک مہینہ کی مسافت کا فاصلہ ہے، پھر زوال کے بعد اصطخر سے چلتے اور بابل میں رات گزارتے اور ان دونوں مقاموں میں ایک ماہ کی مسافت کا فاصلہ ہے، بہرحال شدت و رخوت کی جہت بدل جانے کی وجہ سے کوئی تعارض نہیں رہا۔ (بیان القرآن و صاوی)

② حضرت سلیمان علیہ السلام کے ارادہ کے اعتبار سے شدید و خفیف ہوتی رہتی تھی، جب حضرت سلیمان علیہ السلام تیز رفتاری کا ارادہ فرماتے تو عاصفہ بن جاتی تھی اور جب ہلکی رفتار چاہتے تو رخاء ہو جاتی تھی جیسے گاڑی کا ڈرائیور جب چاہتا ہے گاڑی کی رفتار تیز کر دیتا ہے، جب چاہتا ہے ہلکی کر دیتا ہے اس لئے کوئی تعارض نہیں ہے۔

(تفسیر خازن و روح المعانی)

③ آمد و رفت کے اعتبار سے شدت و رخوت مختلف ہوتی تھی، جب حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے وطن سے کسی جگہ تشریف لے جاتے تو خفیف ہوتی تھی اور جب وطن کی طرف واپس لوٹتے تو عاصفہ (تیز رفتار) بن جاتی تھی جیسے انسان کی عادت ہوتی ہے کہ جب کسی مقام سے اپنے وطن کی طرف واپس آتا ہے تو تیز رفتار گاڑی سے آتا ہے۔ (روح المعانی)

جیسے ہمارے طلبہ مدارس جب سالانہ تعطیل پر اپنے اپنے وطن جاتے ہیں تو

ایکسپریس بلکہ راجدھانی کا ٹکٹ بنوانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ جلد از جلد گھر پہنچ سکیں اور جب شوال کے مہینہ میں گھروں سے مدرسہ آنا ہوتا ہے تو پسینجر ٹرین سے بھی کام چل جاتا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے بیماری میں صبر کیا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۷، ۲۳

① ﴿وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾

(پارہ: ۱۷ رکوع: ۶ سورۂ انبیاء جلالین ص: ۲۷۶) ✦

② ﴿اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ۱۳ سورۂ ص جلالین ص: ۳۸۳)

تشریحِ تعارض

آیت اولیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی بیماری و مصیبت کا شکوہ کیا، اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ کہ مجھے بہت شدت لاحق ہوگئی ہے، میں پریشان ہوگیا، ہوں اور شکوہ و شکایت کرنا صبر کے منافی ہے، اس سے یہ لازم آیا کہ حضرت ایوب علیہ السلام سے صبر نہ ہوسکا کیونکہ صابر آدمی شکوہ و شکایت نہیں کرتا، اپنے درد و مصیبت کا اظہار نہیں کیا کرتا بلکہ خاموشی اور سکون کے ساتھ اس کو برداشت کرتا رہتا ہے اور دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے حضرت ایوب علیہ السلام کو صابر پایا، وہ بہت اچھے بندے اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے صبر سے کام لیا، کوئی شکوہ و شکایت نہیں کی، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہورہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ الصلاۃ والسلام کا رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ کہنا شکوہ و شکایت نہیں ہے بلکہ یہ تو دعا ہے، اسی لئے حق تعالیٰ نے فرمایا: فاستجبنالہ، استجابت قبولیت دعا کو کہتے ہیں، معلوم ہوا کہ انہوں نے حق تعالیٰ سے دعا کی تھی، اس کو شکوہ و شکایت کہنا غلط ہے۔ شکوہ و شکایت اس کو کہتے ہیں کہ آدمی مخلوق کے سامنے اپنے درد و مصیبت کا اظہار کرتا پھرے، لوگوں کے سامنے ہائے ہائے کرتا پھرے، یہ بے صبری اور گھبراہٹ کی علامت ہوتی ہے، حق تعالیٰ کے سامنے اپنی پریشانی بیان کرنا اور رحم و کرم کی درخواست کرنا بے صبری نہیں کہلاتا، آخر حق تعالیٰ کے سامنے بندہ اپنی پریشانی بیان نہیں کرے گا، اس سے رحم و کرم کی درخواست کرے گا؟ تو اور کون سے دربار میں جا کر اپنی پریشانی کو ظاہر کرے گا، کس سے رحم و کرم کی درخواست کرے گا، وہی تو ایک ایسی بارگاہ ہے جہاں سب کی حاجات پوری ہوتی ہیں اس لئے "رب انی مسنی الضر" کو صبر کے منافی قرار دینا غلط ہے، پس ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

(تفسیر مظہری)

کفار کے معبودان باطلہ ان کے ساتھ جہنم میں حاضر رہیں گے یا ان سے غائب؟

پارہ نمبر: ۱۷، ۲۴، ۲۵، ۲۶

آیات

① ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ ﴾

(پارہ: ۱۷ ارکوع: ۷ سورۃ انبیاء جلالین ص: ۲۷۷) ✦

② ﴿ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا ﴾

(پارہ: ۲۴ رکوع: ۱۳ سورۃ مؤمن (غافر) جلالین: ص ۳۹۵، ۳۹۶)

③ ﴿ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ ﴾

(پارہ: ۲۵ رکوع: ۱ سورۃ حم سجدہ (فصلت) جلالین: ص ۴۰۰)

④ ﴿ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۴ سورۃ احقاف جلالین ص: ۴۱۸)

تشریح تعارض

آیت نمبر ا میں کفار کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم اور تمہارے معبود جہنم کا ایندھن ہیں، تم سب جہنم میں جاؤ گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے معبودان باطلہ کفار کے سامنے ہوں گے، جہنم میں ان کے ساتھ رہیں گے، ان سے غائب اور پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ اور آیت نمبر ۲ میں ارشاد ہے کہ اہل جہنم سے جہنم میں پوچھا جائے گا کہاں ہیں وہ بت جن کو تم اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے؟ تو وہ جواب دیں گے ضَلُّوْا عَنَّا کہ وہ تو ہماری نظروں سے غائب ہیں ہم کو نظر ہی نہیں آرہے ہیں۔

(ضلال کے معنی غیوبت کے ہیں ای غَابُوْا عَنَّا) اسی طرح آیت نمبر ۳ و ۴ میں ضَلَّ عَنْهُمْ اور بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے، پس بظاہر ان آیات میں تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ اختلاف زمان پر محمول ہے، یعنی اولاً تو کفار کے اصنام کو ان کی نظروں سے غائب کر دیا جائے گا، وہ کہیں گے "ضَلُّوْا عَنَّا" پھر ان کو حاضر کر دیا جائے گا اور ان کو ان کے عابدین کے ساتھ جہنم میں داخل کر دیا جائے گا لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔
(تفسیر ابوالسعود، جلالین)

❷ اختلاف مکان پر محمول ہے، جہنم کے مختلف طبقات اور متعدد مواقف ہیں، بعض مواقف وطبقات میں جدا اور غائب رہیں گے اور بعض میں ان کے ساتھ مقترن رہیں گے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (روح المعانی)

❸ غیوبت سے مراد مجازاً عدم نفع ہے، غیر نافع شئے کا وجود و عدم، حضور و غیوبت برابر ہے، پس ضَلُّوْا عَنَّا کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ہمارے معبود جہنم میں ہمارے ساتھ ہیں مگر ان سے ہمیں کوئی نفع نہیں پہنچا، پس حقیقۃً تو یہ بت ان کے ساتھ موجود ہوں گے مگر مجازاً ان سے غائب ہوں گے، پہلی آیت حقیقت اور اخیر کی تین آیات مجاز پر محمول ہیں، فلا تعارض۔ (روح المعانی)

قیامت کے دن آسمانوں کا کیا حال ہوگا؟

پارہ نمبر: ۱۷، ۱۹، ۲۴، ۲۷، ۲۹، ۳۰

① ﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ﴾

(پارہ: ۱۷ رکوع: ۷ سورۂ انبیاء جلالین: ص ۲۷۷)

② ﴿وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهِ﴾ (پارہ: ۲۴ رکوع: ۴ سورۂ زمر جلالین ص: ۳۹۰) ✦

③ ﴿وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا﴾

(پارہ: ۱۹ رکوع: ۱ سورۂ فرقان، جلالین ص: ۳۰۵)

④ ﴿فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۲ سورۂ رحمٰن جلالین: ۴۴۴)

⑤ ﴿فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۵ سورۂ حاقہ جلالین ص: ۴۷۲)

⑥ ﴿فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهِ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُوْلًا﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۱۳ سورۂ مزمل جلالین ص: ۴۷۸)

⑦ ﴿إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۷ سورۂ انفطار جلالین ص: ۴۹۲)

⑧ ﴿إِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۹ سورۂ انشقاق جلالین ص: ۴۹۴) ✦

⑨ ﴿يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۳ سورۂ طور جلالین ص: ۴۳۵) ✦

⑩ ﴿يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ﴾

(پارہ: ۲۹ رکوع: ۷ سورۂ معارج جلالین ص: ۴۷۳) ✦

⑪ ﴿وَإِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۲۱ سورۂ مرسلات جلالین ص: ۴۸۵)

(۱۲) ﴿وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا﴾ (پارہ:۳۰ رکوع:۱ سورۂ نبا، جلالین ص:۴۸۷)

(۱۳) ﴿وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ﴾ (پارہ:۳۰ رکوع:۶ سورۂ تکویر جلالین ص:۴۹۱)

تشریح تعارض

پہلی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن آسمانوں کو لپیٹ دیا جائے گا اور آیت نمبر ۳ تا ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پھٹ جائے گا، انشقاق وانفطار کے معنی پھٹنے کے ہیں اور آیت نمبر ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان قیامت کے دن حرکت کرے گا، تھرتھرائے گا۔ (ماریمورموراً) تھرتھرانا، آگے پیچھے تیزی سے ہلنا، حرکت کرنا) اور آیت نمبر ۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان مُھْل (تیل کی تلچھٹ) کی طرح ہو جائے گا اور آیت نمبر ۱۱ و ۱۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کو کھول دیا جائے گا، اس کے دروازے کھل جائیں گے اور آیت نمبر ۱۳ میں ہے کہ آسمانوں کو کھینچ لیا جائے گا جس طرح بکری کی کھال کھینچ لی جاتی ہے، پھر آیت نمبر ۴ میں کالدھان فرمایا کہ آسمان کا رنگ سرخ چمڑے کی طرح ہو جائے گا، دِھان کے معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ادیم احمر کے بیان کئے ہیں جیسا کہ روح المعانی میں مذکور ہے اور آیت نمبر ۱۰ میں کالمھل فرمایا کہ تیل کی تلچھٹ کی طرح سیاہ ہو جائے گا، اس طرح ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس سلسلہ میں مختلف تفاسیر دیکھنے سے جو تطبیق سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کے روز آسمان پر مختلف احوال وتغیرات طاری ہوں گے، اولاً تو آسمان جہنم (۱) کی حرارت سے سرخ ہو جائے گا یا حق تعالیٰ کے غضب (۲) کے اثر سے سرخ ہوگا

(۱) حاشیہ نمبر کا روح المعانی ج:۲۷ ص:۱۱۴ وابن کثیر ج:۴ ص:۴۴۹

(۲) حاشیہ نمبر بیان القرآن۔

کیونکہ غضب میں چہرہ سرخ ہوجاتا ہے، اس کو فرمایا "فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ" اور شدت حرت سے سواد[1] کے مشابہ رنگ پیدا ہوجاتا ہے اس لئے فرمایا: یوم تکون السماء کالمهل کہ تیل کی تلچھٹ کی طرح سیاہ ہوجائے گا یا یکے بعد دیگرے رنگ بدلے گا جیسا کہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے "تَتَلَوَّنُ اَلْوَانًا" مطلب یہ ہے کہ اولا جہنم کی حرارت سے وہ سرخ ہوگا، پھر حرارت کی شدت سے پگھلے ہوئے تیل کی تلچھٹ کی طرح سیاہ رنگ ہوجائے گا۔

بہر حال اولاً آسمان سرخ و سیاہ ہوگا، اس کے بعد حرکت کرے گا، تھرتھرائے گا جس کو فرمایا "يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءِ مَوْرًا" اس کے بعد پھٹ جائے گا، اس کو فرمایا: "اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ، اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ" وغیرہ اور آسمانوں کا پھٹنا ان کو فنا کرنے[2] کے لئے ہوگا، یعنی آسمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے فنا کردیا جائے گا، پہلی دو آیتوں میں آسمان کو لپیٹنے سے مراد بھی فنا کرنا ہی ہے۔ حضرت حسن[3] سے طی کی تفسیر افناء وازالہ کے ساتھ منقول ہے، محاورہ میں کہا جاتا ہے اطوعنی هذا الحدیث "مجھ سے اس بات کو لپیٹ دے" یعنی بات ختم کردے۔ یہ سب کچھ نفخۂ اولی کے وقت ہوگا، اس کے بعد تمام آسمانوں اور زمینوں کو پھر[4] درست کردیا جائے گا، اس کے بعد آسمان کو کھول دیا جائے گا جیسے پردہ ہٹا دیا جاتا ہے اس کو فرمایا وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ اور فُتِحَتِ السَّمَآءُ اور اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ کہ جس طرح بکری کی کھال اتاری جاتی ہے، اندر کا گوشت وغیرہ نظر آجاتا ہے اسی طرح آسمان کو کھول دیا جائے گا، اس سے اوپر کی اشیاء نظر آنے لگیں گی۔

(۱) حاشیہ نمبر بیان القرآن۔

(۲) حاشیہ نمبر بیان القرآن پارہ:۱۹

(۳) روح المعانی ج:۷ اص:۹۹

(۴) بیان القرآن پارہ:۱۹

اس سے ملائکہ کا نزول ہوگا، پھر غمام یعنی سفید بادل نازل ہوگا جس میں حق تعالیٰ کی تجلی ہوگی جس کو آیت نمبر ۳ "يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا" میں بیان کیا گیا ہے، اس آیت میں تشقق سے مراد کھلنا ہے، ٹکڑے ٹکڑے ہونا مراد نہیں ہے، اس تقریر کے بعد تمام آیات میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ طی سموات اور کالدھان کی اور بھی تفسیریں کی گئی ہیں مگر تمام تفاسیر کا احاطہ کرنا ہمارے موضوع سخن سے خارج ہے۔ فاخذنا منها مايفيدنا لدفع التعارض وحصول التطبيق۔ واللہ اعلم

زلزلۂ قیامت کے وقت لوگوں پر نشہ طاری ہوگا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۷

(۱) ﴿وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَىٰ وَمَا هُم بِسُكَارَىٰ﴾

(پارہ: ۱۷ ارکوع: ۸ سورۂ حج جلالین ص: ۲۷۸)

تشریح تعارض

اس آیت میں ارشاد ہے کہ جب قیامت کے دن زلزلہ آئے گا تو لوگوں کو تو اس وقت نشہ کی حالت میں دیکھے گا اور وہ نشہ کی حالت میں نہیں ہوں گے۔ پس اس آیت کے جزءاول میں سکر (نشہ) کا اثبات اور جزء ثانی میں سکر کی نفی ہے، پس آیت کے جزءاول اور جزء ثانی میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اثبات ونفی کی جہت مختلف ہے سکر کا اثبات علی سبیل التشبیہ ہے اور نفی علی سبیل الحقیقہ ہے، یعنی لوگوں پر اللہ کے عذاب کی دہشت اس قدر طاری ہوگی کہ ان کے ہوش اڑ جائیں گے، عقلیں خراب ہوجائیں گی، ایسا محسوس ہوگا کہ ان پر نشہ طاری ہوگیا ہے حالانکہ وہ لوگ کسی مسکر (نشہ آور) چیز شراب وغیرہ کے پینے کی وجہ سے حقیقۃً نشہ میں نہیں ہوں گے، حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے "تری الناس بسکاری من الخوف وماھم بسکاری من الشراب" اور اختلاف جہت کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (تفسیر مدارک وخازن)

قیامت کے دن کی مقدار ایک ہزار سال ہے یا پچاس ہزار سال؟

پارہ نمبر: ۱۷، ۲۱، ۲۹

① ﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾

(پارہ: ۱۷ رکوع: ۱۳ سورۂ حج جلالین ص: ۲۸۳)

② ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ (پارہ: ۲۱ رکوع: ۱۴ سورۂ سجدہ جلالین ص: ۳۴۹)

③ ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (پارہ: ۲۹ رکوع: ۷ سورۂ معارج جلالین ص: ۴۷۳)

تشریح تعارض

آیت نمبر ا و ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا دن ایک ہزار سال کا ہوگا اور آیت نمبر ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم قیامت کی مقدار پچاس ہزار سال ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے چار جوابات ہیں:

① اختلاف اشخاص پر محمول ہے، یعنی کفر و معاصی اور اعمال کے شدت و ضعف اور قلت و کثرت کے اعتبار سے وہ دن طول و قصر اور شدت و خفت میں مختلف ہوگا، کفار

میں سے جو لوگ بڑے مجرم ہوں گے ان کو پچاس ہزار سال کا اور اس سے کم درجہ کے مجرمین کو ایک ہزار سال کا محسوس ہوگا، حتیٰ کہ مؤمنین کو یہ دن نہایت مختصر اور خفیف محسوس ہوگا، پھر مؤمنین کے حق میں بھی مختلف ہوگا، بعض کو تو جتنے وقت میں ایک فرض نماز ادا کی جاتی ہے اس سے بھی کم اور خفیف معلوم ہوگا جیسا کہ حدیث میں وارد ہے:

﴿عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ مَا اَطْوَلُ ھٰذَا الْیَوْمِ؟ فَقَالَ: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنَّہٗ لَیُخَفَّفُ عَلَی الْمُؤْمِنِ حَتّٰی یَکُوْنَ اَھْوَنَ مِنَ الصَّلٰوۃِ الْمَکْتُوْبَۃِ یُصَلِّیْھَا فِی الدُّنْیَا.﴾

(رواہ احمد وابن حبان وابویعلی وابن جریر والبیہقی، روح المعانی وتفسیر مظہری)

ترجمہ: ’’حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دن کے متعلق سوال کیا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی کہ یہ کس قدر طویل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہ دن مؤمن پر ہلکا ہوگا یہاں تک کہ (جتنے وقت میں) آدمی دنیا میں ایک فرض نماز پڑھتا ہے اس سے بھی زیادہ ہلکا اور آسان ہوگا۔‘‘

اور بعض کو مابین الظہر والعصر کے بقدر محسوس ہوگا جیسا کہ ایک حدیث میں ہے۔

﴿عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ مَرْفُوْعًا وَمَوْقُوْفًا: یَکُوْنُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کَمِقْدَارِ مَابَیْنَ الظُّھْرِ وَالْعَصْرِ.﴾

(اخرجہ الحاکم والبیہقی، مظہری)

ترجمہ: ’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعا وموقوفا روایت ہے

کہ وہ دن مؤمنین پر اتنا ہوگا جتنا وقت ظہر وعصر کے درمیان ہوتا ہے۔"

بہر حال یہ تفاوت اختلاف اشخاص پر محمول ہے، **ولا تعارض بعد اختلاف الاشخاص۔**" (مظہری وروح المعانی وغیرہ)

❷ اختلاف مکان پر محمول ہے کہ جس طرح دنیا میں بعض علاقوں میں دن بڑا اور بعض مقامات میں چھوٹا ہوتا ہے، اختلاف آفاق سے تفاوت ہوتا رہتا ہے، اسی طرح قیامت کا دن میدان محشر کے بعض حصوں میں طویل یعنی پچاس ہزار سال کا اور بعض مقامات میں ایک ہزار سال کا ہوگا، آیات میں اقل واکثر کو بیان کر دیا گیا، درمیان کے تفاوت کو اسی پر قیاس کرتے ہوئے سمجھ لیا جائے۔ (بیان القرآن)

❸ یوم آخرت ایام کثیرہ پر مشتمل ہوگا، ان ایام میں کوئی دن پچاس ہزار سال کا اور کوئی ایک ہزار سال کا ہوگا لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (حاشیہ جلالین)

❹ ان آیات میں یوم سے مراد یوم قیامت نہیں ہے بلکہ آیت نمبر ا میں تو مطلق یوم عذاب مراد ہے کہ آخرت میں عذاب جہنم کے ایام میں سے ایک ایک دن اہل جہنم کو شدید وطویل محسوس ہوگا، ایک ایک دن کو وہ لوگ ایسا سمجھیں گے کہ ایک ہزار سال کا زمانہ گزر گیا ہے کیونکہ ایام راحت مختصر اور ایام مصیبت طویل محسوس ہوا کرتے ہیں۔

(تفسیر روح المعانی)

؎ ایام مصیبت کے کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کے گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں کیسے

اور دوسری آیت میں آسمان سے زمین تک حضرات ملائکہ کی آمد ورفت کا دن مراد ہے، یعنی حضرات ملائکہ کائنات کے انتظامی امور کو لیکر آسمان سے زمین تک تشریف لاتے ہیں، پھر زمین سے آسمانوں پر واپس چلے جاتے ہیں اور یہ آمد ورفت ایک دن میں ہو جاتی ہے ورنہ تو آسمان وزمین کے مابین پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے، اگر فرشتہ کے علاوہ بنی آدم میں کوئی یہ مسافت طے کرنا چاہے تو ایک ہزار

سال کے عرصہ میں طے ہوگی اور تیسری آیت میں زمین سے لے کر سدرۃ المنتہی تک کی مسافت کا بیان ہے، زمین سے سدرۃ المنتہی تک آمد و رفت کا زمانہ پچاس ہزار سال ہے مگر فرشتے ایک دن میں آمد و رفت کر لیتے ہیں، یہ تفسیر حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، تینوں آیات کی مذکورہ تفاسیر پر ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کما لا یخفی۔

(حاشیہ جلالین، تفسیر خازن، روح المعانی)

تمام ملائکہ کو رسول بنایا گیا ہے یا بعض کو؟

پارہ نمبر: ۱۷،۲۲

① ﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا ﴾

(پارہ: ۱۷ رکوع: ۱۷ سورۂ حج جلالین ص: ۲۸۶) ✦

② ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا ﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۱۳ سورۂ فاطر جلالین ص: ۳۶۴)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ ملائکہ میں سے رسولوں کو منتخب کر لیتے ہیں۔ من تبعیضیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ملائکہ کو رسول بنایا گیا ہے، تمام کو نہیں اور دوسری آیت میں من تبعیضیہ نہ ہونے کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام ملائکہ کو رسول بنایا ہے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں رسلا الی بنی آدم مراد ہیں اور دوسری آیت میں ملائکہ کو آپس میں ایک کو دوسرے کی طرف رسول بنانا مراد ہے، یعنی حق تعالیٰ نے انسانوں کی طرف تو بعض ملائکہ کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور وہ اکابر ملائکہ ہیں جیسے حضرت جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل اور حفظہ کرام علیہم السلام اور خود آپس میں تمام ملائکہ کو ایک دوسرے

کی طرف رسول بنایا جاتا ہے کہ ہر ایک فرشتہ دوسرے کو اللہ کا کوئی نہ کوئی پیغام پہنچاتا رہتا ہے۔ فلا تعارض بینہما۔ (تفسیر کبیر وصاوی)

❷ دوسری آیت میں رسلا سے مراد رسلا الی الانبیاء ہے اور ملائکہ سے مراد بعض ملائکہ ہیں، اس لئے کہ انبیاء کی طرف تمام ملائکہ کو رسول بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے، بعض ملائکہ مراد لینے کی صورت میں یہ آیت آیت اولیٰ کے معارض نہیں رہی۔

(جمل علی الجلالین)

قوم عاد پر کون سا عذاب آیا؟

پارہ نمبر: ۱۸، ۲۴، ۲۶، ۲۷، ۲۹

① ﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾
(پارہ: ۱۸ رکوع: ۳ سورۂ مؤمنون جلالین ص: ۲۸۹)

② ﴿فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾
(پارہ: ۲۴ رکوع: ۱۶ سورۂ حم سجدہ (فصلت) جلالین ص: ۳۹۷)

③ ﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ﴾
(پارہ: ۲۴ رکوع: ۱۶ سورۂ حم سجدہ (فصلت) جلالین ص: ۳۹۸)

④ ﴿بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾
(پارہ: ۲۶ رکوع: ۳ سورۂ احقاف جلالین ص: ۴۱۸)

⑤ ﴿وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ﴾
(پارہ: ۲۷ رکوع: ۱ سورۂ ذاریات جلالین ص: ۴۳۴)

⑥ ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ﴾
(پارہ: ۲۷ رکوع: ۸ سورۂ قمر جلالین ص: ۴۴۱)

⑦ ﴿وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ﴾
(پارہ: ۲۹ رکوع: ۵ سورۂ حاقہ جلالین ص: ۴۷۱)

تشریح تعارض

یہ آیات قوم عاد پر آنے والے عذاب سے متعلق ہیں، پہلی آیت کے سیاق و سباق میں اگرچہ قوم عاد کی تصریح نہیں ہے بلکہ صرف "ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا

آخَرِیْن" کہا گیا ہے مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اکثر حضرات نے قرن آخرین کی تفسیر قوم عاد کے ساتھ کی ہے، تائید اس کی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قرن آخرین کا ذکر حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہوا ہے اور سورۂ اعراف، سورۂ ہود، سورۂ شعراء، میں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ہود علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سورۂ مؤمنون میں بھی قرن آخرین کا مصداق حضرت ہود علیہ السلام کی قوم یعنی قوم عاد ہے اور بعد کی چھ آیات میں تو قوم عاد کی تصریح ہے، اس طرح یہ سب آیات قوم عاد سے متعلق ہیں مگر قوم عاد کو جس عذاب سے ہلاک کیا گیا اس کے بیان میں یہ آیات بظاہر متعارض ہیں، چنانچہ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صیحہ یعنی چیخ سے ہلاک کیا گیا اور دوسری آیت میں صاعقۃ یعنی بجلی کا ذکر ہے اور اس کے بعد کی پانچ آیات میں ہے کہ ریح (ہوا اور آندھی) سے ہلاک کیا گیا، کسی آیت میں مطلق ریح اور کسی میں ریح صرصر (تیز آندھی)، کسی میں ریح عقیم (بانجھ ہوا) یعنی خیر و برکت سے خالی ہوا، کسی میں ریح عاتیہ (حد سے تجاوز کرنے والی آندھی) کا ذکر ہے، اس طرح ان آیات میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ اصل عذاب تو آندھی کا آیا تھا مگر اس کو پہلی دو آیتوں میں صیحہ اور صاعقہ سے تعبیر کر دیا گیا اس اعتبار سے کہ صیحہ سے مطلق عقوبت ہالکہ مراد ہے اور صاعقہ کے معنی بھی لغت میں مطلق عذاب کے آتے ہیں جیسا کہ قوم ثمود کے عذاب کے متعلق دفع تعارض کے ذیل میں گزر چکا ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (حاشیہ جلالین)

❷ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی چیخ اور تیز آندھی دونوں سے ہلاک کیا گیا اور صاعقہ بمعنی عذاب ہے۔ فلا تعارض۔ (حاشیہ جلالین)

قیامت کے دن لوگ آپس میں ایک دوسرے سے سوالات کریں گے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۸، ۲۳، ۲۷

① ﴿فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ﴾

(پارہ: ۱۸ رکوع: ٦ سورۂ مؤمنون جلالین ص: ۲۹۳) ✦

② ﴿وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ٦ سورۂ صٰفّٰت جلالین ص: ۳۷۴)

③ ﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ﴾

(پارہ: ۲۳ رکوع: ٦ سورۂ صٰفّٰت جلالین ۳۷۵)

④ ﴿وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۳ سورۂ طور جلالین ص: ۴۳٦)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں تساؤل کی نفی ہے کہ قیامت کے روز لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کوئی سوال نہیں کریں گے اور اخیر کی تین آیات میں تساؤل کا اثبات ہے کہ سوال کریں گے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ اختلاف احوال و امکنہ پر محمول ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ قیامت کے مختلف احوال و متعدد مواضع ہوں گے، بعض مواضع میں لوگوں پر خوف و گھبراہٹ طاری ہوگی، ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوگی، نفسی نفسی کا عالم ہو گا، کوئی شخص کسی دوسرے سے کوئی سوال اور بات چیت نہیں کرے گا پھر دوسرے بعض مواضع میں لوگوں کو کچھ افاقہ ہوگا گھبراہٹ دور ہوگی تو ایک دوسرے سے بات چیت اور سوالات کریں گے، **ولا تعارض بعد اختلاف الاحوال والا مکنۃ۔**

(حاشیہ جلالین)

❷ اختلاف زمان پر محمول ہے کہ نفی تساؤل نفخۂ اولیٰ کے وقت ہے جس وقت زمین پر کوئی باقی نہیں رہے گا اور اثبات نفخۂ ثانیہ میں ہے کہ جب لوگ زندہ ہو کر میدان محشر میں جمع ہوں گے تو آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ تاچھ کریں گے، یہ توجیہ بھی ایک جماعت نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

❸ نفی تساؤل عن الانساب کی ہے اور اثبات دوسری چیزوں کے متعلق تساؤل کا ہے، یعنی یہ کفار قیامت کے دن آپس میں ایک دوسرے سے نسب کے متعلق تو کوئی سوال نہیں کریں گے کہ تو کس خاندان اور کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے اور تو کس قبیلہ سے؟ اس لئے کہ ''انساب'' سے اس دن کوئی نفع نہیں پہنچے گا، البتہ دیگر امور کے متعلق ایک دوسرے سے پوچھ تاچھ کریں گے، پس جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں ہے جس کی نفی ہے، اس کا اثبات نہیں لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

مذکورہ تینوں جوابات پہلی دو آیتوں کے تعارض کے ہیں جو کفار سے متعلق ہیں اور اخیر کی دونوں آیتیں چونکہ اہل جنت سے متعلق ہیں جیسا کہ ان کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے اس لئے پہلی آیت اور ان دونوں آیتوں کا تعارض اختلاف اشخاص کی وجہ سے مرتفع ہو جائے گا کہ کفار تو سوال نہیں کریں گے البتہ اہل جنت سوال کریں گے۔

زوانی سے عفائف کا نکاح حلال ہے یا حرام؟

پارہ نمبر: ۱۸

① ﴿ اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذَالِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

(پارہ: ۱۸ رکوع: ۷ سورۃ نور جلالین ص: ۲۹۴) ✦

② ﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصَّالِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ﴾

(پارہ: ۱۸ رکوع: ۱۰ سورۃ نور جلالین ص: ۲۹۸)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ زانی نہیں نکاح کرتا ہے مگر زانیہ یا مشرکہ سے اور زانیہ سے نہیں نکاح کرتا ہے مگر زانی یا مشرک اور زوانی سے نکاح کرنا مؤمنین پر حرام کر دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک صالح اور عفیف مرد و عورت کا نکاح زانی اور زانیہ سے حرام ہے اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ ایامی [1] (یعنی بے نکاحوں) کا نکاح کرا دو۔ یہ حکم مطلق ہے اس میں زوانی و عفائف کی کوئی قید نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زانی کا عفیفہ سے اور عفیف کا زانیہ سے نکاح درست ہے پس ان دونوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

(۱) ایامی یہ ایم کی جمع ہے بمعنی بے نکاح مرد و عورت، کنوارا کنواری، رانڈ بیوہ۔

❶ پہلی آیت دوسری آیت سے منسوخ ہے، ابتداءً عفائف کا نکاح زوانی سے حرام تھا پھر یہ حرمت منسوخ ہوگئی اور مطلق حکم نازل فرما دیا "وانکحوا الایامی منکم" ولا تعارض بعد النسخ۔ (جلالین وغیرہ)

❷ آیت اولیٰ کا مطلب یہ ہے کہ زوانی عفائف کا کفو نہیں ہے، زوانی سے عفائف کا نکاح درست تو ہو جائے گا مگر غیر کفو میں ہونے کی وجہ سے غیر مناسب رہے گا اور "حُرِّمَ ذَالِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ" میں ذلک سے اشارہ زنا اور شرک کی طرف ہے نہ کہ نکاح زوانی کے طرف۔ مطلب یہ ہے کہ زنا کرنا اور شرک کرنا مؤمنین پر حرام کردیا گیا ہے، پس یہ آیت حرمت نکاح زوانی پر دال ہی نہیں ہے لہٰذا یہ دوسری آیت کے معارض نہیں ہے۔ (الفوز الکبیر)

❸ آیت اولیٰ میں نکاح زوانی کی حرمت سب کے حق میں عام نہیں ہے بلکہ یہ ان فقراء مہاجرین کے لئے مخصوص ہے جنہوں نے مکہ میں رہنے والی مالدار مشرکہ رنڈیوں سے نکاح کرنے کی خواہش کی تھی، حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر ان کے لئے خاص طور سے ان رنڈیوں سے نکاح کرنا حرام کردیا تھا، حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی منقول ہے یہی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، عطاء رحمۃ اللہ علیہ، زہری رحمۃ اللہ علیہ، شعبی رحمۃ اللہ علیہ، اور قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، جب یہ آیت ان کے حق میں مخصوص ہوگئی اور دوسری آیت ان کے علاوہ دیگر تمام لوگوں کے متعلق ہے تو اختلافِ اشخاص کی وجہ سے تعارض نہیں رہا۔ (تفسیر کمالین بحوالہ حاشیہ جلالین)

شیاطین ملائکہ کا کلام سن لیتے ہیں یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۹

① ﴿اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ﴾ (پارہ:۱۹ رکوع:۱۵ سورۂ شعراء جلالین ص:۳۱۶)

② ﴿يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ﴾ (پارہ:۱۹ رکوع ۱۵ سورۂ شعراء جلالین ص ۳۱۶)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت میں اِنَّھم کی ضمیر شیاطین کی طرف راجع ہے، مطلب یہ ہے، کہ یہ شیاطین ملائکہ کا کلام سننے سے محروم کر دیے گئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین ملائکہ کا کلام نہیں سنتے ہیں اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ یہ شیاطین ملائکہ سے سنی ہوئی باتوں کو کاہنوں تک پہنچا دیتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین کلام ملائکہ سنتے ہیں، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

① حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت یا بعثت سے قبل شیاطین آسمانوں تک چلے جاتے تھے اور ملائکہ ان امور و حوادث کے بارے میں جو مستقبل میں رونما ہونے والے ہیں جو کچھ گفتگو آپس میں کرتے ہوتے تھے یہ شیاطین ان کی گفتگو کو سن لیتے

اور اس میں بہت سی باتیں اپنی طرف سے جھوٹ ملا کر کاہنوں کے کانوں میں ڈال دیتے تھے، کاہن لوگ جیسے مسیلمہ کذاب وغیرہ ان امور کے متعلق لوگوں کو خبر دیتے تھے مثلاً فلاں دن بارش آئے گی، زلزلہ آئے گا وغیرہ وغیرہ، ان میں سے بعض باتیں صادق آجاتی تھیں اور بہت سی جھوٹی ثابت ہوتی تھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت یا بعثت کے بعد شیاطین کو آسمان پر جانے اور ملائکہ کا کلام سننے سے روک دیا گیا، جب کوئی شیطان اوپر جاتا ہے تو شہاب ثاقب اس کے مار دیا جاتا ہے جس سے وہ یا تو ہلاک ہوجاتا ہے یا زخمی اور پاگل ہوجاتا ہے، پس دوسری آیت جس میں سماع کا اثبات ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت یا بعثت سے قبل پر محمول ہے اور پہلی آیت جس میں سماع کی نفی ہے وہ آپ کی ولادت یا بعثت کے بعد پر محمول ہے، ولا تعارض بعد اختلاف الزمان۔ (تفسیر جلالین وصاوی)

❷ پہلی آیت میں سمع سے مراد ملائکہ کی پوری گفتگو کو مکمل اچھی طرح اطمینان سے سننا ہے کہ شیاطین ملائکہ کا پورا کلام اچھی طرح اطمینان سے نہیں سن پاتے ہیں اور دوسری آیت میں سمع سے مراد جلدی سے چوری چھپے کسی بات کو اُچکتے ہوئے سن لینا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے سورۂ حجر میں فرمایا "اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ" استراقِ سمع کے معنی چوری چھپے سن لینا اور سورۂ صافات میں ارشاد ہے "اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ" خطف کے معنی جلدی سے اچک لینا، چھین لینا، یعنی یہ شیاطین آسمانوں پر جاتے ہیں تو ان کو شہابِ ثاقب (ستارہ) کے ذریعہ بھگا دیا جاتا ہے، وہ اتنی دیر میں چوری چھپے کچھ گفتگو اچکتے ہوئے سن لیتے ہیں، اسی کو کاہنوں کے کانوں میں ڈال دیتے ہیں۔ پس پہلی آیت میں نفی سماعِ کامل کی ہے اور دوسری آیت میں اثبات سماعِ ناقص کا ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

(تفسیر خازن وغیرہ)

❸ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت اولیٰ میں سماعِ علومِ کلیہ متعلقہ

باصلاح الخلق کی نفی ہے اور دوسری آیت میں اخبارِ جزئیہ غیر متعلقہ بالاصلاح کے ادراک کا اثبات ہے، یعنی یہ شیاطین ان معلومات کلیہ کو سننے سے محجوب ومحروم ہیں جو مخلوق کی اصلاح سے متعلق ہیں، البتہ امور جزئیہ کی خبریں جن کا مخلوق کی اصلاح سے کوئی تعلق نہیں ہے ان کو معلوم ہو جاتی ہیں، جس کی نفی اس کا اثبات نہیں اور جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں، فلا تعارض۔ (بیان القرآن)

حضرت سلیمان علیہ الصلاۃ والسلام پرندوں کی بولی سمجھتے تھے یا غیر پرندوں کی بھی؟

پارہ نمبر: ۱۹

① ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾

(پارہ: ۱۹ رکوع: ۱۷ سورۂ نمل جلالین ص: ۳۱۸) ✦

② ﴿قَالَتْ نَمْلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا﴾

(پارہ: ۱۹ رکوع: ۱۷ سورۂ نمل جلالین ص: ۳۱۸)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولی سکھادی تھی، حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کی بولی سمجھ لیتے تھے اور دوسری آیت میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو چیونٹی کی بات سن کر ہنسی آگئی تھی، جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا عظیم لشکر طائف یا شام میں چیونٹیوں کی وادی پر سے گزرا تو ایک چیونٹی نے جو تمام چیونٹیوں کی ملکہ اور رانی تھی اپنی رعایا کو خطاب کرتے ہوئے متنبہ کیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ.﴾

ترجمہ: ''کہ اے چیونٹیو! تم سب اپنے سوراخوں میں داخل ہو جاؤ حضرت

سلیمان علیہ السلام کا لشکر چلا آ رہا ہے، کہیں سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر لاعلمی کی حالت میں تم کو اپنے پاؤں سے کچل نہ ڈالیں۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کی یہ بات سنی اور اس کی عقل و دانش پر تعجب کرتے ہوئے مسکرانے لگے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام غیر پرندوں کی بولی بھی سمجھ جاتے تھے کیونکہ چیونٹی پرندہ نہیں ہے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے چار جواب ہیں:

❶ یہ چیونٹی ذات جناحین (دو پروں والی) تھی جیسا کہ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے اس اعتبار سے اس کا شمار بھی پرندوں میں ہو جائے گا، بہت سی چیونٹیوں کے پر نکل آتے ہیں جن سے وہ اڑتی ہیں، اب یہ آیت پہلی آیت کے معارض نہیں رہی۔ (روح المعانی)

❷ حضرت سلیمان علیہ السلام اکثر و بیشتر تو پرندوں کی بولی سمجھتے تھے لیکن کبھی کبھی غیر پرندہ کی بولی بھی سمجھ جاتے تھے، پہلی آیت میں غیر پرندہ کی بولی سمجھ جانے کی نفی نہیں ہے، کسی شئے کا اثبات ماعدا کی نفی پر دلالت نہیں کرتا پس **علمنا منطق الطیر** سے یہ لازم نہیں آتا کہ غیر طیر کی بولی کبھی سمجھتے نہیں تھے لہٰذا اس آیت کا آیت اولیٰ سے کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر روح المعانی)

❸ چیونٹی کو حق تعالیٰ نے انسانی گویائی عطا فرما دی تھی اور یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے معجزہ تھا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک گوہ کو حق تعالیٰ نے تکلم عطا فرما دیا تھا، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دی تھی، پس آیت ثانیہ میں یہ مراد نہیں ہے کہ چیونٹی اپنی بولی بول رہی تھی اور حضرت

سلیمان علیہ السلام اس کو سمجھ گئے بلکہ انسانی بولی بولنے کی وجہ سے اس کی بات سمجھ میں آگئی تھی۔ (تفسیر روح المعانی)

۲ حضرت سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کی کوئی آواز نہیں سنی تھی بلکہ حق تعالیٰ نے چیونٹی کی بات کا علم ان کو یا تو بطور الہام کے یا بقول علامہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ فرشتہ کے ذریعہ عطا فرما دیا تھا لہٰذا آیت ثانیہ سے نملہ کی بولی کا سمجھنا لازم نہیں آتا، فلا تعارض بینہما۔ (تفسیر روح المعانی)

نفخۂ اولیٰ کے وقت لوگوں پر گھبراہٹ طاری ہوگی یا موت؟

پارۂ نمبر: ۲۰، ۲۴

آیات

① ﴿وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ﴾
(پارہ: ۲۰ رکوع: ۳ سورۂ نمل جلالین ص: ۳۲۵) ✦

② ﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ﴾
(پارہ: ۲۴ رکوع: ۴ سورۂ زمر جلالین ص: ۳۹۰)

تشریح تعارض

آیت نمبر ا میں ففزع فرمایا: فزع کے معنی خوف اور گھبراہٹ کے آتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخۂ اولیٰ کے وقت تمام مخلوق پر گھبراہٹ اور خوف طاری ہوجائے گا اور دوسری آیت میں فصعق ہے، صعق کے معنی بے ہوشی اور موت کے آتے ہیں، صاحب جلالین نے اس کی تفسیر مات کے ساتھ کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخۂ اولیٰ کے وقت تمام مخلوق پر موت طاری ہوجائے گی، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ ابتداء خوف طاری ہوگا، پھر یہ خوف موت تک مفضی ہوجائے گا اور سب مرجائیں گے، آیت اولیٰ میں اول حالت اور دوسری آیت میں آخرِ حالت کو بیان کیا گیا ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر جلالین)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈالتے وقت ان کی والدہ پر خوف کا اثبات ونفی

پارہ نمبر: ۲۰

① ﴿فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي﴾

(پارہ: ۲۰ رکوع: ۴ سورۂ قصص جلالین ص: ۳۲۶)

تشریح تعارض

اس آیت کے اول وآخر میں بظاہر تعارض ہے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی اور اس زمانہ میں فرعون بنی اسرائیل کے نومولود بچوں کو قتل کرا رہا تھا تو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو خوف ہوا تو حق تعالیٰ نے ان کو الہام کیا کہ تم اس بچہ کو دودھ پلاتی رہو، جب تم کو اس بچہ پر خوف ہو تو اس کو (تابوت میں بند کر کے) دریائے نیل میں ڈال دینا اور خوف وغم نہ کرنا، اس آیت کے حصہ اولیٰ یعنی **فاذا خفت** میں خوف کا اثبات اور دوسرے حصہ میں **ولا تخافی** کہہ کر خوف کی نفی ہے، پس آیت کے اول وآخر میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اثبات قتل کے خوف کا ہے اور نفی غرق کے خوف کی ہے کہ اگر تم کو فرعون کی جانب سے اس بچہ کے قتل کا خوف ہو تو دریائے نیل میں ڈال دینا اور اس کے غرق ہونے کا خوف نہ کرنا، ہم اس کی حفاظت کریں گے لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (جمل علی الجلالین)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو ہدایت دے سکتے ہیں یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۲۰، ۲۱، ۲۵

① ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾

(پارہ: ۲۰ رکوع: ۹ سورۂ قصص جلالین ص: ۳۳۲)

② ﴿ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ﴾

(پارہ: ۲۱ رکوع: ۸ سورۂ روم جلالین ص: ۳۴۵) ✦

③ ﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

(پارہ: ۲۵ رکوع: ۶ سورۂ شوریٰ جلالین ص: ۴۰۵)

تشریحِ تعارض

آیت نمبر ۱ اور ۲ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایت دینے کی نفی کی گئی ہے کہ آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، نیز آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہدایت نہیں دے سکتے اور آیت نمبر ۳ میں ہدایت دینے کا اثبات ہے کہ آپ صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتے ہیں، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفعِ تعارض

ہدایت کے دو معنی آتے ہیں ایک ایصال الی المطلوب، مقصود تک پہنچا دینا جس کو خلق اهتداء (ہدایت پیدا کر دینا) سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسرے ارائۃ

الطریق، صرف راستہ دکھا دینا خواہ مطلوب تک رسائی ہو یا نہ ہو۔ پہلی دو آیتوں میں نفی ہدایت بمعنی اول (خلق اهتداء) کی ہے اور آیت نمبر ۳ میں اثبات ہدایت بالمعنی الثانی (اراء ۃ الطریق) کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کے قلوب میں ہدایت پیدا نہیں کر سکتے، ان کو مطلوب تک نہیں پہنچا سکتے بلکہ آپ تو صرف سیدھا راستہ دکھا سکتے ہیں، ہدایت پیدا کرنا ہمارا کام ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ (تفسیر صاوی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ازواج مطہرہ تسعہ کے علاوہ مزید عورتوں سے نکاح کرنا حلال تھا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۲۲

آیات

① ﴿ يَاۤاَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّاۤ أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِيْ آتَيْتَ أُجُوْرَهُنَّ ﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۳ سورۂ احزاب جلالین ص: ۳۵۶) ✦

② ﴿ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ ﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۳ سورۂ احزاب جلالین ص: ۳۵۶)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ اے نبی! ہم نے آپ کے لئے وہ عورتیں حلال کردی ہیں جن کو ان کے مہر دے کر اپنے نکاح میں لائیں۔ اس میں کوئی تعداد مذکور نہیں ہے کہ کتنی عورتیں حلال ہیں بلکہ جتنی عورتوں سے چاہیں آپ شادی کر سکتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نکاح میں جو نو [1] ازواج مطہرات تھیں ان کے علاوہ اور دیگر عورتوں سے نکاح کرنا بھی آپ کے لئے حلال تھا اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موجودہ نو ازواج مطہرات کے بعد کسی عورت سے نکاح حلال نہیں اور نہ ان میں سے کسی کو طلاق دیکر اس کے بدلہ میں

(۱) حضرت عائشہ بنت ابی بکر الصدیق، حضرت حفصہ بنت عمر، حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابی سفیان، حضرت ام سلمہ ہند ابی امیہ المخزومیہ، حضرت سودہ بنت زمعہ العامریہ، حضرت زینب بنت جحش الاسدیہ، حضرت میمونہ بنت الحارث الہلالیہ، حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب الخیبریہ الہارونیہ، حضرت جویریہ بنت الحارث الخزاعیہ المصطلقیہ رضی اللہ عنہن۔

دوسری عورت سے نکاح کرنا حلال ہے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ ناسخ اور آیت ثانیہ منسوخ ہے ابتداءً آپ کے لئے ازواج مطہرہ تسعہ کے علاوہ کسی عورت سے نکاح حلال نہیں تھا اور نہ تبدیلی حلال تھی، پھر حق تعالیٰ نے یَاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَکَ الخ نازل فرما کر یہ ممانعت منسوخ فرمادی اور جتنی عورتوں سے چاہیں نکاح کرنے کی اجازت دیدی۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، اور امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نسخ ہی کے قائل ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی یہی مروی ہے، البتہ ناسخ کی تعیین میں اختلاف ہے یا تو ناسخ یہی آیت "اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ الخ" ہے یا "تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْھُنَّ وَ تُؤْوِیْٓ اِلَیْکَ مَنْ تَشَآءُ الخ" ہے یعنی "تُطَلِّقُ مَنْ تَشَاءُ مِنْھُنَّ وَتُمْسِكُ مَنْ تَشَاءُ"، یہ تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، قول اخیر کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک روایت صحیحہ سے ہوتی ہے:

عن عائشة رضی الله تعالیٰ عنهاقالت: لم یمت رسول الله صلی الله علیه وسلم حتی احل الله تعالیٰ له ان یتزوج من النساء ما شاء الا ذات محرم لقوله سبحانه: ﴿ترجی من تشاء منهن وتؤوی الیك من تشاء﴾ (رواہ ابوداؤد فی ناسخہ والترمذی وصححہ والنسائی والحاکم وصححہ ایضا وابن المنذر وغیرہم، روح المعانی ۲۲/۶۶)

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ فرماتی ہیں

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس وقت تک نہیں ہوئی یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال کردیا کہ محرم عورتوں کے علاوہ جتنی عورتوں سے چاہیں شادی کرلیں حق تعالیٰ کے ارشاد "تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ الخ" کی وجہ سے۔"

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ناسخ کا منسوخ سے مؤخر ہونا ضروری ہے اور یہاں ناسخ خواہ (اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ) ہو یا (تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ) ہو مقدم ہے منسوخ پر، اس لئے کہ ناسخ کا نزول کے اعتبار سے منسوخ سے مؤخر ہونا ضروری ہے۔ تلاوت کے اعتبار سے ناسخ مقدم ہوسکتا ہے، قرآن پاک میں ترتیب تلاوت کے اعتبار سے اگرچہ ناسخ مقدم ہے مگر نزول کے اعتبار سے مؤخر ہے، بہر حال نسخ کے بعد کوئی تعارض نہیں رہتا۔ (تفسیر مدارک، روح المعانی، الفوز الکبیر)

❷ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ، سے اس کے برعکس بھی مروی ہے کہ ابتداء علی العموم جتنی عورتوں سے چاہیں نکاح کرنا حلال تھا، پھر لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ الخ نازل فرما کر عموم کو منسوخ کردیا گیا کہ ان نو عورتوں کے علاوہ کسی سے نکاح حلال نہیں اور نہ تبدیلی جائز ہے، اس صورت میں پہلی آیت منسوخ اور دوسری آیت ناسخ ہے جو نزول و تلاوت دونوں اعتبار سے مؤخر ہے، بہر حال اس صورت میں بھی نسخ کی وجہ سے تعارض مرتفع ہوگیا۔ (روح المعانی)

❸ آیت نمبر۲ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ کا مطلب بعد الاصناف المذکورۃ ہے یعنی اوپر جو آپ کے لئے عورتوں کی اصناف اربعہ حلال کی ہیں:

① مہر دے کر نکاح کی گئی عورتیں،

② مملوکہ باندیاں،

③ مہاجرات میں بنات اعمام، بنات اخوال، بنات خالات،

④ بغیر مہر کے اپنے کو آپ کے لئے ہبہ کر دینے والی عورتیں۔

ان اصناف اربعہ کے علاوہ اور کسی عورت سے نکاح کرنا آپ کے لئے حلال نہیں مثلاً غیر مہاجرہ، غیر مملوکہ اور بغیر مہر اور بغیر ہبہ کے کوئی عورت آپ کے لئے حلال نہیں ہے، اس تفسیر پر نہ تو یہ آیت منسوخ ہوگی اور نہ پہلی آیت کے معارض ہوگی۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ، ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ، طبری رحمۃ اللہ علیہ، ابوحیان رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے محکم ہونے ہی کے قائل ہیں۔ (تفسیر روح المعانی، حاشیہ جلالین)

قیامت کے دن کفار کی نگاہیں تیز ہوں گی یا ضعیف وسست؟

پارۂ نمبر: ۲۵، ۲۶

آیات

① ﴿وَتَرَاهُمْ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا خَاشِعِينَ مِنَ الذُّلِّ يَنظُرُونَ مِن طَرْفٍ خَفِيٍّ﴾ (پارہ: ۲۵ رکوع: ۶ سورۂ شوریٰ جلالین ص: ۴۰۴) ✦

② ﴿لَقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾ (پارہ: ۲۶ رکوع: ۱۶ سورۂ ق جلالین ص: ۴۳۰)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ آپ کفار کو دیکھیں گے کہ ان کو جہنم کے سامنے لایا جائے گا تو ان کی نگاہیں ذلت کے مارے جھکی ہوئی ہوں گی، وہ جہنم کو ضعیف نگاہوں سے (نظریں چراتے ہوئے) دیکھتے ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں کفار کی نظریں ضعیف اور سست ہوں گی اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ (کافر کو قیامت کے دن حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ) تو دنیا میں اس چیز سے غفلت میں پڑا ہوا تھا، آج ہم نے تیری غفلت کا پردہ دور کر دیا، پس تیری نگاہ آج بڑی تیز ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کفار کی نگاہیں شدید اور تیز ہوں گی، پس دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے کیونکہ شدت اور ضعف متعارض امور میں سے ہیں۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

① آیت ثانیہ میں بصر سے مراد نگاہ نہیں بلکہ علم و معرفت مراد ہے، دلیل اس کی فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَ كَ ہے کیونکہ اس میں پردہ سے مراد نگاہوں کا پردہ نہیں بلکہ غفلت کا پردہ ہے جیسا کہ اس سے قبل لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فرمایا اور غفلت کا پردہ قلب پر ہوتا ہے نہ کہ نگاہوں پر اور قلب محل ہے علم و معرفت کا، جب قلب پر سے غفلت کا پردہ دور کردیا جائے تو علم و معرفت میں شدت اور تیزی آجاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو دنیا میں امور آخرت کی معرفت اور یقین سے عاری تھا، ان امور کا منکر تھا کیونکہ تیرے قلب پر غفلت کا پردہ پڑا ہوا تھا آج ہم نے پردہ ہٹا دیا تو تیرا علم، تیری معرفت آج اس قدر تیز ہوگئی ہے کہ تو ہر شئے کو جان اور پہچان رہا ہے، تجھ کو آج ہر اس چیز کا یقین ہوگیا ہے جس کا تو دنیا میں منکر تھا، پس پہلی آیت میں جو ضعف مذکور ہے وہ ضعف بصری ہے اور دوسری آیت میں شدت و حدت علم اور معرفت کی مراد ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (الاتقان مع التوضیح)

② بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آیت ثانیہ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا میں خطاب کافر کو نہیں ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان امور مذکورہ بالا (نفخہ، بعث وغیرہ) سے غافل تھے، ہم نے آپ پر وحی نازل کر کے اور قرآن کریم کی تعلیم دے کر آپ کے پردہ غفلت کو دور کردیا ہے، پس آج آپ کی نگاہ و بصیرت تیز ہوگئی ہے، آپ ان چیزوں کو دیکھتے ہیں جن کو دوسرے لوگ نہیں دیکھتے، ان چیزوں کو جانتے ہیں جن کو دوسروں کو علم نہیں، اس صورت میں اختلاف اشخاص کی وجہ سے تعارض مرتفع ہوجاتا ہے کیونکہ آیت اولیٰ کفار سے متعلق ہے اور یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے مگر یہ تفسیر سیاق و سباق کے مناسب نہیں ہے اس لئے یہ ساقط الاعتبار ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

اللہ نے شہر مکہ کی قسم کھائی یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۳۰

آیات

① ﴿لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۱۵ سورۂ بلد جلالین ص: ۴۹۹)

② ﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ﴾

(پارہ: ۳۰ رکوع: ۲۰ سورۂ تین جلالین ص: ۵۰۲)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ میں اس شہر مکہ کی قسم نہیں کھاتا ہوں۔ اور دوسری آیت میں حق سبحانہ نے وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ کہہ کر شہر مکہ کی قسم کھائی ہے کیونکہ اس سے پہلے والتین پر واؤ قسمیہ داخل ہے اور اس کے بعد کے تینوں کلمے وَالزَّيْتُوْنِ وَ طُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ اسی پر معطوف ہیں لہٰذا پہلی آیت میں شہر مکہ کی قسم کھانے کی نفی اور دوسری آیت میں اثبات ہے، اس طرح یہ دونوں آیتیں بظاہر متعارض ہیں۔

دفع تعارض

اس تعارض کے تین جواب ہیں:

① لا اقسم میں لا زائدہ ہے، تحسین کلام کے لئے لا کا اضافہ کردیا جاتا ہے اس سے قسم کی نفی نہیں ہوگی، اصل عبارت اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ہے، پس یہ آیت دوسری آیت کے معارض نہیں ہے۔ (جلالین وغیرہ)

② یہ لا نہیں ہے بلکہ لام ہے اصل لَاُقْسِمُ تھا لام کے فتح میں اشباع کر کے اس

کو کھینچ کر پڑھا گیا جس سے الف ظاہر ہوگیا ہے۔ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے لاقسم پڑھا ہے، اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت عثمان صلی اللہ علیہ وسلم کے مصحف شریف میں لاقسم بغیر الف کے لکھا ہے، قاری قنبل کی قرأت بھی یہی ہے۔ پھر یہ لام کیسا ہے اس میں تین احتمال ہیں:

① یہ لامِ ابتداء ہے اور اقسم مبتداء محذوف کی خبر ہے یعنی لَاَنَا اُقْسِمُ۔

② اس کو لام تاکید مانا جائے جو فعل مضارع پر داخل ہے جیسا کہ اِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ، میں لام تاکید فعل مضارع پر داخل ہے۔

③ یہ لام قسم ہے مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ لام قسم کے تحت فعل کو اہل عرب نون تاکید کے ساتھ مؤکد کرتے ہیں، چنانچہ اہل عرب لافعل کذا نہیں کہتے بلکہ لَاَفْعَلَنَّ كَذَا کہا کرتے ہیں اس بناء پر یہاں لاقسمن ہونا چاہئے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی صورت میں نون تاکید کا لانا ضروری و لازمی نہیں ہے بلکہ یہ حکم اکثری ہے، اکثر و بیشتر نون تاکید کا استعمال ہوتا ہے ورنہ تو بغیر نون کے بھی جائز ہے۔ امام واحدی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ سیبویہ اور امام فراء سے اس کا جواز نقل کیا ہے، یہ تفصیل روح المعانی اور تفسیر کبیر میں لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ کے تحت مذکور ہے جس کو ہم نے لَا اُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ کے تحت ذکر کر دیا ہے۔ لِتَوَافُقِ الْجُمْلَتَيْنِ۔

④ لاقسم میں لائے نافیہ نہیں ہے بلکہ اہل عرب تاکید قسم کے لئے لا کا اضافہ کر دیتے ہیں اس سے قسم میں مزید تاکید پیدا ہو جاتی ہے۔[1] وجہ اس کی یہ ہے کہ قسم کسی قابل عظمت شئے کی کھائی جاتی ہے، قسم کھا کر اس شئے کی عظمت اور اس کے احترام کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے، لاأقسم بهذا البلد میں شہر مکہ کی قسم کھا کر اس کی عظمت کو ظاہر کرنا مقصود ہے، اس عظمت و منقبت کو مزید مؤکد کرنے کے لئے لا کا اضافہ کر دیا گیا کہ شہر مکہ کی عظمت فی نفسہٖ اس قدر ظاہر و عیاں اور مشہور و مسلم ہے کہ قسم

(۱) تفسیر کبیر و خازن و روح المعانی وغیرہ۔

کھانے کی ضرورت نہیں ہے مگر میں قسم کھا کر اس کی عظمت کو مزید مؤکد کرتا ہوں یعنی "لاحاجة الی القسم لاثبات عظمة هذا البلد لانه معظم و محترم فی نفسه لکن اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ لتاکید عظمته."

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ لا سے مقصود قسم کی نفی نہیں ہے لہٰذا یہ آیت آیت ثانیہ کے معارض نہیں ہے، کیونکہ دونوں آیتوں میں قسم کا اثبات بلکہ تاکید اور مکہ معظمہ کی عظمت و شرافت کا اظہار مقصود ہے کہ شہر مکہ بہت سی عظمتوں کا حامل ہے، ایک تو وہ فی نفسہٖ معظم و مکرم ہے دوسرے قسم کھانے کی وجہ سے مزید شرافت و عظمت آ گئی، تیسرے یہ کہ اللہ سبحانہ کا سب سے پہلا مشرف و مکرم امن و سلامتی اور برکت و ہدایت والا گھر اسی شہر مکہ میں موجود ہے۔

"قَالَ تَعَالَیٰ: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلْعَالَمِيْنَ فِيْهِ اٰيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ اِبْرَاهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمِناً﴾

چوتھے یہ کہ مدار کائنات، فخر الانبیاء والرسل، نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن و مولد ہے، آفتاب ختم نبوت اسی شہر میں طلوع ہوا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا اکثر حصہ اسی شہر میں گزرا ہے، اسی کو حق تعالیٰ نے آگے فرمایا "وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ، اَیْ حَالٌ، اَیْ نَازِلٌ مُقِيْمٌ بِهٰذَا الْبَلَدِ" کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ میں سکونت پذیر ہونے کی وجہ سے مکہ مکرمہ کی عظمت و مرتبت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے "فتلك مكة مكرمة مباركة لها مناقب وفضائل بعضها فوق بعض، زادها الله تعالیٰ حرمة وشرفًا كل ساعة من الساعات، وصانها عن جميع الشرور و الآفات، ورزقنا حضورها وزيارتها مرة بعد اخرى بالخير والطاعات، آمين يا كاشف الضرات ويا قاضي الحاجات.

بنی اسرائیل نے بقرہ ذبح کیا تھا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱

① ﴿ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴾ (پارہ: ۱ رکوع: ۸ سورۂ بقرہ جلالین: ص ۱۲)

تشریح تعارض

اس آیت کے جزء اول و جزء ثانی میں بظاہر تعارض ہے بایں طور کہ اس سے اوپر بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سے دو بھائیوں نے اپنے ایک چچا زاد بھائی کو قتل کر ڈالا تا کہ اس کے مال کے وارث و مالک بن جائیں اور قتل کر کے اس کی لاش محل کے دروازے پر ڈالدی اور خود ہی دونوں اس کے خون کا بدلہ طلب کرنے کے لئے آ گئے کہ ہمارے چچا زاد بھائی کو کس نے قتل کیا ہے؟ ہمیں اس کے خون کا بدلہ لینا ہے، لوگوں کو قاتل کا کچھ علم نہ تھا، قاتل کا پتہ لگانے کے لئے پریشان تھے اور جھگڑا کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے قاتل کے پتہ لگانے کا ایک طریقہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بذریعہ وحی نازل فرمایا کہ ان لوگوں سے کہو ایک بیل ذبح کر کے اس کو مقتول کے بدن سے مس کردو، یعنی چھوا دو، وہ مقتول زندہ ہو کر بول اٹھے گا اور قاتل کا نام خود بتلا دے گا، اتنی خبر سن کر یہ لوگ اگر کوئی سا بیل بھی ذبح کر دیتے تو کافی ہو جاتا مگر انہوں نے اس طریقہ کو عجیب تصور کرتے ہوئے سوچا کہ اس عجیب کام کے لئے بیل بھی کوئی عجیب و غریب قسم کا لینا پڑے گا جس میں تحقیقِ قاتل کا خاص اثر ہو چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اللہ سے یہ معلوم کر لیجئے کہ اس بیل کے اوصاف کیا ہوں گے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے فرمایا کہ اللہ جواب میں یوں فرماتے ہیں کہ وہ بیل نہ تو بوڑھا ہونا چاہئے اور نہ بچہ، بلکہ ادھیڑ عمر کا ہونا چاہئے اور اس کام کو کر گزرو، زیادہ حجتیں مت نکالنا، بنی اسرائیل بولے اچھا یہ اور معلوم کر لیجئے کہ اس کا رنگ کیسا ہونا چاہئے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ یوں فرماتے ہیں کہ اس کا رنگ تیز زرد ہونا چاہئے جو دیکھنے والوں کو خوش کر دے، بنی اسرائیل کہنے لگے کہ اچھا اس بیل کے اوصاف ذرا اور زیادہ واضح کر کے بتا دیجئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ یوں فرماتے ہیں کہ وہ بیل کوئی زیادہ عجیب وغریب ہونا ضروری نہیں، البتہ عمدہ ہونا چاہئے کہ نہ تو وہ ہل میں چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جائے اور نہ کنویں میں جوڑا گیا ہو کہ اس سے کھیتی کو سیراب کیا جائے۔ بنی اسرائیل بولے اب آپ نے پوری بات صاف بتا دی ہے، چنانچہ انہوں نے اس طرح کا بیل تلاش کیا تو ان کو ایک نوجوان کے پاس مل گیا انہوں نے اس سے اس بیل کی کھال بھر کر سونے کے بدلہ اس کو خریدا اور ذبح کر کے مقتول کے بدن سے چھوا دیا تو مقتول نے زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلا دیا کہ مجھ کو فلاں فلاں نے قتل کیا ہے، نام بتلاتے ہی وہ مقتول مر گیا۔

اس واقعہ کے جاننے کے بعد اب تشریح تعارض سنئے کہ حق تعالیٰ نے اولاً فرمایا: **فَذَبَحُوْهَا** ”کہ بنی اسرائیل نے اس بقرہ کو ذبح کر دیا“ آیت کے اس جزء میں ذبح بقرہ کا اثبات ہے اور آگے فرمایا: **وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ** کہ ”وہ ذبح کرنے کے قریب بھی نہیں ہوئے۔“ کیونکہ کاد افعال مقاربہ میں سے ہے اس کے متعلق نحاۃ کا اختلاف ہے، حق مذہب اس بارے میں یہ ہے جیسا کہ روح المعانی ۱/۲۹۲ پر مصرح ہے کہ کاد نفی اور اثبات دونوں میں دیگر افعال کی طرح ہے کہ اگر کاد مثبت ہو تو اثبات قرب کا فائدہ دیتا ہے اور اگر منفی ہو تو نفی قرب کے لئے مفید ہوتا ہے اور چونکہ آیت شریفہ میں کاد منفی ہے اس لئے نفی قرب کا فائدہ دیگا کہ وہ ذبح کرنے کے قریب نہیں ہوئے، یعنی ذبح کرنا تو درکنار وہ تو ذبح کرنے کے قریب بھی نہیں گئے

اس سے ذبح کرنے کی نفی معلوم ہوتی ہے پس فَذَبَحُوْهَا میں ذبح کا اثبات اور وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ میں ذبح کی نفی ہے اور نفی و اثبات میں تعارض و تناقض ہے، پس آیت کا جزءاول جزء ثانی کے بظاہر معارض ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ یہ نفی اور اثبات اختلاف اوقات پر محمول ہے، مطلب یہ ہے کہ اولا تو وہ ذبح کرنے کے قریب بھی نہیں تھے، طرح طرح کی حجتیں اور بہانے کر رہے تھے گویا کہہ رہے تھے کہ ہم کیسے ذبح کر دیں ہمیں تو معلوم ہی نہیں ہوا کہ کس رنگ کا بقرہ ہونا چاہیے؟ کیا کیا اس کے اوصاف ہونے چاہئیں؟ (مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی طرح یہ فرمادیں کہ بس رہنے دو، زیادہ پریشان کیوں ہوتے ہو ہم بغیر ذبح بقرہ کے ہی تم کو قاتل کی خبر دیدیں گے، یا مقصد یہ تھا کہ بقرہ میں زیادہ قیودات لگنے کی وجہ سے اس خاص قسم کا بقرہ کہیں مل نہیں پائے گا تو ہم کہہ دیں گے کہ اس قسم کا بقرہ تو مل نہیں رہا ہے تو اللہ ہم کو بغیر بقرہ کے قاتل کی خبر دیدیں گے۔) لیکن جب اللہ نے تمام اوصاف صاف صاف بیان فرمادیئے اور ان کی حجتیں اور بہانے سب ختم ہو گئے اور تلاش کرنے سے اس قسم کا بقرہ مل بھی گیا تو پھر تو ان کو ذبح کرنا ہی پڑا، پس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ''فَذَبَحُوْهَا فِي الزَّمَانِ الثَّانِيْ وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ فِي الزَّمَانِ الْاَوَّلِ'' اور اختلاف ازمان و اوقات کے بعد تعارض نہیں رہتا کیونکہ تعارض کے لئے اتحاد زمان شرط ہے۔ (روح المعانی ۱/۲۹۲ و بیان القرآن: ۳۹ و ۴۰ پارہ: ۱)

❷ نفی اور اثبات اختلاف اعتبارین پر محمول ہے، مطلب یہ ہے کہ ایک اعتبار سے ذبح کرنے کے قریب نہیں تھے، دوسرے اعتبار سے ذبح کر ڈالا۔ اب یا تو یوں کہا جائے کہ رسوائی کے خوف سے ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے کہ نام معلوم ہو جائے گا تو

قاتل کی رسوائی ہوگی یا قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے ذبح کرنے کے قریب نہیں تھے، خریدنا مشکل تھا کیونکہ اس کی قیمت جیسا کہ اوپر مذکور ہوئی اس کی کھال کے بھراؤ کے برابر سونا تھی، پس رسوائی کے خوف یا زیادتی ثمن کے اعتبار سے ذبح کرنے کے قریب نہیں تھے مگر تعمیل حکم کے اعتبار سے انہوں نے ذبح کر ہی دیا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہو ہی رہا ہے تو اب قیمت زیادہ ہو یا کم، رسوائی ہو یا نہ ہو، ذبح کرنا ہی پڑے گا، اور جب نفی اور اثبات دو مختلف اعتباروں پر محمول ہیں تو کوئی تعارض نہیں، اس لئے کہ تعارض کے لئے اتحاد اعتبار شرط ہے۔ (روح المعانی ۱/۲۹۲)

یہود جادو کا اتباع کرنے کی قباحت جانتے تھے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱

① ﴿وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (پارہ: ا رکوع: ۱۲ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۱۶)

تشریحِ تعارض

اس آیت کے جزء اول اور جزء آخر میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے جس کی تشریح یہ ہے کہ یہودی لوگ کتاب اللہ کا اتباع کرنے کے بجائے جادو کا اتباع کرتے تھے، شہر بابل میں ہاروت ماروت نامی دو فرشتے جو اللہ نے لوگوں کی آزمائش کے لئے بھیجے تھے۔ (جن کا قصہ اس سے پہلی آیات میں مجملاً اور کتب تفاسیر میں مفصلاً مذکور ہے) ان سے یہ یہودی لوگ جادو سیکھتے اور اس کا اتباع کرتے تھے اور یہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ جو شخص کتاب اللہ کے بجائے جادو کا اتباع کرے گا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اسی کو آیت کے جزء اول میں ذکر کیا گیا ہے "وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ الخ" کہ یہودی اس بات کو جانتے ہیں کہ جو کتاب اللہ کے عوض جادو کو اختیار کرے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو جادو کے اتباع کرنے کی قباحت اور برائی معلوم تھی اور آیت کے اخیر میں فرمایا: "لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" کاش یہ لوگ جان لیتے، اس جملہ کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ سحر کی قباحت و شناعت جانتے نہیں تھے، کیونکہ کلمۂ "لو" انتفاء

شیء لانتفاء غیرہ (ایک شئے کی نفی دوسری شئے کی نفی کی وجہ سے) کے لئے آتا ہے، پس آیت کے جزءِ اول میں یہود کے قباحت سحر کے علم کا اثبات ہے اور جزءِ ثانی میں اس علم کی نفی ہے، اس لئے آیت کے اول و آخر میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے آٹھ جوابات ہیں:

❶ آیت کے جزءِ اول میں جس علم کا اثبات ہے اس سے مراد غور وفکر کی صلاحیت اور قدرت ہے کہ ان لوگوں کے اندر اس بات کو جاننے اور سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے کہ جو شخص کتاب اللہ کے بجائے جادو کا اتباع کرے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے لیکن صلاحیت علم و تفکر کو تحقق علم سے تعبیر کر دیا گیا ہے صلاحیت کی قوت اور اس کے کمال کی وجہ سے، کیونکہ جب کسی شخص کے اندر کسی وصف کی صلاحیت وقدرت کامل درجہ کی ہوتی ہے تو اس کے اندر اس وصف کے متحقق ہونے کا اعتبار کر لیا جاتا ہے اور اس شخص کو اس وصف کے ساتھ بالفعل موصوف کر دیا جاتا ہے، بہر حال آیت کے جزءِ اول میں صلاحیت علم و تفکر کا اثبات ہے اور جزءِ ثانی میں علم کی نفی سے مراد اس صلاحیت کو استعمال میں نہ لانا اور غور وفکر نہ کرنا مراد ہے، آیت کا مطلب اس وقت یہ ہوگا کہ ان لوگوں میں جادو کی قباحت اور شناعت جاننے اور سمجھنے کی صلاحیت ہے مگر یہ لوگ اس صلاحیت کو عمل میں نہیں لائے اور انہوں نے اس کی قباحت کو جانا اور سمجھا نہیں، کاش یہ لوگ اس بارے میں غور وفکر کر لیتے اور اس کی قباحت جان لیتے۔

پس اثبات صلاحیت علم و تفکر کا ہے اور نفی استعمال علم و تفکر کی ہے، یا یوں کہا جائے کہ اثبات علم بالقوۃ کا ہے اور نفی علم بالفعل کی ہے جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں ہے۔ فلا تعارض بینھما۔

(شیخ زادہ ۱/۶۷۔ ۳، روح المعانی ۱/۳۴۶ بزیادۃ توضیح وتشریح)

(۲) امام راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جزءِ اول میں اثبات علم اجمالی کا ہے اور جزءِ ثانی میں نفی علم تفصیلی کی ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اجمالی طور پر تو جانتے تھے کہ جادو کا اتباع کرنا قبیح اور مذموم چیز ہے مگر انہوں نے یہ نہیں جانا کہ جس کام کو ہم کر رہے ہیں وہ بھی منجملہ اسی قبیح کے ہے، بسا اوقات انسان ایک شئے کی قباحت کو اجمالی طور پر جانتا ہے مگر تفصیلی طور پر نہیں جانتا کہ اس کی یہ صورت بھی قبیح ہے اور یہ صورت بھی قبیح ہے، پس مثبت علم اجمالی ہوا اور منفی علم تفصیلی ہوا۔ فلا تعارض۔

(روح المعانی ۱/۳۴۶، شیخ زادہ ۱/ ۳۷۷)

(۳) آیت کے جزءِ اول میں جو اثبات ہے وہ سحر کی قباحت اور اس پر عقاب کے مرتب ہونے کا علم ہے اور جزءِ ثانی میں جو نفی ہے وہ حقیقت عقاب اور شدت عقاب کے علم کی ہے مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اتباع سحر پر مرتب ہونے والے عقاب اور سزا کو جانتے ہیں مگر اس عقاب کی حقیقت اور اس کی شدت کو نہیں جانتے، کاش یہ لوگ عذاب کی شدت کو جان لیتے تو ایسا نہ کرتے پس اثبات علم عقاب کا ہے اور نفی علم شدت عقاب وحقیقت عقاب کی ہے۔ فلا تعارض بینہما۔

(شیخ زادہ ۱/ ۳۷۷، روح المعانی ۱/ ۳۴۶)

(۴) صاحب کشاف علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت کے جزءِ اول میں اثبات علم کا ہے اور جزءِ اخیر میں نفی اس علم پر عمل کرنے کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جادو کی قباحت اور اس پر اخروی عقاب کے مرتب ہونے کو جانتے ہیں مگر اس علم پر عمل نہیں کرتے اور جو شخص علم پر عمل نہیں کرتا اس کو جاہل کے درجہ میں اتار لیا جاتا ہے اس کے علم کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے اس لئے جزءِ ثانی میں علم ہی کی نفی کر دی گئی ہے اب "لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" کا مطلب "لَوْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ بِمُوْجَبِ عِلْمِهِمْ" ہے کہ اگر یہ لوگ اپنے علم کے مقتضی پر عمل کر لیتے تو جادو کو اختیار کرنے اور سیکھنے سے احتراز کرتے، بہر حال اثبات علم کا ہے اور نفی عمل کی ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

صاحب روح المعانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک سب سے اولیٰ جواب یہی ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

(کشاف ۱/۸۶، شیخ زادہ ۱/۳۷۷، روح المعانی ۱/۳۴۶، بیان القرآن ۱/۵۷ پارہ:۱)

۵ یہ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، چنانچہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام اخفش رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آیت کے جزء اول میں جاننے والوں سے مراد شیاطین ہیں اور جزء اخیر میں نہ جاننے والوں سے مراد انسان یعنی یہود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شیاطین تو جانتے ہیں کہ جو شخص کتاب اللہ کے بدلہ میں جادو کو اختیار کرے گا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے مگر یہ یہود اس بات کو نہیں جانتے اس لئے یہ لوگ جادو سیکھتے ہیں اور اس کو اختیار کرتے ہیں، کاش یہ لوگ بھی اس کی قباحت و شناعت کو جان لیتے، اس صورت میں وَلَقَدْ عَلِمُوْا کی ضمیر شیاطین کی طرف راجع ہوگی اور شَرَوْا اور یَعْلَمُوْنَ کی ضمیریں انسانوں کی طرف راجع ہوں گی اور جب عالمین اور غیر عالمین کا مصداق علیحدہ علیحدہ اشخاص ہیں تو کوئی تعارض نہیں۔

(قرطبی ۲/۵۶)

۶ امام زجاج رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ علی بن سلیمان رحمہ اللہ تعالیٰ نے یوں کہا ہے کہ میرے نزدیک سب سے عمدہ جواب یہ ہے کہ وَلَقَدْ عَلِمُوْا کی ضمیر مَلَکَیْنِ کی طرف راجع ہے کہ وہ دونوں فرشتے سحر کی قباحت اور اس پر اخروی عقاب کے ترتب کو جانتے تھے، ظاہر بھی یہی ہے، نیز اس بات کو جاننے کو زیادہ لائق و مستحق وہ دونوں فرشتے ہی ہو سکتے ہیں اور مَلَکَیْنِ تثنیہ کی طرف ضمیر جمع کا لوٹانا قابل اشکال نہیں اس لئے کہ تثنیہ کے لئے ضمیر جمع کا استعمال کرنا شائع ہے، کہا جاتا ہے "الزید ان قاموا" اس صورت میں بھی "لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" کی ضمیر یہود کی طرف راجع ہوگی۔

مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ وہ دونوں فرشتے تو سحر کی قباحت و مذمت کو جانتے

تھے مگر یہود نہیں جانتے تھے اس لئے یہ لوگ سحر کی اتباع کرتے اور اس کو اختیار کرتے تھے، کاش یہ لوگ اس کی قباحت اور مذمت کو جان لیتے، بہر حال اس صورت میں بھی اختلاف اشخاص کی وجہ سے کوئی تعارض نہیں ہوگا۔ (قرطبی ۲/۵۶)

مگر صاحب روح المعانی نے اختلاف ضمائر والی توجیہ کو پسند نہیں کیا ہے، فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بلاضرورت انتشار ضمائر کا ارتکاب لازم آتا ہے اور اس پر کوئی قرینہ واضحہ بھی موجود نہیں ہے۔ (روح المعانی ۱/ ۳۴۷)

❼ آیت کے جزء اول میں عَلِمُوْا کا مفعول انه لا نصیب لهم فی الاخرة ہے اور جزء اخیر میں یَعْلَمُوْنَ کا مفعول مذمومية الشراء ہے جو "بِئْسَ مَاشَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ" سے سمجھ میں آرہا ہے، آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ اس بات کو تو جانتے ہیں کہ جو کتاب اللہ کے بدلہ میں جادو کو اختیار کرے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے مگر یہ لوگ کتاب اللہ کے بدلہ میں جادو اختیار کرنے کی مذمت اور قباحت کو نہیں جانتے بلکہ اپنے اعتقاد میں یہ لوگ اس چیز کو مباح سمجھتے ہیں، پس علم مثبت اور علم منفی کے مفعول علیحدہ علیحدہ ہونے کی وجہ سے کوئی تعارض نہیں کیونکہ جس چیز کے علم کا اثبات ہے اس کے علم کی نفی نہیں ہے اور جس چیز کے علم کی نفی ہے اس کے علم کا اثبات نہیں۔

مگر یہ جواب درست نہیں ہے کیونکہ جب یہ لوگ جادو کو مذموم اور قبیح نہیں جانتے تھے تو پھر آخرت میں اس کے موجب حرمان ہونے کے قائل کیسے ہوسکتے تھے؟ یہ بات تو عقل کے خلاف ہے کہ ایک شخص کسی فعل کے مذموم اور قبیح ہونے کو نہیں جانتا بلکہ اس کو مباح اور جائز وحسن سمجھتا ہے اس کے باوجود اس کا اعتقاد یہ ہو کہ آخرت میں اس فعل پر عقاب ہوگا اور یہ فعل آخرت میں ثواب سے محرومی کا باعث ہوگا۔ (روح المعانی ۱/ ۳۴۶ و ۳۴۷)

❽ آیت کے جزء اول میں اثبات مذمومیت فی الآخرة کے علم کا ہے اور جزء ثانی

میں نفی مذمومیت مطلقہ یعنی فی الدنیا والآخرۃ کی ہے، مطلب یہ ہوگا کہ یہود یہ تو جانتے ہیں کہ جادو اختیار کرنا آخرت کے اعتبار سے مذموم اور قبیح ہے مگر یہ نہیں جانتے کہ دنیا و آخرت دونوں ہی اعتبار سے مطلقاً مذموم اور قبیح ہے بلکہ وہ تو اس دھوکہ میں پڑے ہوئے تھے کہ دنیا میں یہ چیز نافع ومفید ہے اور ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ انسان جانتا ہے کہ یہ فعل آخرت میں موجب عقاب ہے مگر دنیاوی نفع کے لالچ میں اس فعل کا ارتکاب کرتا رہتا ہے، اسی طرح یہود دنیاوی نفع کے توہّم پر کتاب اللہ کے بدلہ میں جادو کو اختیار کرتے تھے، کاش وہ لوگ یہ جان لیتے کہ یہ چیز دنیا و آخرت دونوں اعتبار سے مضر و نقصان دہ ہے۔

پس اثبات مذمومیت فی الاخرۃ کے علم کا ہے اور نفی مطلق مذمومیت وقباحت کے علم کی ہے خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اثبات مذمومیت خاصہ کے علم کا ہے اور نفی مذمومیت عامہ کے علم کی ہے، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں، جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ آیت کے جزء ثانی میں مذمومیت کو جو عام کہا گیا ہے کہ خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں، اس عموم کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کلمہ ''بئس'' لایا گیا ہے جو مذمومیت عامہ کے لئے آتا ہے۔

مگر صاحب روح المعانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ بئس سے جو عموم مستفاد ہوتا ہے وہ افراد فاعل کے اعتبار سے ہے نہ کہ زمان و مکان کے اعتبار سے، جب یہ کہا جائے بئس مافعلوا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کام کو کرنے والے سبھی لوگ برے ہیں اور قبیح کا ارتکاب کر رہے ہیں، اس میں اس بات سے کوئی تعرض نہیں ہوتا ہے کہ یہ فعل ہر زمان اور ہر مکان میں قبیح اور مذموم ہے جیسا کہ آپ نے اس کو زمان آخرت و زمان دنیا، یا مکان آخرت و مکان دنیا دونوں اعتبار سے مذمت پر دلالت کرنے والا سمجھ لیا ہے۔ (روح المعانی ۱/۳۴۷)

افعالِ عباد، اللہ کی مشیت سے صادر ہوتے ہیں یا بندوں کی؟

پارہ نمبر: ۲، ۳، ۷، ۸، ۹، ۱۱، ۱۴، ۱۵، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۹، ۳۰

① ﴿يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (پارہ:۲ رکوع:۱ سورۃ بقرہ جلالین ص:۲۱)

② ﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

(پارہ:۲ رکوع:۱۰ سورۃ بقرہ جلالین ص:۳۱)

③ ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (پارہ:۳ رکوع:۵ سورۃ بقرہ جلالین ص:۴۳)

④ ﴿مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

(پارہ:۷ رکوع:۱۰ سورۃ انعام جلالین ص:۱۱۵)

⑤ ﴿مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ﴾

(پارہ:۸ رکوع:۱ سورۃ انعام جلالین ص:۱۲۳)

⑥ ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا﴾ (پارہ:۸ رکوع:۲ سورۃ انعام جلالین ص:۱۲۴)

⑦ ﴿وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾

(پارہ:۹ رکوع:۱ سورۃ اعراف جلالین ص:۱۳۷)

⑧ ﴿تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ﴾

(پارہ:۹ رکوع:۹ سورۃ اعراف جلالین ص:۱۴۲)

(۹) ﴿ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

(پارہ:۱۱ رکوع:۸ سورۂ یونس جلالین ص:۱۷۲)

(۱۰) ﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (پارہ:۱۴ رکوع:۱۹ سورۂ نحل جلالین ص:۲۲۵)

(۱۱) ﴿ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَىْءٍ اِنِّىْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾

(پارہ:۱۵ رکوع:۱۶ سورۂ کہف جلالین ص:۲۴۳)

(۱۲) ﴿ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَآءَ اللّٰهُ ﴾

(پارہ:۱۵ رکوع:۱۷ سورۂ کہف جلالین ص:۲۴۵)

(۱۳) ﴿ سَتَجِدُنِىْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا ﴾ (پارہ:۱۵ رکوع:۲۱ سورۂ کہف جلالین ص:۲۴۹)

(۱۴) ﴿ وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

(پارہ:۱۸ رکوع ۱۲ سورۂ نور جلالین ص:۳۰۰)

(۱۵) ﴿ سَتَجِدُنِىْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾

(پارہ:۲۰ رکوع:۶ سورۂ قصص جلالین ص:۳۲۹)

(۱۶) ﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾

(پارہ:۲۲ رکوع:۱۴ سورۂ فاطر جلالین ص:۳۶۴)

(۱۷) ﴿ سَتَجِدُنِىْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾

(پارہ:۲۳ رکوع:۷ سورۂ صافات جلالین ص:۳۷۷)

(۱۸) ﴿ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾

(پارہ:۲۳ رکوع:۱۷ سورۂ زمر جلالین ص:۳۸۷)

(۱۹) ﴿ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ﴾

(پارہ:۲۵ رکوع:۶ سورۂ شوریٰ جلالین ص:۴۰۵)

(۲۰) ﴿ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴾

(پارہ:۲۶ رکوع:۱۲ سورۂ فتح جلالین ص:۴۲۶)

(۲۱) ﴿كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾

(پارہ:۲۹ رکوع:۱۵ سورۂ مدثر جلالین ص:۴۸۱)

(۲۲) ﴿وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (پارہ:۲۹ رکوع:۱۶ سورۂ مدثر جلالین ص:۴۸۱)

(۲۳) ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (پارہ:۲۹ رکوع:۲۰ سورۂ دہر جلالین ص:۴۸۵)

(۲۴) ﴿يُدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ﴾ (پارہ:۲۹ رکوع:۲۰ سورۂ دہر جلالین ۴۸۵)

(۲۵) ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (پارہ:۳۰ رکوع:۶ سورۂ تکویر جلالین ص ۴۹۲) ✦

(۲۶) ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾

(پارہ:۱۵ رکوع:۱۶ سورۂ کہف جلالین ص:۲۴۴)

(۲۷) ﴿قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾ (پارہ:۱۹ رکوع:۳ سورۂ فرقان جلالین ص:۳۰۷)

(۲۸) ﴿اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ﴾ (پارہ:۲۴ رکوع:۱۹ سورۂ حم سجدہ جلالین ص:۴۰۰)

(۲۹) ﴿فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾ (پارہ:۲۹ رکوع:۱۳ سورۂ مزمل جلالین ص:۴۷۹)

(۳۰) ﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ﴾ (پارہ:۲۹ رکوع:۱۶ سورۂ مدثر جلالین ص ۴۸۱)

(۳۱) ﴿فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ﴾ (پارہ:۲۹ رکوع:۱۶ سورۂ مدثر جلالین ص:۴۸۱)

(۳۲) ﴿فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾ (پارہ:۲۹ رکوع:۲۰ سورۂ دہر جلالین ص:۴۸۵)

(۳۳) ﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ﴾ (پارہ:۳۰ رکوع:۶ سورۂ تکویر جلالین ص:۴۹۲)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۲۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ بندوں کے افعال حق تعالیٰ کی مشیت و ارادہ سے متحقق ہوتے ہیں، بندہ گمراہی پر ہوتا ہے یا ہدایت پر، نیکی کرتا ہے یا برائی اور ان کے علاوہ دیگر افعال جو بھی بندہ کرتا ہے وہ سب اللہ کی مشیت اور اس کو چاہنے سے کرتا ہے بندہ کی مشیت و ارادہ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ ان آیات میں

مشیت کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ مجبور محض ہے اور آیت نمبر ۲۶ تا ۳۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ بندوں کے افعال خود بندوں کی مشیت وارادہ سے صادر ہوتے ہیں کیونکہ ان آیات میں مشیت کی نسبت بندوں کی طرف کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ خود مختار ہے جو چاہے کرے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ افعال عباد، حق تعالیٰ کی مشیت اور بندوں کی مشیت دونوں سے صادر ہوتے ہیں مگر دونوں مشیتوں کی جہت مختلف ہے، اللہ کی مشیت باعتبار خلق کے ہے اور بندہ کی مشیت باعتبار کسب کے ہے، یعنی بندہ اپنے اختیار سے افعال کا کسب کرتا ہے مگر ان افعال کو پیدا کرنے والے حق تعالیٰ ہیں، حق تعالیٰ کی یہ عادت جاری ہے کہ جب بندہ اپنے اختیار سے کسی فعل کا کسب کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس بندہ کے اندر اس فعل کا خلق فرمادیتے ہیں مثلاً بندہ نے اپنے اختیار سے چلنے کا ارادہ کیا تو حق تعالیٰ اس کے اندر چلنا پیدا فرمادیتے ہیں، اسی طرح تمام افعال میں سمجھ لینا چاہیے، پس بندہ کا نہ تو مجبور محض ہونا لازم آیا کیونکہ بندہ کا سب بالاختیار ہے اور نہ خود مختار وقادر ہونا لازم آیا کیونکہ افعال کے خالق حق تعالیٰ ہیں اور مشیتوں کی جہت کسب اور خلق کے اعتبار سے مختلف ہونے کی وجہ سے کوئی تعارض لازم نہیں آتا۔

(شرح عقائد)

حق تعالیٰ قیامت کے دن کفار سے گفتگو کریں گے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۲، ۳، ۴، ۷، ۸، ۱۱، ۱۴، ۱۵، ۱۸، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۵، ۲۶

آیات

① ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾

(پارہ: ۲ رکوع: ۵ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۲۵)

② ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (پارہ: ۳ رکوع: ۱۶ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۵) ✦

③ ﴿وَنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ (پارہ: ۴ رکوع: ۱۰ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۶۶)

④ ﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعاً ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اَيْنَ شُرَكَآءُكُمْ﴾

(پارہ: ۷ رکوع: ۹ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۱۳)

⑤ ﴿وَلَوْ تَرٰى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾

(پارہ: ۷ رکوع: ۹ سورۂ انعام جلالین ص: ۱۱۴)

⑥ ﴿قَالَتْ اُخْرٰهُمْ لِاُوْلٰهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَاباً ضِعْفاً مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ﴾

(پارہ: ۸ رکوع: ۱۱ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۳۲)

⑦ ﴿يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآءُكُمْ﴾ (پارہ: ۱۱ رکوع: ۸ سورۂ یونس جلالین ص: ۱۷۳)

(۸) ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (پارہ:۱۴ رکوع:۶ سورۂ حجر جلالین ص:۲۱۵)

(۹) ﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِ يَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ﴾ (پارہ:۱۴ رکوع:۱۰ سورۂ نحل جلالین ص:۲۱۷)

(۱۰) ﴿وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِ يَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ﴾
(پارہ:۱۵ رکوع:۱۹ سورۂ کہف جلالین ص:۲۴۷)

(۱۱) ﴿قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ﴾ (پارہ:۱۸ رکوع:۶ سورۂ مؤمنون جلالین ص:۲۹۳)

(۱۲) ﴿قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ﴾
(پارہ:۱۸ رکوع:۶ سورۂ مؤمنون جلالین ص:۲۹۳)

(۱۳) ﴿قَالَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾
(پارہ:۱۸ رکوع:۶ سورۂ مؤمنون جلالین ص:۲۹۳)

(۱۴) ﴿حَتّٰى اِذَا جَآءُوْا قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا﴾
(پارہ:۲۰ رکوع:۳ سورۂ نمل جلالین ص:۳۲۴)

(۱۵) ﴿وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ﴾
(پارہ:۲۰ رکوع:۱۰ سورۂ قصص جلالین ص:۳۳۲)

(۱۶) ﴿وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِ يَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ﴾
(پارہ:۲۰ رکوع:۱۰ سورۂ قصص جلالین ص:۳۳۳)

(۱۷) ﴿وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (پارہ:۲۱ رکوع:۲ سورۂ عنکبوت جلالین ۳۳۹)

(۱۸) ﴿وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ﴾
(پارہ:۲۲ رکوع:۱۱ سورۂ سبا جلالین ص:۳۶۳)

(۱۹) ﴿وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِ يْ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ﴾
(پارہ:۲۵ رکوع:۱ سورۂ حم سجدہ جلالین ص:۴۰۰)

(۲۰) ﴿قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾
(پارہ:۲۶ رکوع:۴ سورۂ احقاف جلالین ص:۴۱۹)

(۲۱) ﴿قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ الخ﴾ (پارہ: ۲۶ رکوع: ۱۶ سورۂ ق جلالین ص: ۴۳۰ و ۴۳۱)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ و ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ قیامت کے دن کفار کے ساتھ کلام نہیں فرمائیں گے اور باقی تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام کریں گے کیونکہ ان تمام آیات میں کفار کے ساتھ گفتگو کرنا اور سوال کرنا مذکور ہے جیسا کہ ان کے تراجم سے ظاہر ہے، پس ان آیات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت نمبر ۱ و ۲ میں بقول حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کلام رحمت و شفقت کی نفی ہے کہ حق تعالیٰ قیامت کے دن کفار کے ساتھ شفقت و مہربانی کے طور پر کلام نہیں کریں گے اور باقی تمام آیات میں کلام غضبی کا اثبات ہے کہ ان کے ساتھ گفتگو اور سوال کرنا قہر و غضب کے انداز میں ہوگا، پس جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں اور جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں۔ **فلا تعارض**۔ (روح المعانی ۴۴/۲ و بیان القرآن پارہ: ۲)

❷ یا یوں کہا جائے کہ پہلی دونوں آیتوں میں مطلق کلام ہی کی نفی ہے خواہ کلام رحمت ہو یا کلام غضب، کسی طرح کا بھی کلام نہیں فرمائیں گے مگر یہ نفی کلام بلا واسطہ کی ہے کہ حق تعالیٰ بلا واسطہ اور براہ راست کفار کے ساتھ کلام نہیں کریں گے اور باقی آیات میں اثبات کلام بواسطہ ملائکہ کا ہے کہ حق تعالیٰ ملائکہ کے واسطہ سے کفار سے گفتگو اور سوال فرمائیں گے، پس اثبات کلام بالواسطہ کا ہوا اور نفی کلام بلا واسطہ کی، **فلا تعارض**۔ (تفسیر روح المعانی ۴۴/۲)

زمانہ ماضی میں لوگ متحد فی الدین تھے یا مختلف؟

پارہ نمبر: ۲، ۱۲، ۱۴

آیات

① ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ (پارہ: ۲ رکوع: ۱۰ سورۂ بقرہ جلالین ص: ۳۱)

② ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ﴾ (پارہ: ۱۲ رکوع: ۱۰ سورۂ ہود جلالین ص: ۱۸۹)

③ ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (پارہ: ۱۴ رکوع: ۱۹ سورۂ نحل جلالین ص: ۲۲۵)

تشریح تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ گذشتہ میں سب لوگ ایک ہی دین پر تھے، ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا اور آیت نمبر ۲ و ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں زمانہ ماضی میں اختلاف رہا کیونکہ ان دونوں آیتوں میں کلمہ لَوْ آتا ہے جو تعلیق فی الماضی مع القطع بانتفاء الشرط کے لئے آتا ہے یعنی لو کے ذریعہ زمانہ ماضی میں ایک شئے کو دوسری شئے پر معلق کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شرط کے انتفاء کا یقین ہوتا ہے جو جزاء کے انتفاء کو مستلزم ہوتا ہے جیسے یوں کہا جائے "لوجئتنی لاکرمتك" اگر تو زمانہ گزشتہ میں میرے پاس آتا تو میں تیرا اکرام کرتا مگر تو نہیں آیا پس میں نے تیرا اکرام نہیں کیا۔ اس بنا پر آیت شریفہ کا مطلب یہ ہوگا

کہ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو زمانہ ماضی میں ایک ہی دین پر متحد کر دیتا لیکن اللہ نے نہیں چاہا پس اس نے تم کو متحد بھی نہیں کیا، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ ماضی میں لوگوں میں اختلاف رہا ہے، پس آیت اولیٰ سے زمانہ ماضی میں لوگوں کا متحد ہونا اور اخیر کی دونوں آیتوں سے زمانہ ماضی میں لوگوں کا مختلف ہونا معلوم ہوتا ہے لہٰذا ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

زمانہ ماضی چونکہ طویل اور ممتد ہے اس لئے اس کے دو حصے کر لے جائیں زمانہ ماضی کے جزء اول میں تو سب لوگ ایک ہی دین یعنی دین توحید پر قائم تھے، جب حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام مبعوث ہوئے تو انہوں نے اپنی اولاد کو دین حق کی تعلیم دی تھی، وہ لوگ ایک عرصہ تک دین حق پر قائم اور متحد رہے، پھر جزء ثانی میں رفتہ رفتہ لوگوں کے طبائع مختلف ہوتے گئے اور ان میں اختلاف ہوتا چلا گیا، اتحاد کے بعد جو اختلاف ہوا ہے اس کے متعلق حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اتحاد کے بعد یہ اختلاف ہونے نہ دیتا، بلکہ ہمیشہ لوگ متحد ہی رہتے مگر اللہ نے نہیں چاہا اس لئے اتحاد قائم نہ رہا بلکہ لوگ مختلف ہوگئے اور فرمایا ''وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ'' اور آئندہ بھی لوگ اختلاف کرتے رہیں گے۔ پس آیت اولیٰ میں جو اتحاد مذکور ہے وہ زمانہ ماضی کے جزء اول میں تھا اور آیت ثانیہ وثالثہ میں جو اختلاف مذکور ہے وہ زمانہ ماضی کے جزء ثانی میں ہے اور جب اتحاد و اختلاف کا زمانہ علیحدہ علیحدہ ہے تو کوئی تعارض نہیں، لانہ لا تعارض بعد اختلاف الازمان۔

(بیان القرآن پارہ:۱۲ص:۶۷ مع زیادۃ توضیح)

لوگوں میں اختلاف بعثت انبیاء سے پہلے ہوا یا بعد میں؟

پارہ نمبر:۲

آیت

① ﴿ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ﴾ (پارہ:۲ رکوع:۱۰ سورۂ بقرۃ جلالین ص:۳۱)

تشریح تعارض

آیت کے جزء اول میں ارشاد ہے کہ زمانۂ اول میں سب لوگ ایک ہی طریقہ پر یعنی دین حق پر تھے (کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی اولاد کو دین حق کی تعلیم فرماتے رہے اور وہ ان کی تعلیم پر عمل کرتے رہے، ایک زمانہ اسی حالت میں گزر گیا، پھر بعد میں لوگوں میں اختلاف ہونا شروع ہوا) تو اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا اور ان پر کتاب نازل فرمائی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان امور اختلافیہ میں فیصلہ کر کے اختلاف کو دور کر دیں، پس اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں اختلاف انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی بعثت اور نزول کتاب سے پہلے ہوا اور آیت کے جزء ثانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف بعثت انبیاء اور نزول کتاب کے بعد ہوا کیونکہ اس میں ارشاد ہے کہ اختلاف کرنے والے وہی لوگ تھے جن کو کتاب دی گئی اور انہوں نے اختلاف دلائل واضحہ کے آنے کے بعد کیا، پس آیت کے جزء اول اور جزء ثانی میں بظاہر

تعارض نظر آتا ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ جزء اول میں جو اختلاف مذکور ہے اس سے مراد ان کے اپنے بعض امور میں اختلاف ہے کہ وہ لوگ اپنے اغراض و مقاصد حتی کہ اپنے اعمال وعقائد میں اختلاف کرنے لگے، یہ اختلاف حضرت آدم علیہ السلام کے تشریف لانے کے ایک عرصہ بعد شروع ہوگیا تھا اس وقت تک دیگر انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام مبعوث نہیں ہوئے تھے، یعنی بعثت انبیاء سے قبل ہی یہ اختلاف ہوگیا تھا، اسی اختلاف کو دور کرنے کے لئے انبیاء مبعوث ہوئے اور جزء ثانی میں جو اختلاف مذکور ہے وہ کتاب کے بارے میں اختلاف ہے کہ جب انبیاء مبعوث ہوگئے اور کتاب نازل ہوگئی، دلائل واضحہ آگئے تو لوگوں کو چاہئے تھا کہ اس کتاب کو قبول کرتے اور اس پر مدار رکھ کر اپنے سب اختلافات مٹا دیتے مگر بعضوں نے خود اس کتاب ہی کو نہ مانا اور خود اسی میں اختلاف کر بیٹھے، پس بعثت انبیاء سے قبل والا اختلاف ان کے اپنے امور کے اندر تھا اور بعثت انبیاء کے بعد والا اختلاف کتاب کے بارے میں تھا اور جب دونوں اختلافوں کی نوعیت جدا جدا ہے تو کوئی تعارض نہیں۔

(بیان القرآن، وحاشیہ پارہ:۲ ص:۱۲۰)

حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام بنی اسرائیل کے نبی تھے یا دوسروں کے بھی؟

پارہ نمبر: ۳

① ﴿ وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ﴾ (پارہ: ۳ رکوع: ۱۳ سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۱) ✦

② ﴿ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَاشْہَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: سورۂ آل عمران جلالین ص: ۵۲)

تشریحِ تعارض

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے ہیں اور اخیر کی آیتوں کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حوارین [1] کو بھی دعوت دی ہے اور انہوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا، ایمان لائے اور آپ کی اتباع کی، جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حوارین کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے پس ان آیات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔

(۱) حواریین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص صحابہ تھے جو تعداد میں ۱۲ یا ۲۹ تھے، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں فطرس، یعقوبس، یحنس، اندرانیس، فیلس، ابرنا بوطا، سرجس۔ حوارین حَوَر سے ماخوذ ہے بمعنی بیاض خالص، بقول سعید بن جبیرؒ یہ سفید کپڑے پہنتے تھے اور بقول مقاتل یہ لوگ دھوبی تھے کپڑوں کو دھو کر سفید کرتے تھے۔ اور بقول قتادہ ان کے قلوب صاف اور پاکیزہ تھے اس لئے ان کو حواریین کہا جاتا ہے۔ (الاتقان ۲/۱۸۹، وروح المعانی ۷/۱۷۶)

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

① حوارین بھی بنی اسرائیل میں سے تھے، اس کی تائید ایک روایت سے ہوتی ہے جو روح المعانی میں ج ۷ ص ۵۸ پر موجود ہے جس کو ابو شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے مضمون اس کا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام نے بنی اسرائیل سے کہا تمیں روزے رکھ کر اللہ سے جو درخواست کرو گے قبول ہوگی، انہوں نے روزے رکھ کر نزول مائدہ کی درخواست کی تھی اور قرآن پاک میں مصرح ہے کہ درخواست کرنے والے حوارین تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے "اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ" اس سے معلوم ہوا کہ حوارین بنی اسرائیل میں سے تھے۔ فلا تعارض۔[1]

② اگر حوارین کو بنی اسرائیل میں سے نہ مانا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس نبی کی بعثت عام نہیں ہے اس کے زمانہ میں اس کی قوم کے علاوہ دوسرے لوگوں پر اصول دین میں تو اس نبی کا اتباع ہر حال میں واجب ہے خواہ ان دوسروں کے لئے کوئی نبی مبعوث ہوا ہو یا نہ ہوا ہو کیونکہ تمام انبیاء اصول دین میں متحد ہوتے ہیں اور فروع دین میں تفصیل یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کے لئے دوسرا نبی مبعوث ہو چکا ہے تو وہ اپنے نبی کا اتباع کریں گے ورنہ اسی پہلے نبی کا اتباع کریں گے پس حوارین کی طرف چونکہ کوئی خاص نبی مبعوث نہیں ہوا تھا اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا اتباع ان پر واجب تھا اور اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام نے ان کو دعوت دین فرمائی ورنہ وہ ان کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ فلا تعارض۔[2]

(۱) پارہ:۳ بیان القرآن:۲/ ۲۲:

(۲) پارہ:۳ بیان القرآن ۲/ ۲۲

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل سب کافر تھے یا بعض مؤمن بھی تھے؟

پارہ نمبر: ۳ و ۲۸

① ﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾

(پارہ: ۳ رکوع: ۱۳ سورۃ آل عمران جلالین ص: ۵۲) ✦

② ﴿فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ﴾

(پارہ: ۲۸ رکوع: ۱۰ سورۃ صف جلالین ص: ۴۶۰)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی طرف سے جب کفر محسوس کیا یعنی [1] یہ دیکھا کہ یہ لوگ معجزات کا انکار کر رہے ہیں اور ایذاء رسانی کے درپے ہیں تو کچھ لوگ ایسے ملے جن کو حوارین کہا جاتا تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ کون ہے جو اللہ کے لئے میری مدد کرے؟ انہوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے دین کے مدد کرنے والے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سب کافر تھے صرف حوارین مؤمن تھے اور دوسری آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت مؤمن اور ایک کافر تھی پس ان میں بظاہر تعارض ہے۔

(۱) بیان القرآن میں اس کی یہی تفسیر کی گئی ہے۔

دفعِ تعارض

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حوارییں سے "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ" کہا تھا اس وقت تمام بنی اسرائیل کافر تھے ایذاء رسانی کے درپے تھے مگر اس کے ایک زمانہ بعد بعض ایمان لے آئے اور بعض کافر رہے پس دونوں باتوں کا زمانہ علیحدہ علیحدہ ہے۔ **ولا تعارض بعد اختلاف الازمان۔**

(بیان القرآن وحاشیہ مع زیادۃ تشریح ص:۲۱ ج:۲ پارہ:۳)

دعوت وتبلیغ پوری امت پر واجب ہے یا بعض پر؟

پارہ نمبر: ۴

آیات

① ﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ (پارہ:۴ رکوع:۲ سورۂ آل عمران جلالین ص:۵۷)

② ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ (پارہ:۴ رکوع:۳ سورۂ آل عمران جلالین ص:۵۸)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ کہ تم میں سے بعض لوگوں کی جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتی رہے چونکہ آیت میں "من تبعیضیه" لایا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت وتبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام پوری امت محمدیہ کے ذمہ واجب نہیں بلکہ بعض لوگوں کا اس ذمہ داری کو انجام دے دینا کافی ہے اور دوسری آیت میں پوری[1] امت کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم بہترین امت ہو جس کو لوگوں کے لئے ظاہر کیا گیا ہے تم سب امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے رہو اس آیت میں من تبعیضیه نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امت کے تمام افراد پر تبلیغ ودعوت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کام کو انجام دینا واجب اور ضروری ہے پس دونوں آیتوں میں ظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

(۱) حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بیان القرآن پارہ: ۴/۴۷ میں فرماتے ہیں کہ یہ خطاب تمام امت محمدیہ کو عام ہے جیسا کہ کمالین میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت مرفوعا بسند احمد بن حنبلؒ منقول ہے۔

دفعِ تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت دوسری آیت کے ابہام کی تفسیر ہے کیونکہ دوسری آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر پوری امت پر فرض ہے لیکن فرض کی دو قسمیں ہیں ایک فرض کفایہ ہے دوسرے فرض عین، فرض کفایہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فرض تو سب پر ہے مگر اس فرض کی ادائیگی بعض افراد کے عمل کرنے سے ہو جائے گی، اگر بعض لوگوں نے یہ فریضہ انجام دے دیا تو تمام افراد کے ذمہ سے سقوط ہو جائے گا اور اگر کسی نے بھی یہ کام نہ کیا تو سب کے سب ترک فرض کی وجہ سے گنہگار اور قابل مؤاخذہ ہوں گے، اور فرض عین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص پر مستقلاً فرض ہے جس کی ادائیگی ہر ہر فرد کو مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ کرنی ہوگی، بعض کے ادا کرنے سے سب کے ذمہ سے سقوط نہ ہوگا جیسا کہ صلوٰۃ وصوم وغیرہ احکام فرض عین ہوتے ہیں۔

اب سنئے کہ آیت ثانیہ اس بارے میں مبہم ہے، اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر سب پر فرض عین ہے یا فرض کفایہ ہے۔ آیت اولیٰ میں "وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ الخ" کہہ کر اس ابہام کو دور کر دیا گیا ہے اور بتلا دیا گیا کہ سب پر فرض عین نہیں ہے بلکہ فرض کفایہ ہے، تم میں سے ایک جماعت بھی اگر اس وظیفہ کو انجام دیدے گی تو سب کی طرف سے ادائیگی ہو جائے گی، علماء اہل سنت والجماعت کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔ فرض عین نہیں، علامہ قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اسی کو اصح کہا ہے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو فرض عین کہنے والا صرف فرقہ نزاریہ[1] ہے جو شیعوں کا ایک فرقہ ہے۔ جن

---

(۱) فرقہ نزازیہ شیعوں کے فرقہ امامیہ کے ۳۹ فرقوں میں سے ایک فرقہ ہے جو ابو منصور نزار بن معد عزیز باللہ کی طرف منسوب ہے، اس فرقہ کو صباحیہ، خیریہ، مستقطیہ، سقطیہ بھی کہتے ہیں۔ (تحفہ اثنا عشریہ فارسی ص: ۳۷، ۳۸ مطبوعہ ترکی)

میں سے شیخ ابو جعفر رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہے اس کا مسلک یہی ہے کہ یہ فرض عین ہے بہر حال تقریر مذکور سے معلوم ہو گیا کہ آیت اولیٰ آیت ثانیہ کے ابہام کی تفسیر ہے اور تفسیر بعد الابہام کو تعارض وتناقض نہیں کہا جاتا۔ **فلا تعارض بینهما۔**

(روح المعانی ۴/۲۱، ۲۲ بزیادۃ توضیح)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف نذیر تھے یا بشیر ونذیر؟

پارہ نمبر: ۶، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۶، ۲۹

① ﴿فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيرٌ وَّنَذِيرٌ﴾ (پارہ: ۶ رکوع: ۷ سورۂ مائدہ جلالین ص: ۹۷)

② ﴿اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيرٌ وَّبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾

(پارہ: ۹ رکوع: ۱۳ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۴۶)

③ ﴿اِنَّنِي لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيرٌ وَّبَشِيرٌ﴾ (پارہ: ۱۱ رکوع: ۱۷ سورۂ ہود جلالین ص: ۱۷۹)

④ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا﴾ (پارہ: ۱۵ رکوع: ۱۲ جلالین ص: ۲۳۹)

⑤ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا﴾ (پارہ: ۱۹ رکوع: ۳ سورۂ فرقان جلالین ص: ۳۰۷)

⑥ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۳ سورۂ احزاب جلالین ص: ۳۵۵)

⑦ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا﴾

(پارہ: ۲۲ رکوع: ۹ سورۂ سبا جلالین ص: ۳۶۲)

⑧ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا﴾ (پارہ ۲۲ رکوع: ۱۵ سورۂ فاطر جلالین ص ۳۶۶)

⑨ ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا﴾

(پارہ: ۲۶ رکوع: ۹ سورۂ فتح جلالین ص: ۴۲۳) ✦

⑩ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ (پارہ: ۹ رکوع: ۱۳ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۴۵)

⑪ ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ﴾ (پارہ:۱۲ رکوع:۲ سورۂ ہود جلالین ص:۱۸۰)

⑫ ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (پارہ:۱۳ رکوع:۷ سورۂ رعد جلالین ص:۲۰۱)

⑬ ﴿وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (پارہ:۲۱ رکوع:۱ سورۂ عنکبوت جلالین ص:۳۳۹)

⑭ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴾

(پارہ:۲۲ رکوع ۱۲ سورۂ سبا جلالین ص:۳۶۳)

⑮ ﴿اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ﴾ (پارہ:۲۲ رکوع:۱۵ سورۂ فاطر جلالین ص:۳۶۶)

⑯ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ﴾ (پارہ:۲۳ رکوع:۱۴ سورۂ ص جلالین ص:۳۸۴)

⑰ ﴿اِنْ يُّوْحٰى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (پارہ۲۳ رکوع:۱۴ سورۂ ص جلالین ص۳۸۴)

⑱ ﴿وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (پارہ:۲۶ رکوع:۱ سورۂ احقاف جلالین ص:۴۱۶)

⑲ ﴿قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾

(پارہ:۲۹ رکوع:۲ سورۂ ملک جلالین ص:۴۶۸)

تشریح تعارض

آیت نمبر ۱ تا ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے بشیر و نذیر (جنت اور ثواب کی خوشخبری دینے والا اور جہنم و عذاب سے ڈرانے والا) بنا کر مبعوث فرمایا اور اخیر کی دس آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف نذیر بن کر تشریف لائے، اس لئے کہ ان آیات میں نفی اور استثناء یا کلمہ انما کے ذریعہ نذیر ہونے میں حصر کیا گیا ہے جس سے بشیر کی نفی ہو جاتی ہے پس ان دونوں قسم کی آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ پہلی نو آیتوں میں بشیر و نذیر ہونا کفار و مؤمنین دونوں کے حق میں ہے کہ

مسلمانوں کے لئے آپ بشیر بن کر اور کفار کے لئے نذیر بن کر تشریف لائے اور اخیر کی دس آیتوں میں نذیر کا حصر اور بشیر کی نفی کفار کے حق میں ہے کہ آپ کفار کے حق میں فقط نذیر بن کر مبعوث ہوئے نہ کہ بشیر بن کر اور جب دونوں قسم کی آیتوں کا محمل جدا جدا ہے تو کوئی تعارض نہیں۔ (بیان القرآن ج:۹ص:۹۷ پ:۲۲)

❷ اخیر کی آیات میں حصر کرنے سے بشیر کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ دیگر امور کی نفی مقصود ہے مثلاً آیت نمبر ۱۵ میں آپ کے مسئول عنہ ہونے کی نفی مقصود ہے کہ آپ تو صرف نذیر بن کر تشریف لائے ہیں، آپ سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ یہ کافر لوگ ایمان کیوں نہیں لائے؟ اسی طرح آیت نمبر ۱۹ میں تعیین وقت قیامت کے علم کی نفی مقصود ہے، یعنی میں تو صرف ڈرانے والا ہوں مجھے یہ معلوم نہیں کہ قیامت کب آئے گی، اس کا متعین وقت تو حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ علی ہذا القیاس دیگر آیات میں سے بعض یا سب آیات میں سیاق وسباق پر نظر کر کے امر منفی کو متعین کیا جاسکتا ہے۔

(بیان القرآن ج:۹ص:۹۷ پارہ:۲۲ مع زیادۃ توضیح وتشریح)

کفار دلائل کو دیکھ کر ایمان لائیں گے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۷، ۱۹

آیات

① ﴿وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا﴾ (پارہ: ۷ رکوع: ۹ سورۃ انعام جلالین ص: ۱۱۳)

② ﴿اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ﴾ (پارہ: ۱۹ رکوع: ۵ سورۃ شعراء جلالین ص: ۳۰۹)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ اگر یہ کفار (آپ کی نبوت کے) تمام دلائل کو بھی دیکھ لیں تو ان پر بھی ایمان نہیں لائیں گے اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے ایک بڑی نشانی نازل کر دیں تو ان کی گردنیں اس نشانی کے سامنے پست ہو جائیں (اور یہ لوگ ایمان لے آئیں۔) پس پہلی آیت سے تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ کسی بھی دلیل پر ایمان نہیں لائیں گے اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نشانیوں پر ایمان ضرور لائیں گے، لہٰذا ان دونوں قسم کی آیتوں میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔

دفع تعارض

پہلی آیت میں نفی ایمان اختیاری کی ہے اور دوسری آیت میں اثبات ایمان اضطراری کا ہے، یعنی یہ لوگ تمام دلائل کو دیکھ کر بھی اپنے اختیار سے ایمان نہیں لائیں گے حالانکہ شریعت میں ایمان اختیاری ہی مطلوب ہوتا ہے لیکن اگر ہم چاہیں تو ایسی

نشانی نازل کردیں کہ ان کو اضطراراً اور مجبوراً ایمان لانا پڑے گا مگر ایمان اضطراری شریعت میں معتبر نہیں ہے اس لئے ایسی نشانی نازل نہیں کی جاتی، پس جس چیز کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں اور جس چیز کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں ہے اور ایسی صورت میں کوئی تعارض نہیں ہوتا ہے۔ (بیان القرآن پارہ:۷ ج:۳ ص:۸۶)

حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام سے اکل من الشجرۃ کا صدور عمداً ہو یا نسیاناً؟

پارۂ نمبر: ۸، ۱۶

آیات

① ﴿وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخَالِدِيْنَ﴾ (پارہ: ۸ رکوع: ۹ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۳۰) ✦

② ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾

(پارہ: ۱۶ رکوع: ۱۵ سورۂ طٰہٰ جلالین ص: ۲۶۸)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ہے کہ ابلیس نے اکل من الشجرۃ سے متعلق حق تعالیٰ کی طرف سے کی جانے والی ممانعت اور نہی حضرت آدم علیہ السلام کو یاد دلادی تھی اور اس نہی کی ایک جھوٹی حکمت اپنی جانب سے گھڑ کر بیان کردی تھی، چنانچہ اس نے یہ کہا تھا کہ حق تعالیٰ نے جو تم کو اکل من الشجرۃ سے منع فرمایا ہے وہ صرف اس لئے کہ کہیں تم اس کو کھا کر فرشتہ صفت نہ بن جاؤ یا کہیں تم کو خلود فی الجنۃ نصیب نہ ہو جائے۔ کیونکہ اس درخت کا خاصہ یہ ہے کہ جو اس کا پھل کھالیتا ہے وہ فرشتہ صفت بن جاتا ہے اور ہمیشہ جنت میں رہنا اس کو نصیب ہو جاتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس نہی کے یاد ہوتے ہوئے قصداً وعمداً اس درخت کا پھل کھایا تھا نسیاناً نہیں اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل کا صدور ان سے نسیاناً ہوا تھا عمداً نہیں کیونکہ آیت ثانیہ میں فنسی فرمایا گیا ہے، اس لئے بظاہر

ان دونوں آیتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ جس وقت ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکایا اور نہی یاد دلا کر اپنی طرف سے اس کی حکمت بیان کی اس وقت حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی بات کی بالکل تصدیق نہیں کی اور اس فعل کا قطعاً ارتکاب نہیں کیا کیونکہ اس وقت تو ان کو نہی یاد تھی، اللہ کی طرف سے صریح ممانعت کے ذہن میں ہوتے ہوئے شیطان کے بہکانے سے حضرت آدم علیہ السلام اس فعل کا ارتکاب کیسے کر سکتے تھے؟ ہاں ایک مدت گزر جانے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام اس نہی کو بھول گئے، قطعاً یاد نہیں رہا کہ اللہ نے اکل من الشجرۃ سے منع فرمایا ہے، البتہ شیطان کی وہ بیان کردہ حکمت یاد رہی کہ اس کے کھانے سے آدمی فرشتہ صفت بن جاتا ہے اور ہمیشہ جنت میں رہنا نصیب ہو جاتا ہے تو حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتہ صفت بن جانے اور خلود فی الجنۃ کے شوق میں نسیاناً اس درخت سے تناول فرمالیا، پس تذکر اور نسیان کا زمانہ مختلف ہے، تذکر تو صدور فعل سے بہت پہلے تھا اور نسیان ایک مدت کے بعد صدور فعل کے وقت ہوا۔ ولا تعارض بعد اختلاف الازمنۃ۔

(ملخص من شیخ زادہ ۱/۲۷۸)

انسان و جنات کو عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے یا ترک عبادت کے لئے؟

پارہ نمبر: ۹، ۲۷

آیات

① ﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ﴾

(پارہ: ۹ رکوع: ۱۲ سورۂ اعراف جلالین ص: ۱۴۵) ✦

② ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾

(پارہ: ۲۷ رکوع: ۲ سورۂ ذاریات جلالین ص: ۴۳۴)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ ہم نے بہت سے جن و انسان کو جہنم کے لئے پیدا کیا ہے اور دخول جہنم کا سبب ترک عبادت ہے، پس اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے بہت سوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت نہ کریں اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کو عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، پس دونوں میں بظاہر تعارض ہے۔

دفع تعارض

آیت اولیٰ میں تخلیق کے مقصد تکوینی کا بیان ہے اور آیت ثانیہ میں مقصد تشریعی کا ذکر ہے، یعنی تمام جن وانس کی تخلیق کا تشریعی مقصد تو یہی ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں لیکن ان حکمتوں اور مصلحتوں کی وجہ سے جن کو حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں بہت سے جن وانس کی پیدائش کی تکوینی غایت یہ ہے کہ وہ عبادت نہ کریں اور جہنم میں داخل ہوں پس، جب دونوں مقصدوں کی نوعیت جدا جدا ہے تو کوئی تعارض نہیں۔

(بیان القرآن ۴/۵۴ پارہ: ۹ مع تشریح)

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں نہ جانے کی اجازت طلب کرتے تھے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۰، ۱۸

آیات

① ﴿لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ﴾ (پارہ: ۱۰ رکوع: ۱۳ سورۂ توبہ جلالین ص: ۱۶۰) ✦

② ﴿وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ﴾ (پارہ: ۱۸ رکوع: ۱۵ سورۂ نور جلالین ص: ۳۰۲)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ لوگ اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے کے بارے میں (جہاد میں شریک نہ ہونے کے بارے میں) کبھی آپ سے اجازت طلب نہیں کرتے۔ اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ یہ لوگ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی ایسے کام پر ہوتے ہیں جس کے لئے ان کو جمع کیا گیا ہے (جیسے جہاد، [1] صلوۃ جمعہ، صلوۃ عیدین وغیرہ) تو وہاں سے نہیں جاتے یہاں تک کہ آپ سے اجازت لے لیتے ہیں اجازت لے کر چلے جاتے ہیں، پس آیت اولیٰ میں تو جہاد میں عدم شرکت کی اجازت طلب کرنے کی

(۱) جہاد: ابن زید رحمہ اللہ تعالیٰ نے امر جامع کی تفسیر جہاد کے ساتھ اور ابن جبیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے جہاد، صلوۃ جمعہ اور عیدین کے ساتھ کی ہے۔ (روح المعانی ۸/۲۲۳)

نفی کی گئی ہے اور آیتِ ثانیہ میں اجازت کا اثبات ہے، پس ان دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں جو استیذان کی نفی ہے وہ استیذان بلا عذر ہے اور آیت نمبر۲ میں جو استیذان کا اثبات ہے وہ بالعذر کا ہے، مطلب یہ ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بلا عذر تو کبھی جہاد میں عدم شرکت کی اجازت نہیں لیتے ہیں، البتہ اگر کوئی عذر ہوتا ہے تو اجازت لے کر جہاد وغیرہ کی مجلس سے چلے جاتے ہیں، جس کی نفی ہے اس کا اثبات نہیں، جس کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں۔ فلا تعارض۔

(بیان القرآن ج:۴ ص:۱۱۴ پارہ:۱۰)

❷ پہلی آیت میں جو استیذان کی نفی ہے وہ جہاد میں بالکل نہ جانے کے بارے میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی اجازت کبھی نہیں لیتے تھے کہ ہم جہاد میں بالکل نہ جائیں، اور آیت ثانیہ میں جو استیذان کا اثبات ہے دراصل اس کی صورت یہ ہے کہ جہاد وغیرہ کے لئے مشورہ کی مجلس سے کبھی اتفاقاً کسی ضرورت کی وجہ سے اجازت لے کر چلے جاتے تھے، یہ مطلب نہیں کہ جہاد میں بالکل عدم شرکت کی اجازت لے لیا کرتے تھے، پس استیذان منفی اور استیذان مثبت دونوں کی نوعیت الگ الگ ہے۔ فلا تعارض۔ (بیان القرآن پارہ:۱۸ ج:۸ ص:۳۶)

مشاہدۂ عذاب کے بعد ایمان لانا نافع ہوتا ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۱، ۲۴

آیات

① ﴿ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ ﴾ (پارہ:۱۱ رکوع:۱۵ سورۂ یونس جلالین ص:۸-۱) ✦

② ﴿ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِىْ قَدْ خَلَتْ فِىْ عِبَادِهٖ ﴾ (پارہ:۲۴ رکوع:۱۴ سورۂ مؤمن جلالین ص:۳۹۶)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ عذابِ الٰہی کے مشاہدہ کے بعد ایمان لانا کسی بستی کے لئے نافع نہیں ہوا سوائے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے کہ عذاب کے آثار دیکھ کر وہ لوگ ایمان لائے تھے اور ان کا ایمان معتبر اور نافع ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو مشاہدۂ عذاب کے بعد بھی ایمان لانے سے نفع ہوجاتا ہے اور دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو ان کو ان کا یہ ایمان لانا نافع نہیں ہوا، اللہ نے اپنا یہی معمول مقرر کیا ہے جو اس کے بندوں میں پہلے سے ہوتا چلا آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مشاہدہ عذاب کے بعد ایمان لانا کسی کو بھی نافع نہیں ہوتا، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ پہلی آیت میں جو ایمان کے نافع ہونے کا ذکر ہے وہ عذاب کے آثار ابتدائیہ کے مشاہدہ کرنے کے حالت میں ہے کہ اگر کوئی شخص ملائکہ عذاب و آخرت کی ہولناکی کا مشاہدہ کرنے سے قبل محض عذاب کے آثار ابتدائیہ کو دیکھ کر ایمان لے آئے تو اس کا ایمان معتبر اور نافع ہو جاتا ہے اور دوسری آیت میں جو ایمان کے نافع ہونے کی نفی ہے وہ ملائکہ عذاب اور اہوال آخرت کے مشاہدہ کے بعد ہے کہ ایسی صورت میں ایمان لانا مقبول اور نافع نہیں ہوتا۔ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم عذاب کے ابتدائی آثار کو دیکھ کر ہی ایمان لے آئی تھی اس لئے اس قوم کا ایمان نافع اور معتبر ہوا تھا، پس جب دونوں آیتیں علیحدہ علیحدہ حالت پر محمول ہیں تو کوئی تعارض نہیں۔

(ماخوذ من بیان القرآن ص: ۳۰ و ۳۱ ج: ۵ پارہ: ۱۱)

❷ اللہ تعالیٰ کا قانون تو یہی ہے کہ مشاہدۂ عذاب کے بعد کسی کا ایمان نافع نہیں ہوتا مگر بعض لوگ قانون سے مستثنٰی ہوتے ہیں، حضرت یونس علیہ السلام کی قوم اس قانون سے مستثنٰی اور مخصوص تھی اس لئے ان کا ایمان لانا مشاہدۂ عذاب کے بعد بھی نافع اور معتبر ہو گیا، پس اس چیز کو حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی خصوصیات میں سے شمار کیا جائے گا۔ ولا تعارض بعد الاستثناء والخصوصية۔

(ماخوذ من بیان القرآن ج: ۵ ص: ۳۱ پارہ: ۱۱)

وحی سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کو اقوامِ سابقہ کے واقعات کا علم تھا یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۲، ۱۳

آیات

① ﴿تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا﴾ (پارہ: ۱۲ رکوع: ۴ سورۂ ہود جلالین ص: ۱۸۴)

② ﴿لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (پارہ: ۱۳ رکوع: ۱۴ سورۂ ابراہیم جلالین ص: ۲۰۶) ✦

③ ﴿اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ﴾ (پارہ: ۱۳ رکوع: ۱۴ سورۂ ابراہیم جلالین ص: ۲۰۶)

تشریح تعارض

پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ یہ واقعہ (حضرت نوح علیہ السلام کا جو اوپر مذکور ہوا ہے) غیب کی خبروں میں سے ہے جس کو ہم وحی کے ذریعہ آپ تک پہنچا دیتے ہیں، وحی سے قبل نہ تو آپ کو اس کا علم تھا اور نہ آپ کی قوم کو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل الوحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کی قوم یعنی کفار مکہ کو اقوام سابقہ کے واقعات کا علم نہیں تھا، اسی طرح دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ ان لوگوں کے حالات و واقعات کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اور آپ کی قوم کے لوگ اقوام سابقہ کے واقعات سے بے خبر تھے اور تیسری آیت میں ارشاد ہے کہ کیا تمہارے پاس (اے کفار مکہ) ان لوگوں کو خبر نہیں آئی جو تم سے پہلے گزرے ہیں، یعنی قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان لوگوں کی خبر جو ان کے بعد ہوئے ہیں۔

آیت میں استفہام انکاری ہے جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ اقوام سابقہ کی خبریں تمہارے پاس آئی ہیں، تم کو ان کے واقعات کا علم ہے، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی سے پہلے ہی کفار مکہ اقوام سابقہ کے واقعات کو جانتے تھے، پس یہ آیت پہلی دونوں آیتوں کے بظاہر معارض ہے کہ پہلی دو آیتوں میں علم کی نفی ہے اور تیسری آیت میں علم کا اثبات ہے۔

دفع تعارض

پہلی دو آیتوں میں جو علم کی نفی ہے اس سے مراد علم تفصیلی ہے اور تیسری آیت میں جو اثبات ہے وہ علم اجمالی کا ہے، مطلب یہ ہے کہ اقوام سابقہ کے حالات و واقعات اجمالی طور پر تو تم کو وحی سے قبل بھی معلوم تھے مگر واقعات کی تفصیل وحی سے قبل تم نہیں جانتے تھے۔ تفصیلی واقعات حق تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو وحی کے ذریعہ ان واقعات سے باخبر کیا ہے، پس اثبات علم اجمالی کا ہے اور نفی علم تفصیلی کی، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

(ماخوذ من بیان القرآن ۶/۴ پارہ:۱۳ وامداد الفتاوی ۵/۲۹)

ہر امت کے لئے رسول آیا ہے یا نہیں؟

پارہ نمبر: ۱۴، ۲۰، ۲۱، ۲۲

آیات

① ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوْا اللّٰهَ﴾
(پارہ: ۱۴ رکوع: ۱۱ سورۂ نحل جلالین ص: ۲۱۸)

② ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ﴾
(پارہ: ۲۲ رکوع: ۱۵ سورۂ فاطر جلالین ص: ۳۶۶)

③ ﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ﴾
(پارہ: ۲۰ رکوع: ۸ سورۂ قصص جلالین: ۳۳۱)

④ ﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ﴾
(پارہ: ۲۱ رکوع: ۱۴ سورۂ الم سجدہ جلالین ص: ۳۴۹)

⑤ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِیْرٍ﴾ (پارہ: ۲۲ رکوع: ۱۱ سورۂ سبأ جلالین ص: ۳۶۳)

تشریح تعارض

پہلی دو آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہر امت میں ایک رسول مبعوث فرمایا ہے اور آیت ۳ و ۴ و ۵ میں ارشاد ہے کہ آپ ایسی قوم کو ڈرانے والے ہیں جن میں آپ سے قبل کوئی ڈرانے والا رسول نہیں آیا۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اقوام ایسی بھی ہیں جن میں کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا، پس دونوں قسم کی آیات میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں لفظ کل تکثیر کے لئے ہے، یعنی ہم نے اکثر امتوں میں اپنے رسولوں کو بھیجا ہے، پس بعض اقوام و امم میں رسول کا مبعوث نہ ہونا اس کے معارض نہیں ہے۔ (۱) (بیان القرآن پارہ:۱۴ ج:۶ ص:۴۴)

❷ پہلی دونوں آیتوں سے ہر امت میں رسول کا مبعوث ہونا جو سمجھ میں آرہا ہے وہ اوائل زمانہ کے اعتبار سے ہے اور اخیر کی تین آیات سے جو بعض اقوام میں رسول کا نہ آنا معلوم ہوتا ہے، وہ اواخر کے اعتبار سے ہے یعنی ہر امت کے ابتدائی زمانہ میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور آیا ہے، البتہ بعض اوقات اس کی شریعت کا سلسلہ اخیر تک باقی نہیں رہا جیسے قوم عرب کے ابتدائی دور میں حضرت اسماعیل علیہ السلام مبعوث ہوئے مگر ان کی شریعت عرب میں اخیر تک باقی نہیں رہی یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ (بیان القرآن پارہ:۱۴ ج:۶ ص:۴۵ مع زیادۃ توضیح)

(۱) آیت ثانیہ کو بھی اکثر واغلب پر محمول کرلیا جائے گا۔

جنت کی حوروں کا رنگ سفید مائل بزردی ہے یا سرخ مائل بسفیدی؟

پارہ نمبر: ۲۳، ۲۷

آیات

(۱) ﴿ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾ (پارہ: ۲۳ رکوع: ۶ سورۂ صافات جلالین ص: ۳۷۵) ✦

(۲) ﴿ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۱۳ سورۂ رحمٰن جلالین ص: ۴۴۵)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں جنت کی حوروں کو رنگت اور صفائی نیز شفافیت میں چھپے ہوئے انڈوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح انڈوں کا رنگ سفید مائل بزردی و چمکدار اور پرندے کے پروں میں چھپے ہوئے ہونے کی وجہ سے صاف شفاف ہوتا ہے کہ نہ تو گرد وغبار ان تک پہنچتا ہے اور نہ کسی کا ہاتھ ان پر لگتا ہے جس سے کچھ میلا پن آ جائے ایسے ہی جنت کی حوروں کا رنگ سفید مائل بزردی، چمکدار اور صاف شفاف ہے، بہت زیادہ خالص سفید رنگ کے ساتھ ہلکے زرد رنگ کی ملاوٹ والا رنگ عورتوں میں بڑا مرغوب اور پسندیدۂ نظر ہوتا ہے، بہر حال اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنت کی حوروں کا رنگ سفید مائل بزردی ہے اور آیت ثانیہ میں حوروں کو یاقوت اور مرجان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، یاقوت سرخ رنگ کا قیمتی موتی ہوتا ہے اور مرجان سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے موتیوں کو کہا جاتا ہے، یاقوت و مرجان دونوں کے ساتھ تشبیہ دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ حوروں کا رنگ سرخ و سفید ہے، پس ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں حوروں کا رنگ زرد و سفید اور

دوسری آیت میں سرخ وسفید بتایا گیا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے پانچ جوابات ہیں:

❶ آیت اولیٰ میں انڈوں کے ساتھ تشبیہ رنگ میں نہیں ہے بلکہ نعومت وطراوت یعنی ملائم اور تروتازہ ہونے میں ہے اور انڈے سے مراد پکایا ہوا اور ابالا ہوا انڈا ہے، ابالے جانے کے بعد چھلکے کے اندر جو چھپا ہوا انڈا ہوتا ہے بڑا نرم و نازک ملائم اور تروتازہ ہوتا ہے جس کا مشاہدہ چھلکا اتارنے کے بعد ہوتا ہے، اسی لیۓ عوام الناس عورت کی تعریف کرتے ہوۓ کہا کرتے ہیں کہ فلاں عورت تو چھلے ہوۓ انڈے کی مانند ہے، ایسے ہی جنت کی حوروں کے ابدان واجسام نہایت ہی نرم و نازک ملائم اور شاداب ہوں گے، اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے ہوتی ہے "عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: ان البيض المكنون ما تحت القشر الصلب بينه وبين اللباب الاصفر"[1] کہ بیض مکنون سے مراد انڈے کا وہ حصہ ہے جو سخت چھلکے کے نیچے زردی کے درمیان ہے۔ اب کوئی تعارض نہیں کیونکہ آیت اولیٰ میں تشبیہ نعومت وطراوت میں ہے نہ کہ رنگت میں اور آیت ثانیہ میں رنگ میں تشبیہ ہے، جس سے معلوم یہ ہوا کہ حوریں جسم کے اعتبار سے تو نہایت نرم و نازک اور تروتازہ وشاداب ہوں گی، اور رنگ کے اعتبار سے سفید مائل بسرخی ہوں گی، یعنی گلابی رنگ ہوگا، عورتوں میں گلابی رنگ بھی بڑا مرغوب و پسندیدہ ہوتا ہے۔

(روح المعانی ۲۳/۹۰)

❷ پہلی آیت میں انڈوں کے ساتھ تشبیہ تناسب اعضاء میں ہے نہ کہ رنگت میں، انڈا تناسب اجزاء میں مشہور اور ضرب المثل ہوتا ہے، تشبیہ کا مطلب یہ ہے کہ جس

---

(۱) رواه ابن المنذر عن ابن عباس رضي اللّٰه تعالىٰ عنه وابن ابي حاتم وابن جرير عن الامام السدي۔ (روح المعانی ۲۳/۹۰)

طرح انڈا متناسب الاجزاء ہوتا ہے اسی طرح جنت کی حوریں بھی متناسب الاعضاء ہیں اور تناسب اعضاء نہایت ممدوح اور مرغوب چیز ہے حتی کہ حسن کا مدار ہی تناسب اعضاء پر ہے، پس جب آیت اولیٰ میں تشبیہ رنگت کے اعتبار سے ہے ہی نہیں تو اس کا دوسری آیت سے کوئی تعارض نہیں کیونکہ دونوں آیتوں کے مجموعہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حوروں کا جسم متناسب[1] الاعضاء اور رنگ سفید مائل بسرخی ہے۔ **فلا تعارض بینهما**۔ (روح المعانی ۹۰/۲۳)

۳ یا یوں کہا جائے کہ آیت ثانیہ میں یاقوت و مرجان کے ساتھ تشبیہ رنگت میں نہیں ہے بلکہ یاقوت کے ساتھ تشبیہ صفائی کے اعتبار سے ہے اور مرجان کے ساتھ چکناہٹ اور خوبصورتی کے اعتبار سے ہے کہ جس طرح یاقوت موتی صاف و شفاف اور مرجان موتی چکنا اور خوبصورت ہوتا ہے اسی طرح حوریں صاف شفاف چکنی اور خوبصورت ہیں، پس کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ آیت اولیٰ میں تشبیہ بیض مکنون کے ساتھ رنگت میں ہوئی اور دوسری آیت میں یاقوت و مرجان کے ساتھ تشبیہ صفائی و شفافیت اور ملامست و جمال میں ہوئی، جس سے معلوم ہوا کہ جنت کی حوریں سفید مائل بزردی، صاف و شفاف چکنی اور خوبصورت ہیں۔ (روح المعانی ۹۰/۲۳)

۴ تشبیہ تو دونوں آیتوں میں رنگ ہی میں ہے مگر یہ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حوروں کا رنگ تو سفید مائل بزردی ہے، ان کو بیض مکنون کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور بعض کا رنگ سفید مائل بسرخی ہے، ان کو یاقوت و مرجان کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور عورتوں کے دونوں قسم کے رنگ ہی مرغوب اور حسین ہوتے ہیں، یہ کہنا کہ سب سے اچھا رنگ سفید مائل بزردی ہی ہوتا ہے درست نہیں ہے کیونکہ

(۱) مگر تناسب اعضاء والی تشبیہ کی صورت میں مکنون کی قید بے فائدہ ہو کر رہ جاتی ہے اس قید کو تشبیہ میں کوئی دخل نہیں رہتا، کیونکہ انڈا تو ہر حال میں متناسب الاجزاء ہے خواہ مکنون ہو یا غیر مکنون، اس لئے یہ توجیہ کمزور ہے (روح المعانی ۹۰/۲۳)

احسنیت تو لوگوں کی طبیعتوں اور مزاجوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے، کسی کو سفید مائل بزردی رنگ پسند ہوتا ہے کسی کو سفید مائل بسرخی، غرض کہ جنت میں اہل جنت کو ان کی پسند اور خواہش کے مطابق حوریں ملیں گی۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

"وَلَكُمْ فِيهَا مَاتَشْتَهِيٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَاتَدَّعُوْنَ" بہر حال جب دونوں آیتوں میں حوروں کا مصداق جدا جدا ہے تو تعارض نہیں ہے۔

(روح المعانی ۲۳/۹۰)

❺ یا یوں کہا جائے کہ چہروں کا رنگ تو یاقوت و مرجان کی طرح سفید مائل بسرخی یعنی گلابی ہے اور باقی بدن کا رنگ بیض مکنون کی طرح سفید مائل بزردی ہے، پس دوسری آیت تو چہرہ کی رنگت کے بیان پر محمول ہے اور پہلی آیت میں باقی بدن کی رنگت کا بیان ہے اس لئے کوئی تعارض نہیں۔ (روح المعانی ۲۳/۹۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ضلال کی نفی اور اثبات

پارہ نمبر: ۲۷، ۲۹

آیات

① ﴿مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَاغَوٰى﴾ (پارہ: ۲۷ رکوع: ۵ سورۂ نجم جلالین ص: ۴۳۷) ✦

② ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ (پارہ: ۳۰ رکوع: ۱۸ سورۂ والضحیٰ جلالین ص: ۵۰۲)

تشریح تعارض

آیت اولیٰ میں ارشاد ہے کہ تمہارے ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو ضلال کے ساتھ متصف ہیں اور نہ غوایت[1] کے ساتھ، یعنی نہ تو راہ حق سے بھٹکے اور نہ غلط راستہ پر چل دیئے۔ اور آیت ثانیہ میں ارشاد ہے کہ اللہ نے آپ کو ضال پایا، پس آپ کی رہنمائی فرمائی، یعنی آپ ضلال کے ساتھ متصف تھے اللہ نے آپ کو ہدایت عطا فرمائی، پس پہلی آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضلال کی نفی ہے اور آیت ثانیہ میں اس کا اثبات ہے، اس لئے ان دونوں میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔

دفع تعارض

اس تعارض کے دو جواب ہیں:

❶ ضلال کی دو قسمیں ہیں ایک عدول عن الطريق بعد العلم، یعنی جاننے کے بعد راستہ سے ہٹ جانا، جس کو گمراہی اور کفر سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسرے عدول

(۱) ضلال اور غوایت میں فرق یہ ہے کہ ضلال تو اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص بالکل راستہ بھول کر کھڑا رہ جائے اور غوایت یہ ہے کہ غیر راہ کو راہ سمجھ کر چلتا رہے كذا في الخازن۔ بیان القرآن ص: ۲۰۷ ج: ۱۱

عن الطریق قبل العلم یعنی جاننے سے قبل راستہ سے ہٹا ہوا ہونا جس کو ناواقفیت اور بے خبری سے تعبیر کیا جاتا ہے، آیت اولیٰ میں جو نفی ہے وہ قسم اول کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم علم اور وحی کے آجانے کے بعد پھر راہ حق سے ہٹ گئے ہوں (العیاذ باللہ) ہرگز کبھی ایسا نہیں ہوا اور آیت ثانیہ میں جو ضلال کا اثبات ہے وہ قسم ثانی کا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی سے قبل شرائع و احکام سے ناواقف اور بے خبر تھے، حق تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ آپ کو باخبر کیا جیسا کہ حق تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے "مَاكُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْاِيْمَانُ"[1] اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ وحی سے قبل نہ تو کتاب (قرآن) کو جانتے تھے کہ وہ کیا چیز ہے اور نہ ہی ایمان کی تفاصیل اور اس کے شرائع و احکام سے واقف تھے ایک اور جگہ ارشاد ہے "وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغَافِلِيْنَ" اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ وحی سے قبل شرائع دین سے بے خبر اور ناواقف تھے، اور وحی سے قبل شرائع و احکام سے ناواقف ہونا یہ کوئی نقص اور عیب نہیں ہے۔[2] بہر حال جب دونوں آیتوں میں ضلال کی علیحدہ علیحدہ قسم مراد ہے تو کوئی تعارض نہیں۔

(ماخوذ من امداد الفتاوی ۵/ ۶۹ و روح المعانی ۳۰/ ۱۶۲)

۲ دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت ثانیہ میں ضلال سے مراد راہ حق سے گمراہ ہوجانا نہیں بلکہ کہیں سفر وغیرہ میں جاتے ہوئے راستہ بھول جانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ایک بار سفر میں راستہ بھول گئے تھے، گم ہوگئے تھے تو حق تعالیٰ نے آپ کو راستہ بتادیا

(۱) ایمان سے مراد نفس ایمان نہیں ہے کیونکہ ہر نبی وحی سے قبل بھی نفس ایمان سے واقف اور اس کے ساتھ متصف ہوتا ہے بلکہ مراد شرائع ایمان ہے جن کا علم بغیر وحی کے محض عقل کے ذریعہ نہیں ہوسکتا ہے کما قال الامام محی السنة البغوی رحمه الله تعالیٰ۔ (روح المعانی ۲۵/ ۵۸)

(۲) ضال کی جو یہ تفسیر کی گئی ہے کہ وحی سے قبل شرائع ایمان سے ناواقف مراد ہے بقول امام واحدیؒ اکثر مفسرین نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے، امام زجاج بھی اسی تفسیر کو اختیار کرتے ہیں۔ (روح المعانی ۳۰/ ۱۶۲)

تھا، چنانچہ حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ ملک شام کا سفر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک اونٹنی پر سوار تھے، اندھیری رات تھی، آپ کو نیند آ رہی تھی، ابلیس لعین آیا اور آپ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ کر اس کو صحیح راستہ سے ہٹا کر دوسرے راستہ پر کر دیا، اس طرح آپ قافلہ سے بچھڑ گئے، فوراً حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور ابلیس پر ایک زور کی پھونک ماری جس سے وہ کمبخت حبشہ میں جا کر گرا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح راستہ سے قافلہ تک پہنچا دیا، ایک اور روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بچپن میں مکہ کی گھاٹیوں میں راستہ بھول جانے کی وجہ سے گم ہو گئے اور دادا جان سے جدا ہو گئے، ابو جہل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ راستہ بھول گئے اور بکریوں سے علیحدہ ہو گئے ہیں، اس نے آپ کو آپ کے دادا جان کے پاس پہنچا دیا، دادا جان اس وقت کعبہ کے پردوں کو پکڑ کر نہایت تضرع و زاری کے ساتھ اللہ سے دعا کر رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے پاس واپس پہنچا دے۔ ابو جہل نے ان سے بیان کیا کہ جب میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پیچھے سوار کرنے کے لئے اپنی اونٹنی کو بٹھایا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پیچھے سوار کیا اور اونٹنی کو اٹھایا تو اونٹنی اٹھی نہیں، پھر آپ کو آگے سوار کیا تو اونٹنی فوراً اٹھ کر کھڑی ہوئی اور کہنے لگی "یا احمق هو الامام فكيف يقوم خلف المقتدی؟" اے بیوقوف! یہ بچہ تو امام ہے یہ مقتدی کے پیچھے کیسے رہ سکتا ہے؟ اس قسم کے اور بھی واقعات اور اقوال روح المعانی میں مذکور ہیں، بہر حال اس تفسیر پر آیت ثانیہ میں ضلال سے مراد راستہ بھول جانا ہے، دین حق سے گمراہ ہونا نہیں ہے لہٰذا آیت اولیٰ میں نفی ہے ضلال بمعنی دین حق سے گمراہ ہو جانے کی اور آیت ثانیہ میں اثبات ہے ضلال بمعنی راستہ بھول جانے کا۔ فلا تعارض بينهما۔ (روح المعانی ۳۰/۱۶۲)

وقد وقع الفراغ من تسويد هذه الا وراق بحمدالله وفضله بعد صلوة الظهر من يوم الخميس فى الثامن من شهر جمادى الاخرة سنة احدى عشرة بعد الف واربع مائة من الهجرة النبوية على صاحبها الف الف تسليم وتحية الموافق السابع والعشرين من شهر دسمبر سنة تسعين بعد الف وتسع مائة من المسيحية.

وقد شرعت فيه يوم الاحد فى التاسع والعشرين من شهر ربيع الاخر سنة احدى عشرة بعد الف واربع مائة من الهجرة النبوية الموافق الثامن عشرمن شهر نوفمبر سنة تسعين بعد الف وتسع مائة من المسيحية.

فتم وكمل هذا المجموع فى مدة قد رميعاد الكليم اى اربعين يوما بعون الله وتوفيقه جعله الله سبحانه وتعالٰى نافعا للناظرين من الطلبة والمدرسين وغير هم من علماء الدين الطالبين دفع التعارض بين آيات القرآن المبين.

يارب تقبله منى بقبول حسن واجعله لى وسيلة الى النجاةو المغفرة وسببًا لرضوانك ورحمتك يا ارحم الراحمين. آمين يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ.

احقر العباد

محمد انور گنگوہی مظاہری

خادم الحدیث والتفسیر

جامعہ اشرف العلوم گنگوہ ضلع سہارنپور (یوپی)

۸؍جمادی الآخرہ ۱۴۱۱ھ یوم پنجشنبہ

اعتذار

بندہ اپنی تقصیر وکم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ اگر تعارض کے کسی مضمون سے متعلق کوئی آیت ایسی نظر آئے جو احاطہ شمار میں نہ آئی ہو تو اس کو اسی مضمون کے تحت مذکورہ آیات کے ساتھ لاحق فرمالیں، نیز اگر تعارض کا کوئی مضمون سرے ہی سے کتاب میں آنے سے رہ گیا ہو تو نقص فی التتبع پر محمول فرمائیں۔ اور اس اشاعت میں ضمیمہ کے بھی ۱۹ مضامین شامل کر دیئے گئے ہیں اس کے ساتھ کتاب کے کل مضامین ۱۲۵ ہو گئے ہیں۔

سبحانك لا علم لنا إلا ماعلمتنا انك انت العليم الحكيم.

وتب علينا انك انت التواب الرحيم.

مؤلف

محمد انوار عفا اللہ عنہ

وہ کتب جن سے اصل کتاب کی تالیف میں استفادہ کیا گیا

قرآن کریم

اسمائے کتب	مؤلفین کرام	تاریخ وفات
(۱) الاتقان فی علوم القرآن	علامہ جلال الدین سیوطیؒ	۹۱۱ھ
(۲) امداد الفتاویٰ	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۳۶۲ھ
(۳) بیان القرآن	ایضاً	ایضاً
(۴) بیضاوی شریف	علامہ ناصر الدین عبداللہ بیضاویؒ	۶۹۲ھ
(۵) تحفۂ اِثنا عشریہ	شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ	۱۲۳۹ھ
(۶) تفسیر ابن کثیر	علامہ ابوالفداء اسماعیل بن عمرؒ	۷۷۴ھ
(۷) تفسیر ابوالسعود	محمد بن محمد العمادیؒ	۹۵۱ھ
(۸) تفسیر خازن	علامہ علی بن محمد بن ابراہیم الخازنؒ	۷۲۵ھ
(۹) تفسیر قرطبی	امام ابوعبداللہ محمد بن احمدؒ	۶۷۱ھ
(۱۰) تفسیر کبیر	امام ابوعبداللہ محمد بن عمر رازیؒ	۶۰۶ھ
(۱۱) تفسیر کشاف	علامہ جار اللہ محمود بن عمر زمخشریؒ	۵۳۸ھ
(۱۲) تفسیر مدارک	علامہ عبداللہ بن احمد النسفیؒ	۷۱۰ھ
(۱۳) تفسیر مظہری	علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ	۱۲۲۵ھ
(۱۴) جلالین شریف	علامہ جلال الدین محلیؒ و سیوطیؒ	۹۱۱ھ
(۱۵) جمل علی الجلالین	سلیمان بن عمر العجیلی الشافعیؒ	۱۲۰۴ھ
(۱۶) روح المعانی	علامہ ابوالفضل سید محمود آلوسی بغدادیؒ	۱۲۷۰ھ
(۱۷) الروض النضیر	علامہ محمد حنیف گنگوہی مدظلہ العالی	

(۱۸) شیخ زادہ .... علامہ محمد بن مصلح الدینؒ ۹۵۱ھ
(۱۹) صاوی علی الجلالین .... علامہ احمد بن محمد صاویؒ ۱۲۴۱ھ
(۲۰) الفوز الکبیر .... شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ۱۱۹۱ھ
(۲۱) مصباح اللغات ...... علامہ عبدالحفیظ بلیاویؒ ....
(۲۲) معارف القرآن ...... مفتی اعظم محمد شفیع صاحبؒ ۱۳۹۶ھ
(۲۳) النبراس.............. علامہ عبدالعزیز بن احمدؒ .... ۱۲۴۰ھ غالباً

جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن

اگر تم اللہ تبارک و تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔ (القرآن)

اللہ تبارک و تعالیٰ کی نعمتیں اور اُن کا شکر

تالیف

حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب دامت برکاتہم

زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد۔ اردو بازار۔ کراچی
فون ۷۷۲۵۶۷۳

مقبول دعاؤں کے بارے میں احادیث شریف کا نادر مجموعہ

آدابِ دعا اور قبولیت کے اوقات و مقامات

ترجمہ:

سهام الإصابة في الدعوات المجابة

تالیف:

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ علیہ

المتوفی سنة ۹۱۱ هجرية

ترجمہ و تشریح

مولوی سعد محمد راشد مدنی

فاضل جامعہ دار العلوم کراتشی نمبر ۱۴

زمزم پبلشرز

تألیف
نصیب الرحمٰن علوی
فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی
خطیب مسجد عمر ہڈرسفیلڈ یارک شائر۔ انگلینڈ

زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد۔ اردو بازار۔ کراچی
فون ۷۷۲۵۶۷۳

جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن

اخلاقِ سلف

اُردو ترجمہ

تنبیہ المغترین

للقطب الربانی أبی المواھب الشیخ عبدالوھاب بن أحمد الشعرانی رحمہ اللہ

ترجمہ وتلخیص

حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی رحمہ اللہ

کتاب کی نمایاں خصوصیات

سلفِ صالحین کے رُوح پرور واقعات کا نادر مجموعہ
نیکی کا راستہ تلاش کرنے والوں کیلئے بہترین زادِ راہ
اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کے آسان طریقوں کا انتخاب
نفس و شیطان کے مکر سے بچنے کی مفید تدابیر
معاملات و معاشرت سے متعلق رہنما اُصول
دل کی سختی کو دُور کرنے کے لئے مجرب

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد۔ اُردو بازار۔ کراچی
فون ۷۷۲۵۶۷۳